مولانا ابوالکلام آزاد کی
علمی، ادبی، قومی وملّی خدمات
قیام رانچی کے حوالے سے
(اپریل 1916 تا دسمبر 1919)
مولانا آزاد اور رانچی
تذکرہ
ترجمان القرآن
جامع الشواہد
انجمن اسلامیہ
مدرسہ اسلامیہ
ڈاکٹر منظر حسین
ڈائریکٹر، مولانا آزاد ریسرچ سنٹر، رانچی یونیورسٹی
شائع کردہ:
مولانا آزاد ریسرچ سنٹر
مورابادی کیمپس، رانچی یونیورسٹی، رانچی

مولانا ابوالکلام آزاد کی

علمی، ادبی، قومی وملّی خدمات

(قیام رانچی کے حوالے سے)

اپریل1916 تا دسمبر1919

ڈاکٹر منظر حسین

(ڈائریکٹر، مولانا آزاد ریسرچ سنٹر، رانچی یونیورسٹی)

شائع کردہ:

مولانا آزاد ریسرچ سنٹر،

مورابادی کیمپس، رانچی یونیورسٹی، رانچی

MAULANA ABUL KALAM AZAD KI
ILMI,ADBI,QAUMI-O-MILLI KHIDMAT
(QEYAM-E-RANCHI KE HAWALEY SE)
April 1911 To December 1919

By
DR. MANZAR HUSSAIN

Year of Publication- 2017

ISBN- Price 350/=

کتاب کا نام	:	مولانا ابوالکلام آزاد کی علمی، ادبی، قومی وملی خدمات (قیام رانچی کے حوالے سے) اپریل 1916 تا دسمبر 1919
مصنف	:	ڈاکٹر منظر حسین
تعداد اشاعت	:	500
سال اشاعت	:	2017
صفحات	:	256
کمپوزنگ وتزئین	:	محمد مکمل حسین، محمد صابر انصاری اور حافظ حمزہ
قیمت	:	-/350 روپے
ناشر	:	مولانا آزاد ریسرچ سنٹر، رانچی یونیورسٹی، رانچی Maulana Azad Research Centre,Ranchi University,
مطبع	:	فرید بکڈپو، نئی دہلی۔

:- تقسیم کار :-

۱۔ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔
۲۔ کرن بک ڈپو، مین روڈ، رانچی۔
۳۔ آزاد کتاب گھر، ساکچی بازار، جمشید پور۔
۴۔ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ، بہار
۵۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔
۶۔مکتبہ جامعہ، نئی دہلی۔
۷۔مولانا آزاد ریسرچ سنٹر، رانچی یونیورسٹی۔

فوٹو مولانا آزاد

انتساب

اس کتاب کو مولانا ابوالکلام آزاد کے ان عقیدت مندوں کے نام

معنون کرتا ہوں

جنہوں نے مولانا آزاد کے رانچی میں قیام کے دوران ان کی ہر آواز پر

دامے درمے سخنے لبیک کہا اور مولانا کے متعلق جن کا عقیدہ تھا

نگہہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

فہرست

حرفِ چند

مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار بیسویں صدی کی ان عظیم شخصیتوں میں ہوتا ہے جن کے علم و ادب کی رفعت، ذکاوت و ذہانت، دینی و دنیوی علوم میں تبحر، سیاست میں فراست دانشوری اور قیادت میں سبقت کی وجہ سے یہ صدی پہچانی جاتی ہے۔ مولانا آزاد کی ذات گوناگوں اوصاف و کمالات کا مجموعہ تھی اور علم و بصیرت کا ایک عدیم المثال مخزن و معدن۔ وہ اسلامی تعلیمات کے ماہر تھے۔ اور حدیث، فقہ، تفسیر، فلسفہ، ادب، علم کے ہر گوشے سے واقف بھی تھے اور ہر صفت اور خصوصیت ان میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ وہ سچے محبِ وطن بھی تھے اور قومی یکجہتی اور ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار بھی۔ مولانا آزاد کے تبحر علمی کا اعتراف کرتے ہوئے اردو کے صاحب طرز انشاء پرداز علامہ نیاز فتحپوری رقمطراز ہیں:۔

> ''وہ اگر عربی شاعری کی طرف توجہ دیتے تو متنبی و بدیع الزماں کے ہم پلہ ہوتے اگر وہ محض دینی و مذہبی اصلاح کو اپنا شعار بنا لیتے تو اس عہد کے ابن تیمیہ ہوتے، اگر محض علوم حکمیہ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیتے تو ابن رشد اور ابن طفیل سے کم درجہ کے متکلم و مفکر نہ ہوتے، اگر فارسی شعر و ادب کی طرف متوجہ ہوتے تو عرفی اور نظیری کی صف میں انہیں جگہ ملتی۔ اگر وہ تصوف اور اصلاح اخلاق کی طرف مائل ہوتے تو غزالی اور رومی سے کم نہ ہوتے اور اگر وہ مسلک اعتزالی اختیار کرتے تو دوسرے واصل بن عطا ہوتے۔''

جھارکھنڈ کے شہر رانچی کو بھی مولانا آزاد کی میزبانی کا شرف حاصل ہے۔
23 مارچ 1916ء کو حکومت بنگال نے مولانا آزاد پر الزام لگایا کہ وہ ملک معظم کے دشمنوں سے ساز باز رکھتے ہیں۔ لہٰذا ''ڈیفنس ایکٹ کے دفعہ 3۔اے کے تحت انہیں ایک ہفتہ کے اندر بنگال چھوڑنے کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ مولانا نے صوبۂ بہار کے خوبصورت پرسکون اور پہاڑوں کے آغوش میں بسنے والا شہر رانچی کا انتخاب کیا اور 30 مارچ 1916ء کو تن تنہا عازم سفر ہوئے اور 5 اپریل کو مولانا رانچی میں وارد ہوئے۔ مولانا آزاد نے رانچی میں نظر بندی کے پونے چار سال گذارے۔ اس عرصے میں انہوں نے کیا کارہائے نمایاں انجام دیے اور ان کے فکر و عمل کے کیا نتائج پیدا ہوئے، ان کے تشریف آوری سے علمی، دینی، قومی و ملی اعتبار سے کیا انقلاب رونما ہوا، کس حد تک یہاں کی علمی، دینی، قومی، ملی و سیاسی زندگی میں تبدیلیاں آئیں؟ پھر یہ کہ خود مولانا کے کردار، قول، فعل، عمل، تبلیغ، تحریک، تلقین، رشد و ہدایت، خطابت کا اثر یہاں کے لوگوں نے کس حد تک قبول کیا۔ میں نے اسی تناظر میں اس کتاب میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔

کتاب کا پہلا مضمون ''مولانا آزاد اور رانچی'' کے عنوان سے ہے، جس کے تحت میں نے رانچی میں قیام کے دوران مولانا کے تمام احوال و کوائف کی روئداد کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ مولانا رانچی میں خاموش بالکل نہیں رہے۔ مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہنے کے علاوہ نظر بندی کے دوران ہندو مسلم اتحاد و اتفاق اور قومی یکجہتی کا جو صور پھونکا تھا اس کی بازگشت آج بھی سنائی دے رہی ہے۔ مذکورہ مضمون کے مطالعے سے رانچی میں مولانا کے معمولات، مصروفیات کا تو اندازہ ہوگا ہی ساتھ ساتھ اس عہد میں رانچی کے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی سے بھی بخوبی واقفیت ہو جائے گی۔

''تذکرہ'' مولانا آزاد کے عہد جوانی کی یادگار شاہکار تصنیف ہے جو قیام رانچی کے دوران سپرد قلم کی گئی ہے۔ گرچہ یہ کتاب مولانا کے سوانحی واقعات اور ان کے اسلاف

کے کارناموں پر مشتمل ہے لیکن اس کا اصل موضوع دعوت واصلاح اور عمل وعزیمت کا پیغام ہے۔ ساتھ ہی اس کتاب میں مذہب، معاشرت، فلسفہ، شخصیات، علم الاخلاق اور سیاست کے مسائل پر بھی مکمل اور عالمانہ اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یہ کتاب مولانا آزاد نے اپنے دوست مولوی فضل الدین مرزا کے اصرار پر لکھی۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ ''تذکرہ'' مولانا آزاد کی علمی دانشوری اور تاریخی بصیرت کی معراج ہے اور تبحر علمی کا شاہکار اور علم کا گوہر آبدار بھی۔ اس میں خطیبانہ انداز بھی ہے اور شوکت الفاظ بھی ہیں، ذاتی سر گذشت اور احوال و کوائف بھی۔ اسلاف کے کارناموں کا بکھان بھی ہے اور دعوت و عزیمت کا پیغام بھی۔ ''تذکرہ'' ہر اعتبار سے ایک علمی، ادبی اور دینی معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے جس میں مختلف شخصیتوں کی زندگی کے نشیب وفراز کا انعکاس بھی ہے۔ یقیناً اس کے مطالعے سے مولانا کے شخصی احوال وکوائف سے بھی کماحقہ واقفیت ہوجاتی ہے۔ محبت و عشق کے اظہار میں بھی مولانا نے صداقت شعاری اور حقیقت بیانی کو اپنا شیوہ بنایا ہے۔ رومانی سرگذشت کے اظہار میں شدت احساس کا پرتو بھی ہے اور وفور جذبات بحر بیکراں کی طرح ہچکولے مار رہا ہے۔ میں نے اپنے مضمون ''تذکرہ'': مولانا آزاد کی علمی دانشوری کا شاہکار'' میں اس تصنیف کا تفصیلی طور پر تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں متعدد علمی و ادبی شخصیتوں کے اقوال وآراء سے مدد لی گئی ہے۔ یقین ہے کہ میرا یہ مضمون مولانا آزاد کی تصنیف ''تذکرہ'' کی تفہیم میں خضر راہ ثابت ہوگا۔

''ترجمان القرآن'' کی اشاعت مولانا آزاد کی زندگی کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ مولانا نے اپنی زندگی کے تمام تر سرگرمیوں کے لیے قرآن کریم کو ہی مصدر ومرجع بنایا۔ ''البلال'' اور ''البلاغ'' کے اجراء کا مقصد ہی قرآن حکیم کی تفہیم وترسیل تھی۔ صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے لکھا ہے:۔

''البلال کا دائرہ بحث تو صرف ایک ہی ہے یعنی تعلیم اسلامی اور اتباع

ماجاء بہ القرآن کی دعوت۔ ساتھ ہی اس کا عقیدہ ہے کہ اگر قرآن خدا کی
کتاب ہے اور اگر اس کا دعویٰ قابل تسلیم ہے تو مسلمانوں کی تعلیم،
پالیٹکس، اخلاق، تمدن جو کچھ ہے اس کے اندر ہے۔"

مولانا آزاد کی تفسیر میں جدت طرازی بھی ہے اور اجتہادی شان بھی۔ ساتھ ہی ساتھ روایت کی پاسداری کو بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ "ترجمان القرآن" ان کی غیر معمولی ذہانت وقوت ادراک کا ضامن ہے اور ان کے علمی وتفسیری امتیازات کا آئینہ دار بھی۔ ہندوستان کے دوسرے مفسرین میں ان کا اختصاص یہ بھی ہے کہ عربی مولانا کی مادری زبان تھی۔ مولانا نے قرآن ہی سے اپنا نظام فکر بھی ترتیب دیا ہے اور دستور العمل بھی۔ انہوں نے ترجمان القرآن کی اشاعت کا بیڑہ اس لیے اٹھایا کہ انہیں زبردست احساس تھا کہ مسلمانوں کی مذہبی اصلاح کے لیے قرآن کی تعلیم واشاعت کا جیسا انتظام ہونا چاہئے اس عہد میں اس کا فقدان ہے جو مذہبی اصلاح کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ لہٰذا انہوں نے ترجمان القرآن کی اشاعت کے توسط سے اپنے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی سعی مستحسن کی ہے۔

پورے برصغیر میں یہ سعادت شہر رانچی (جھارکھنڈ) کو حاصل ہے کہ مولانا آزاد کی شاہکار تصنیف ترجمان القرآن کا بڑا حصہ رانچی میں ہی لکھا گیا۔ 30 مارچ 1916ء کو جب مولانا کلکتہ سے روانہ ہوئے تو تفسیر کے چھ فارم چھپ چکے تھے اور ترجمے کی کتابت شروع ہو رہی تھی۔ 8 جولائی 1916ء کو حکومت ہند نے اچانک مولانا کی نظر بندی کے احکام جاری کیے۔ ایک ہی وقت میں رانچی اور کلکتہ دونوں جگہ کی تلاشی لی گئی۔ اور جس قدر کاغذات ملے تھے اپنے قبضے میں کر لیا۔ انہیں میں ترجمہ وتفسیر کا مسودہ بھی تھا۔ معائنے کے بعد جب بعد میں مقامی افسران کو احساس ہوا کہ اس میں کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ہے تو دو ہفتے کے بعد کاغذات واپس کر دیے گئے۔ اور حکومت کو اس کی اطلاع بھی دے دی گئی لیکن

حکومتِ ہند کو مقامی افسران کے فیصلے سے اتفاق نہ ہوا لہٰذا دوبارہ تفتیش کا حکم دیا گیا۔ اس زمانے میں تفتیش کا اعلیٰ افسر سر چارلس کلیو لینڈ تھا اس نے کلکتہ اور رانچی دونوں جگہ مکان کی تلاشی لی۔ دو ہفتے تک تفتیش کرتا رہا اور جو کاغذات پچھلی دفعہ واپس لیے گئے تھے کے علاوہ مطبوعہ کتابیں بھی ضبط کر لی گئی۔ ان کاغذات میں تفسیر و ترجمہ کے قرآن مجید کے آٹھ پاروں کے ترجمے ہی کیے تھے اور تفسیر کا کام سورۃ النساء تک پہنچ چکا تھا۔ مولانا مسودات کی ضبطی سے دل برداشتہ ضرور ہوئے لیکن مصائب سے نبرد آزما اور برسرِ پیکار ہونے کا انہیں ہنر خوب آتا تھا۔ وہ ہمت نہیں ہارے اور نویں پارے سے ترجمہ کا کام شروع کیا اور 1918ء تک اسے مکمل کر لیا۔ ان تمام واقعات و حادثات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ پڑھنے والے کو اندازہ ہو سکے کہ مولانا نے رانچی میں نظر بندی کے دوران تصنیف و تالیف کے سلسلے میں کیا کیا مشقتیں نہ اٹھائی ہیں۔

رانچی میں ہی مولانا کے ساتھ اس شخص کا واقعہ بھی پیش آیا جو سرحد پار سے مولانا سے قرآن سمجھنے کے لیے پیدل رانچی آیا۔ یہ واقعہ 1918ء میں پیش آیا۔ مولانا نے اپنی کتاب ''ترجمان القرآن'' کا انتساب اسی شخص کے نام کیا ہے۔ میں نے اس مضمون میں کوشش کی ہے کہ ''ترجمان القرآن'' اور اس کے متعلقات کے حوالے سے مولانا کے تمام نقطۂ نظر مثلاً تصورِ وحدتِ دین، تفسیر بالرائے، فقہی آیات، کی تفسیر میں مولانا کی انفرادیت، تاریخی واقعات کی تفسیر و توضیح میں مولانا کی انفرادیت کے علاوہ ان کی ترجمہ نگاری، اسلوب نگارش پر کافی تفصیلی روشنی ڈالی جائے۔ اس سلسلے میں کئی مواقع پر تقابلی مطالعے کو بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔

''جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد'' مولانا آزاد کی وہ تصنیف ہے جس میں فقہی مباحث بیان کیے گئے ہیں۔ کتاب کے مطالعے سے اس نکتے کا انکشاف ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کا فقہی منہاج مجتہدانہ ہے۔ وہ اپنی باتوں کو تقویت بخشنے کے لیے مجموعی

اسلامی فقہ کی روشنی میں اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔ ''جامع الشواہد'' کے مطالعے سے مولانا کے ذوق و ذہن، فقہ پران کا وسیع مطالعہ، اجتہادی بصیرت، دلائل کا استنباط اور فقہی مستدلات کا پتہ تو چلتا ہی ہے ساتھ ہی مولانا ہندو مسلم اتحاد کے لیے کس قدر کوشاں تھے اس سے کما حقہ واقفیت ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کے محرکات پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے اور مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کتاب کی اشاعت میں جو عملی دلچسپیاں لی تھیں ان کی بھی تفصیل ہے۔

رانچی میں نظر بندی کے دوران مولانا آزاد کو رانچی کے مسلمانوں کی تعلیمی، معاشی پسماندگی کا زبردست احساس ہوا۔ انہوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ بغیر تعلیم کے فروغ اور یہاں کے مسلمانوں کی دینی شعور کو بیدار کیے ترقی ممکن نہیں۔ لہٰذا اسی مقصد کے پیش نظر مولانا کی تحریک پر 15 اگست 1917ء کو انجمن اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا۔ یکم ستمبر 1917ء کو انجمن اسلامیہ کی میٹنگ میں یہ فیصلہ لیا گیا کہ اس انجمن کے زیر اہتمام رانچی میں ایک مدرسہ کا قیام عمل میں لایا جائے۔ 16 نومبر کو کرایے کے مکان میں درس و تدریس کا کام شروع کر دیا گیا۔ 24 فروری 1918 کو باضابطہ مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس موقع پر ایک جلسے کا بھی انعقاد کیا گیا جس کی صدارت مہاراجا بہادر چھوٹا ناگپور (راتو مہاراجا) نے فرمائی اور مدرسے کی عمارت کی بنیاد کا پہلا پتھر انہوں نے ہی رکھا۔ انجمن اسلامیہ کا پہلا سالانہ جلسہ اور مدرسہ کا افتتاح 12 اکتوبر 1918ء کو منعقد ہوا۔ اس موقع پر جناب محمد اسمٰعیل صاحب محمدی کلکتہ نے جلسے کی صدارت فرمائی اور خطبۂ صدارت بھی پیش کیا۔ انجمن اسلامیہ کا دوسرا سالانہ اجلاس 24 اکتوبر 1919ء تا 26 اکتوبر 1919ء منعقد ہوا۔ اس جلسے میں تقریباً چار ہزار افراد شریک تھے۔ میں نے اپنے مضمون ''انجمن اسلامیہ کی تشکیل اور مدرسہ اسلامیہ کا قیام'' میں تفصیلی طور پر اس کا جائزہ لیا ہے تاکہ اس مضمون کو تاریخی دستاویز کی حیثیت حاصل ہو جائے۔ اس پر طرہ یہ کہ مولانا آزاد نے رانچی

میں قیام کے دوران محی الدین احمد قصوری کی درخواست پر جون 1919ء کے پہلے ہفتے میں نصاب مدرسہ کے تعلق سے ایک تفصیلی ڈرافٹ ترتیب دے کر انہیں ارسال کیا تھا۔ میں نے من وعن اس نصاب کے ڈرافٹ کو اس مضمون میں شامل کر دیا ہے۔

میری یہ تصنیف دراصل رانچی میں مولانا آزاد کی نظر بندی کے سو سال پورے ہونے پر ایک خراج عقیدت ہے۔ میں نے پوری کوشش کی ہے کہ رانچی میں قیام کے حوالے سے مولانا کے تمام احوال وکوائف کی تفصیل آجائے۔ ہاں مجھے یہ اعتراف کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ اس سلسلے کی ایک اہم کڑی مولانا کے وہ خطوط ہیں جو رانچی میں قیام کے دوران لکھے گئے ہیں۔ خصوصی طور پر مولوی ابراہیم ذکریا کو جو خطوط مولانا نے لکھے ہیں ان پر کئی لوگوں نے بحث ومباحثہ کے دروازے بھی کھولے ہیں۔ ان میں پروفیسر محمود واجد ہاشمی اور پروفیسر وہاب اشرفی کے مضامین کافی اہم ہیں۔ اسی طرح مولانا آزاد نے رانچی میں قیام کے دوران مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی۔ بیگم حسرت موہانی اور دیگر اکابرامت کو جو خطوط لکھے تھے ان کا تفصیلی ذکر ہونا چاہیے تھا۔ لیکن کتاب کی ضخامت کو دیکھتے ہوئے اس حصے کو روکنا پڑا۔ میرا ارادہ ہے کہ بہت جلد ''مولانا آزاد کے مکاتیب'' (قیام رانچی کے حوالے سے) ایک کتاب ترتیب دے کر شائع کی جائے گی۔ انشاءاللہ۔

یہ تصنیف مولانا آزاد ریسرچ سینٹر رانچی یونی ورسٹی کے اشاعتی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس سے قبل چار کتابیں اس سینٹر کے زیر اہتمام شائع ہو چکی ہیں۔ یہ کتاب رانچی میں مولانا کی آمد کے سو سال پورا ہونے پر انہیں خراج عقیدت پیش کرنے اور ہندو مسلم اتحاد وقومی یکجہتی کو عام کرنے کے لیے ایک علمی ضرورت کے تحت لکھی گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ زیر نظر کتاب آزاد شناسی کی تفہیم میں ایک کلیدی کردار ادا کرے گی اور ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔ قارئین سے درخواست ہے کہ اگر کتاب میں کوئی بات نادرست نظر آئے تو اس کی نشان دہی کریں۔ ممنون ومشکور ہوں گا۔ اگلے ایڈیشن میں ان

خامیوں کو دور کر دی جائے گی۔

اس کتاب کی اشاعت میں میرے عزیز شاگردوں محمد کمل حسین، محمد صابر انصاری اور حافظ حمزہ نے اپنی عملی دلچسپیوں کا ثبوت دیا۔ وہ ہماری دعاؤں کے مستحق ہیں۔

رانچی
مورخہ
5رجنوری،2017

منظر حسین

مولانا آزاد اور رانچی

۲۳؍مارچ ۱۹۱٦ء کو حکومت بنگال نے مولانا آزاد پر الزام لگایا کہ وہ ملک معظم کے دشمنوں سے ساز باز رکھتے ہیں۔ لہٰذا ڈیفنس ایکٹ کے دفعہ ۳۔اے کے تحت انہیں ایک ہفتہ کے اندر بنگال چھوڑنے کا حکم دیا گیا۔ ادھر دوسری صوبائی حکومتیں اپنے یہاں پہلے ہی سے مولانا آزاد کا داخلہ ممنوع قرار دے چکی تھیں۔ البتہ صوبہ بہار نے مولانا آزاد کے داخلے پر پابندی نہیں لگائی تھی لہٰذا مولانا نے صوبۂ بہار کے خوبصورت، پرسکون اور پہاڑوں کے آغوش میں بسنے والا شہر رانچی کا انتخاب کیا اور ۳۰؍مارچ ۱۹۱٦ء کو تن تنہا رانچی کے لئے عازم سفر ہوئے۔ بہت سارے احباب، اعزہ اور عقیدت مند حضرات ہم سفر ہونے کو آمادہ تھے لیکن انہوں نے اپنے ساتھ لے جانا گوارا نہیں کیا۔ لکھتے ہیں:۔

> ''اکثر احباب و اقارب، آمادۂ ہم رہی تھے لیکن دل ہمت خواں نے گوارہ نہیں کیا کہ اس منزل انقطاع کی عزت کو شرکت رفقا کے داغ ناتمامی سے بٹہ لگاؤں۔'' [۱]

مولانا آزاد کے رانچی روانہ ہونے سے قبل کلکتہ سے البلاغ جاری تھا۔ انجمن حزب اللہ بھی کافی منظم ہو چکی تھی۔ مدرسہ دارالارشاد میں تعلیم وارشاد اور تربیت اصحاب استعداد کا کام شروع ہو گیا تھا جس کی بنیاد مولانا نے ۱۹۱۴ء میں ڈالی تھی۔ ۱۹۱۵ میں قران مجید کے ترجمہ کا بھی کام شروع ہو چکا تھا اور اس کی طباعت و اشاعت کا کام بھی ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اہم کام شاہ ولی اللہ مرحوم کی سوانح حیات بھی مکمل ہو چکی تھی۔ اپنے ان کاموں کی اطلاع مولانا سید سلیمان ندوی کو

دیتے ہوئے مولانا یوں رقم طراز ہیں:۔

''ادھر فرصت میں آپ سن کر خوش ہوں گے کہ ترجمان القرآن اور تفسیر کا بہت سارا حصہ ہو گیا۔ نیز شاہ ولی اللہ مرحوم کی سوانح کے کاغذات نکال کر مرتب کر لئے۔ ترجمہ چھپ رہا ہے اور ترجمہ کا ایک مختصر مقدمہ لکھ رہا ہوں جو گویا تفسیر ہوگا اور ر اصولاً بہت سی نئی باتوں پر مشتمل۔'' ۲

کلکتہ سے روانگی کے وقت ان کے دل پر کیا کیفیت گذر رہی تھی۔ اپنی تحریر میں اس کا اظہار اس طرح کیا ہے:۔

''۱۹۱۶ء میں جب یہ معاملہ پیش آیا تو مجھے پہلی مرتبہ موقع ملا کہ اپنی طبیعت کے تاثرات کا جائزہ لوں۔ اُس وقت عمر کے صرف ۲۷ سال گذرے تھے '' الہلال''، ''البلاغ'' کے نام سے جاری تھا۔ 'دارالارشاد' قائم ہو چکا تھا۔ زندگی کی گہری مشغولیتیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ طرح طرح کی سرگرمیوں میں دل اٹکا ہوا اور علاقوں اور رابطوں کی گیرانوں سے بوجھل تھا۔ اچانک ایک دن دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہونا پڑا اور مشغولیت کی ڈوبی ہوئی زندگی کی جگہ قید و بند کی تنہائی اور بے تعلقی اختیار کر لینی پڑی۔ بظاہر اس ناگہانی انقلاب حال میں طبعیت کے لئے بڑی آزمائش ہونی تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ نہیں ہوئی۔ آباد گھر چھوڑ اور ایک ویرانہ جا بیٹھ رہا۔

نقصان نہیں جنوں بلا سے ہو گھر خراب

دو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں۔'' ۳

۵راپریل کو مولانا رانچی میں وارد ہوئے کلکتہ سے منتقلی کے بعد کلکتہ کی تمام علمی، سیاسی، سماجی اور مذہبی سرگرمیاں آہستہ آہستہ سرد پڑ گئیں۔ مدرسہ دارالارشاد بند ہو گیا۔ البلاغ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بند کرنا پڑا۔ بقول مولانا امداد صابری:۔

''......لیکن کلکتہ سے حضرت مولانا آزاد نکلے اور رانچی کے کوردہ کی زندگی اختیارات کرنی پڑی تو اگر چہ انجمن اور مدرسہ کی بساط الٹ گئی۔ وہ کام رانچی سے مولانا کی ہدایت کے مطابق انجام نہ دیا جاسکتا تھا۔اس کے لئے کلکتہ میں مولانا کے قیام اور ہمہ وقت نگرانی کی ضرورت تھی۔تعلیم وارشاد وتربیت کے لئے استاد ومربی کا موجود ہونا لازمی تھا۔البلاغ کے جاری رکھنے کیلئے حضرت مولانا نے کوشش جاری رکھی۔اس طرح ترجمہ وتفسیر کی طباعت واشاعت کے بارے میں بھی حضرت کا خیال تھا کہ اس کام کو جاری رکھا جاسکتا ہے۔ جون ۱۹۱۶ء تک حضرت مولانا نے اسکے لئے ضروری انتظامات بھی کر لئے تھے لیکن حکومت کو مولانا آزاد کی یہ آزادی ان کے پیش نظر کاموں کی نگرانی کی مہلت اور مقاصد تک دست رسی ہی گوارا ہوتی تو کلکتہ سے خارج کرنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی۔''[۱۲]

رانچی پہنچ کر مولانا نے برطانوی حکومت کو ایک خط کے ذریعہ آگاہ کر دیا کہ مسلمانوں کے لئے انگریزی حکومت کی نوکری ایک لحہ کے لئے بھی جائز نہیں۔اس کا ذکر مولانا نے مجلس خلافت کے ایک جلسہ بابت ۲۶ اگست ۱۹۲۱ء بمقام آگرہ میں اپنے خطبۂ اختتامیہ میں تفصیلی طور پر کیا ہے ۔اُن کے الفاظ یہ ہیں:۔

''۱۹۱۶ء میں جب گورنمنٹ نے مجھے نظر بند کیا اور گورنمنٹ آف انڈیا نے اعلان کیا کہ یہ شخص ملک معظم کے دشمنوں سے ساز باز رکھتا ہے۔تو میں نے ایک چھٹی لکھی تھی اور نہایت تفصیل سے اسلام کے احکام درج کر دیئے تھے۔جن کی رو سے کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ ایک لحہ کے لئے بھی برٹش گورنمنٹ کی نوکری کرے۔دوسرے الفاظ یہ تھے کہ نہ صرف یہ حرام ہے بلکہ قرآن وحدیث کے بموجب کافی نہیں کہ حرام ہے بلکہ اسلام اور کفر کا فیصلہ

کر دینے والا ہے ہر لمحہ جو ایک بد بخت کے لئے انگریزی جھنڈے کے نیچے
گذرے گا۔ وہ اس کیلئے حرام ہے" ۵

مولانا نے رانچی میں اپنے قیام کے لئے شہر سے متصل ایک گاؤں مورابادی کا انتخاب کیا جہاں کول، اوراؤں، منڈا قومیں سکونت پذیر تھیں۔ چند مکانات بنگالیوں نے بھی بنوائے تھے جہاں وہ موسمِ گرما میں قیام پذیر ہوتے۔ انہیں بنگالیوں میں ایک خاندان رابندر ناتھ ٹیگور کا بھی تھا جو ایک پہاڑی پر آباد تھا۔ مولانا آزاد کا قیام مورابادی کے جس بنگلے میں تھا وہ کلکتہ کے ایک مسلمان تاجر کا تھا۔

مولانا ۳۰ مارچ کو رانچی روانگی سے قبل "البلاغ" مرتب کر کے آئندہ اشاعت کا بھی انتظام کر گئے تھے ۸/اپریل کو مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں رانچی میں اپنی آمد کی اطلاع دیتے ہوئے اس خواہش کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ کم از کم دو ہفتے میں ایک مضمون البلاغ کے لئے بھیج دیا کریں۔ دیکھئے یہ تحریر:۔

"میں سردست رانچی آ گیا ہوں۔ "البلاغ" جاری رہے گا۔ آپ اور تو کچھ نہیں کر سکتے کم سے کم اتنا کیجئے کہ ہر دو ہفتہ میں ایک مضمون بقدر آٹھ کالم کے بھیج دیا کیجئے اور مولوی عبدالسلام سے کہئے کہ ہر دو ہفتہ میں بھی وہ ایک مضمون اتنی ہی مقدار کا لکھ کر بھیجیں۔ اس طرح دو فارم کا انتظام ہو جائے گا۔ باقی تین فارم میں خود لکھوں گا۔ مولوی عبدالسلام صاحب سے کہیے کہ یا تو علمی ذوق سے لکھیں یا معاوضہ لیں، میں ہر طرح تیار ہوں۔ کم سے کم چند نمبر تک تو ایسا کیجئے۔ اس کی نسبت میں کچھ نہیں لکھتا کہ ایسا کرنا کہاں تک ضروری ہے؟ اس پر آپ خود غور کر سکتے ہیں۔

"البلاغ" کے ابواب آپ کو معلوم ہیں؟ مقالات، اسوہ حسنہ، مذاکرہ علمیہ، انتقاد، تاریخ وغیرہ، ان کے مقاصد بھی آپ کو معلوم ہیں۔ باب التفسیر میں خود لکھا کروں گا۔ براہ عنایت جلد جواب دیجئے۔ زیادہ وقت و فرصت نہیں۔" ۶

۸/جولائی ۱۹۱۶ء کو حکومت نے مولانا آزاد کی نظر بندی کا حکم صادر کر دیا۔ اب مولانا کا باہر کی دنیا سے ربط ٹوٹ چکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے دل میں طے کیا کہ رانچی میں تصنیف و تالیف اور دیگر کام کو شروع کر دیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

''دنیا نے فراغ و آزادی کے زمانے کے کاموں کا کچھ نمونہ دیکھ لیا ہے بہتر ہے کہ جلا وطنی و نظر بندی کے بند و قید میں کام کرنے کا بھی ایک نمونہ دکھلایا جائے کہ اصلی آزمائش گاہ عمل یہی ہے:۔ ۷

اپنے منصوبہ بند عزائم کے سلسلے میں دوسری جگہ یوں فرماتے ہیں:۔

''اب میرے اختیار میں صرف ایک ہی کام رہ گیا تھا یعنی تصنیف و تسوید کا مشغلہ۔ نظر بندی کی اُنہیں دفعات میں کوئی دفعہ بھی مجھے اُس سے نہیں روکتی تھی۔ میں نے اس پر قناعت کی، اُتنا ہی نہیں، بلکہ میں نے خیال کیا۔ اگر زندگی کی تمام آزادیوں سے محروم ہونے پر بھی لکھنے پڑھنے کی آزادی سے محروم نہیں ہوں اور اُس کے نتائج محفوظ ہیں تو زندگی کی راحتوں میں سے کوئی راحت بھی مجھ سے الگ نہیں ہوئی۔ میں اس عالم میں پوری زندگی بسر کر دے سکتا ہوں لیکن ابھی اس صورت حال کو تین مہینے بھی نہیں گذرے تھے کہ معلوم ہو گیا۔ اس گوشے میں بھی مجھے محرومی ہی سے دو چار ہونا تھا۔ ۸

رانچی میں نظر بندی کے دوران مولانا کو سخت آزمائشوں سے گذرنا پڑا۔ حالات کتنے کرب آگیں تھے اس کا اندازہ ان تحریروں سے لگایا جا سکتا ہے:۔

''نظر بندی کے احکام جس وقت نافذ کئے گئے ہیں، تو میرے قیام گاہ کی تلاشی بھی لی گئی تھی اور جس قدر کاغذات ملے تھے، افسران تفتیش نے اپنے قبضے میں کر لئے تھے۔ انہیں میں ترجمہ اور تفسیر کا مسودہ بھی تھا، لیکن جب معائنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں کوئی چیز قابل اعتراض اور حکومتِ ہند کے مفید مقصد

نہیں ہے تو دو ہفتے کے بعد واپس دے دئے گئے۔

لیکن جب تفتیش کے نتیجے سے حکومتِ ہند کو اطلاع دی گئی تو اس نے مقامی حکومت کے فیصلے سے اتفاق نہیں کیا۔ وہاں خیال کیا گیا کہ مقامی حکومت نے کاغذات واپس دے دینے میں جلدی کی اور بہت ممکن ہے پوری ہوشیاری کے ساتھ معائنہ نہ کیا گیا ہو۔ اس زمانے میں حکومت ہند کے محکمۂ تفتیش کا افسرِ اعلیٰ سر چارلس کلیو لینڈ تھا۔ اور مختلف اسباب سے جن کی تشریح کا یہ موقع نہیں، اسے میری مخالفت میں ایک خاص کد ہو گئی تھی۔ وہ پہلے کلکتہ آیا اور دو ہفتے تک تفتیش میں مشغول رہا۔ اور پھر رانچی آیا اور از سرِ نو میرے مکان کی تلاشی لی گئی۔ تلاشی کے بعد کہا گیا کہ جو کاغذات پچھلی تلاشی کے موقع پر لئے گئے تھے اب حکومتِ ہند کے معائنے کے لئے بھیجیں جائیں گے۔ چنانچہ تمام کاغذات حتیٰ کہ چھپی ہوئی کتابیں بھی لے لی گئیں۔ ان میں صرف ترجمہ و تفسیر کا مسودہ ہی نہیں تھا بلکہ بعض دوسری تصنیفات کے بھی مکمل و نامکمل مسودات تھے۔

جس وقت یہ معاملہ پیش آیا ترجمے کا مسودہ آٹھ پاروں تک اور تفسیر کا مسودہ سورہ نساء تک پہنچ چکا تھا، لیکن اب ان کا ایک ورق بھی میرے قبضے میں نہ تھا، تاہم میں نے نویں پارے سے ترجمے کی ترتیب جاری رکھی اور ۱۹۱۸ء کے اواخر میں کام ختم کر دیا۔ اب اگر ابتدا کے آٹھ پاروں کا ترجمہ واپس مل جائے تو پورے قرآن کا ترجمہ مکمل تھا۔

میں نے کاغذات کی واپسی کے لئے خط و کتابت کی، لیکن جواب ملا کہ نہ تو سرِ دست واپس دئے جا سکتے ہیں، نہ ہی بتایا جا سکتا ہے کہ کب تک واپس کئے جائیں گے چونکہ کاغذات کی واپسی کی بظاہر کوئی قریبی امید نظر نہیں آتی تھی اور کچھ معلوم نہ تھا کہ آگے چل کر کیا صورت حال پیش آئے، اس لئے یہی

مناسب معلوم ہوا کہ ازسرنو ان پاروں کا ترجمہ کر کے کتاب مکمل کرلی جائے۔
یہ کام آسان نہ تھا۔ایک لکھی ہوئی چیز کو دوبارہ لکھنا طبیعت پر بہت شاق گزرتا
ہے۔تاہم میں نے چند ماہ کی محنت کے بعد یہ حصہ بھی ازسرنو مکمل کرلیا۔

''گفتہ'' گر شد زکفم ،شکر کہ ''ناگفتہ'' بجاست

از دو صد گنج ، یکے مشت گہر باختہ ام'' 9

لیکن مولانا کا آہنی عزم اور قوتِ ارادی کبھی سپر انداز نہیں ہوئی بلکہ منفی حالات میں اُن کے حوصلے اور بھی بلند ہوتے رہے۔وہ کبھی نہیں گھبرائے۔حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔چنانچہ لکھتے ہیں:۔

''جب کبھی اسی طرح کا معاملہ یکا یک پیش آجاتا ہے تو ابتدا میں اُس کی سختیاں پوری طرح محسوس نہیں ہوتی کیونکہ طبعیت میں مقاوت کا ایک سخت جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔اور وہ نہیں چاہتا کہ صورتحال سے دب جائے۔! وہ اس کا غالبانہ مقابلہ کرنا چاہتا ہے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک پر جوش نشہ کی سی حالات طاری ہو جاتی ہے۔نشہ کی تیزی میں اتنی ہی سخت چوٹ لگے اس کی تکلیف محسوس نہیں ہوگی ۔تکلیف اس وقت محسوس ہوگی جب نشہ اترنے لگے گا اور جماہیاں آنے شروع ہوں گی۔اس وقت ایسا معلوم ہوگا جیسے سارا جسم درد سے چور چور ہو رہا ہو چنانچہ اس معاملے میں بھی پہلا دو نشہ جذبات کی خود فرمائشوں کی گذر علائق کا پوری انقطع ،کاروبار کی نگاہ بانی مشغولیت کا یہ قلم تعطل ،کوئی بات بھی دامن دل کو کھینچ نہ سکے۔کلکتہ سے بااطمینان تمام نکلا اور رانچی میں شہر کے باہر ایک غیر آباد حصے میں مقیم ہو گیا لیکن پھر جوں جوں دن گذرتے گئے طعبیت کی بے پروائیاں جواب دینے لگی۔اور صورت حال کا ایک ایک کانٹا پہلو دل میں چبھنے لگا۔یہی وقت تھا جب مجھے اپنی طعبیت کی اس انفعالی حالا

ت کا مقابلہ کرنا پڑا، اور ایک خاص طرح سانچا اس کے لئے ڈھالنا پڑا۔اس وقت سے لے کر آج تک چھتیس برس گذر چکے وہی سانچا کام دے رہا ہے اور اس قدر پختہ ہو چکا ہے کہ ٹوٹ جا سکتا ہے مگر لچک نہیں کھا سکتا۔''[10]

رانچی میں اپنی مصروفیات کا ذکر بہت ہی رومانی اور پر لطف انداز میں اس طرح کرتے ہیں کہ پڑھنے والے پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ وقت کا صحیح استعمال کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔اُن کا مشاہدہ، ان کا سحر انداق، اُن کے جوش استقامت کی دیکھئے اعلیٰ مثال:۔

''الحمدللہ کہ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک نہ کوئی صدا ذوقِ سماع میں مخل ہے اور نہ کوئی منظر مشغولیت میں حارج۔ غالب وقت تصنیف وتالیف میں صرف ہوتا ہے کہ عام تر کتاب عزیز وسنت مطہرہ کی شرح وتفسیر پر مشتمل ہیں اس سے جس قدر مہلت نکلتی ہے وہ بھی ضائع نہیں جاتی۔میدان دور دور تک ہیں اور میدان چاروں طرف۔''[11]

رانچی میں رمضان المبارک میں مولانا کے مشاغل:۔

نظر بندی کے دوران مولانا کو رانچی میں رمضان المبارک گذارنے کی سعادت نصیب ہوئی۔جس کا ذکر نہایت ہی لطیف اور مؤثر انداز میں کرتے ہیں۔اُن کے جذبات کی شدت اور صداقت کے اظہار کا مطالعہ قاری کو روحانی فرط وانبساط میں شرابور کر دیتا ہے۔جلا وطنی اور رمضان المبارک کا مقدس مہینہ۔دیکھئے یہ تراشہ:۔

'' اسی اثنا میں رمضان المبارک کی برکات ونعائم کا ورود ہوا۔ اگرچہ نماز جماعت کی کیفیت انجمن طراز اور جماعت تراویح وسماع تلاوت کی لذت دلنواز سے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ محرومی رہی اور اس لئے ابتدا کے دو چار دن یک گونہ انقباض ودل گرفتگی میں بسر ہوئے لیکن اس کے بعد ہی مقام خلوت وانزوا کی کیفیتوں اور انجمن درخلوت کی خود رفتگیوں کا عالم کچھ اس طرح طاری ہوا کہ

دنیا جہاں کی ساری صحبتوں اور انجمنوں سے دل بے پروا ہوگیا۔علی الخصوص عشرۂ اخیر کی شب ہائے تمنا اور روز ہائے انتظار کی بخششوں اور کامرانیوں سے دل نے جو سعادتیں پائیں اور چشم و گوش نے لطف دید و ذوق سماع کی جو جو دولتیں لوٹیں نہ دنیا کی کوئی زبان اُن کی ترجمانی کرسکتی ہے نہ سامعہ استعداد سماع رکھتا ہے۔ البتہ حسرت تو یہ رہی کہ کاش پوری زندگی کی وسعت کسی طرح ان دس راتوں میں آجاتی اور ساری عمر اسی عالم میں بسر کرجاتے۔

شب وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو
کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شبِ جدائی کا" [۱۲]

ایک اور مقام پر رانچی میں رمضان المبارک کے موقع پر جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کی روئداد اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

"جس مقام پر مقیم ہوں۔شہر یہاں سے کچھ فاصلہ پر ہے۔ رمضان المبارک میں جمعہ کے دن جامع مسجد۔ چند صفوں سے زیادہ نہ تھا۔لوگوں نے خطبہ و امامت کے لئے سخت اصرار کیا۔مجبوراً خطبہ دینا پڑا۔ان بیچاروں نے اب تک خطبے کے یہی معنی سمجھے تھے کہ عربی کی کوئی چھپی ہوئی کتاب پڑھ دی جائے۔ یہاں مسلمانوں کی تعداد اگر چہ اچھی خاصی ہے مگر ایک گمنام گوشے میں پڑ جانے کی وجہ سے حد درجہ تباہی و بدحالی میں مبتلا ہیں۔نماز جمعہ کے بعد سے ایک قومی داعیہ قلب میں محسوس ہو رہا ہے کہ اگر حالات طویل قیام کا باعث ہوئے تو یہاں بھی اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔ دنیا نے فراغ و آزادی کے زمانے کے کاموں کا کچھ نہ کچھ نمونہ دیکھ لیا ہے۔بہتر ہے کہ جلاوطنی و نظر بندی کے بند و قید میں کام کرنے کا بھی ایک نمونہ دکھلا دیا جائے کہ اصلی آزمائش گاہِ عمل یہی ہے۔

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر''[۱۳]

رانچی میں روزانہ مولانا آزاد کو حاضری کے لئے تھانہ جانا پڑتا تھا۔ مورا بادی سے مولانا روزانہ ہاتھ رکشا سے عصر کے پہلے تھانہ کیلئے روانہ ہوئے۔ تھانہ میں حاضری دے کر اُسی رکشا سے جامع مسجد آتے اور رکشا چھوڑ دیتے۔ عصر کی نماز پڑھاتے۔ پھر نماز مغرب کے بعد ایک ڈیڑھ گھنٹہ تفسیر بیان فرماتے۔ رمضان کے موقع پر تھانہ میں روزانہ حاضری نہ دینے کی چھوٹ تھی بلکہ مسجد میں روزانہ حاضر ہونے کی اجازت دی گئی تھی۔

چونکہ مولانا کی رہائش گاہ پر پولس کا پہرہ لگا ہوتا تھا لہذا لوگ اُن کے دولت کدہ پر ملنے سے گھبراتے تھے لیکن بعد میں لوگوں کا خوف دور ہو گیا تو کافی تعداد میں لوگ ان سے ملنے اُن کی رہائش گاہ پر جاتے۔ دوسرے شہروں سے بھی لوگوں کا آنے جانے کا سلسلہ رہتا۔ مولانا عام طور پر صبح آٹھ نو بجے لوگوں سے اپنی رہائش گاہ پر ملتے۔

حکم جلاوطنی کی منسوخی کے لئے کاوشیں:۔

مولانا آزاد کی شخصیت اب لوگوں کے درمیان ایک قائد کی بن چکی تھی۔ اُن کے دوستوں اور قدردانوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس کوشش میں لگی رہی کہ حکم جلاوطنی کو کسی طرح منسوخ کرائی جائے۔ مولانا کو نظر بندی سے نجات دلانے کے لئے ساٹھ ہزار سے زیادہ دستخطوں کے ساتھ ایک میمورنڈم حکومت کو پیش کیا گیا۔ اس سلسلے میں بعض ارکان حکومت کی طرف سے غلط فہمیوں کے اعتراف کے طور پر خطوط بھی آتے رہے لیکن یہ سب کوششیں رائیگاں گئیں۔ مولانا خود لکھتے ہیں:۔

''اس اثناء میں حکم جلاوطنی کی منسوخی کے لئے احباب و متعلقین نے کوئی دقیقہ سعی و تدبیر کا اُٹھا نہ رکھا۔ شاید اس قسم کی کوششوں کی یہ پہلی مثال ہے کہ ساٹھ ہزار سے زیادہ دستخطوں کے ساتھ میموریل بھیجا گیا تھا۔ بعض ارکان حکومت بنگال کے خطوط پچھلے مہینے آتے رہے اور معلوم ہوا کہ غلط فہمیوں کا اعتراف ہے

۔حال ہی میں ایک شخص سے ملاقات کرتے ہوئے خود لارڈ کار مائیکل نے بھی
ایسا ہی خیال ظاہر کیا تھا۔حتیٰ کہ شام تک منسوخی حکم کے اجراء کی امید دلائی تھی۔
ابتداء میں ان واقعات کا دل پر کچھ نہ کچھ اثر تو ضرور پڑا لیکن پھر دیکھا تو دل کی
آسودگی اور طبیعت کی وارستگی پر یہ تاثر بھی شاق تھا۔

دانم کہ شفیق اندطپیاں ہمگی، لیک
مرہم کہ نہ محبوب نہد، دشمن ریش است

بظاہر حالات مشیتِ الٰہی کچھ اور ہی نظر آتی ہے اور شاید تکمیل کار کی ایک منزل ابھی باقی ہے۔

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید کچھ نہ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں''[۱۴]

اس طرح حکومت اپنا فیصلہ کسی طرح تبدیل کرنے پر آمادہ نہیں ہوئی۔خیر خواہوں، قدر دانوں اور دوستوں کی کاوشیں بیکار گئیں۔مولانا نے حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے رانچی کے ماحول میں زندگی گذارنے کے لئے اپنے آپ کو ذہنی طور پر راضی کرلیا اور یہاں کے مختلف قومی، ملی، مذہبی، علمی، کاموں میں خود کو مصروف کرنے میں کامیاب ہوگئے جس کا ثمرہ علمی اعتبار سے''تذکرہ''، ''ترجمان القرآن'' اور ''جامع الشواہد'' کی شکل میں عملی اعتبار سے انجمن اسلامیہ اور مدرسہ اسلامیہ کی شکل میں رانچی کے مسلمانوں کو ایک قیمتی اثاثہ ہاتھ لگا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے رانچی میں نظر بندی کے دوران کیا کارہائے نمایاں انجام دئے اور اُن کے فکر وعمل کے کیا نتائج پیدا ہوئے۔اُن کی تشریف آوری سے علمی، دینی، قومی وملی اعتبار سے کیا انقلاب رونما ہوا؟ کس حد تک یہاں کی علمی، دینی، قومی، ملی وسیاسی زندگی میں تبدیلیاں آئیں؟ پھر یہ کہ خود مولانا کے کردار، قول، فعل، عمل، تبلیغ، تحریک، تلقین، رشد وہدایت۔ خطابت کا اثر یہاں کے لوگوں نے کس حد تک قبول کیا۔اس سلسلے میں ہمیں کئی شہادتیں ملتی ہیں۔ مثلاً مولوی مظہر الدین شیر کوٹی نائب مدیر ''مدینہ'' بجنور کے تحریری تاثرات جو انہوں نے رانچی

کے سفر کے بعد قلمبند کئے جوانہوں نے ۲۰ اگست ۱۹۱۶ کے صفحہ ۳ اور یکم مئی ۱۹۱۸ کے صفحہ ۳ پر شائع کیا ہے۔واضح ہو کہ مولوی مظہرالدین دارالارشاد کلکتہ میں متعلم کی حیثیت سے اور مدرسہ اسلامیہ رانچی میں کچھ عرصہ تک مدرس کی حیثیت سے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ان کی دونوں تحریروں کو استناد کا درجہ حاصل ہے۔اپنی باتوں کو تقویت بخشنے کے لئے دونوں تراشوں کو نقل کرنا غیر مناسب نہ ہوگا:۔

(۱) ''گرمی کی شدت سے میں نے گھبرا کر کسی نہ کسی طرح چند دنوں کی مہلت نکالی اور رانچی پہنچا تا کہ ایک ہفتہ کے لئے ذرا ستالوں۔ مجھ کو معلوم تھا کہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ یہیں تشریف رکھتے ہیں۔ میں ڈورنڈے میں ٹھہرا، جہاں سرکاری دفاتر ہیں۔ وہاں معلوم ہوا کہ مورابادی میں کوئی پہاڑی ہے۔اس کے دامن بنگلے میں مولانا وہاں رہتے ہیں اور یہاں سے بڑا فاصلہ ہے۔حسن اتفاق سے جمعہ کا دن تھا۔لوگوں نے کہا کہ جمعہ کی نماز کے لئے جامع مسجد میں تشریف لاتے ہیں۔اورلوگوں کے اصرار کی وجہ سے وہی نماز پڑھاتے ہیں۔ وہاں بہ آسانی ملاقات ہوجائے گی۔ چنانچہ میں بارہ بجے مسجد پہنچا۔

یہاں کی جامع مسجد اچھی خاصی وسیع ہے۔صحن بھی اچھا ہے۔لیکن اس قدر مجمع تھا کہ دروازہ تک لوگ رومان بچھا بچھا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے لوگوں سے پوچھا کہ ہمیشہ ایسا ہی مجمع ہوتا ہے۔انہوں نے کہا جب سے مولانا صاحب نے یہاں آنا شروع کیا۔ان کے دیدار کے شوق میں دور دور سے لوگ آجاتے ہیں اور بہت سے ایسے لوگ بھی آتے ہیں۔ جنہوں نے کبھی مسجد کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ دوڑے چلے آتے ہیں......تھوڑی دیر بعد مولانا تشریف لائے۔اذان ہوئی اور خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے۔ میں اس سے پہلے حضرت کی تقریر مبارک نہیں سنی تھی۔مولانا نے پہلے عربی میں حمد ونعت

فرمائی۔اس کے بعد اردو میں حاضرین کو مخاطب کیا اور روزہ کا حکم ،اس کی حقیقت اور غرض کو بیان فرمانا شروع کیا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ اس وقت مجمع کا کیا حال تھا۔کوئی شخص نہیں تھا،جس کی آنکھوں سے آنسو نہ بہہ رہے ہوں۔ اور ذوق سے وہ خالی ہوں۔جب آخر میں انہوں نے ''واذا سالک عبادی عنی فانی قریب طاُجیب دعوۃ الداعی اذا دعان o کی آیت اور روزہ کے متعلق بیان فرمایا تو خود میرا جو حال ہوا، میں اس کو لفظوں میں عرض نہیں کرسکتا اور سچ تو یہ کہ میں نے عمر بھر میں اسی دن نماز پڑھی۔دوسرا خطبہ اول سے آخر تک عربی میں تھا۔اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ بھی اردو میں ہوتا تو بہتر تھا۔

جب نماز شروع ہوئی اور انہوں نے درد و رقت سے بھر ہوئی آواز میں سورۂ جمعہ پڑھنا شروع کیا۔تو عجیب حال طاری ہوئی۔میری بغل میں مولانا خدا بخش صاحب امام جامع مسجد بیٹھے تھے۔میں نے محسوس کیا کہ جوش گریہ سے عین حالت نماز میں ان کی حالت متغیر ہوگئی تھی۔دراصل خطبہ نے تمام لوگوں کو اصلی اور سچی نماز کے لئے طیار کردیا۔اور یہی مقصد خطبہ کا ہونا چاہئے۔نماز کے بعد لوگوں نے اصرار کیا کہ اگلے ہفتہ میں لیلۃ القدر آنے والی ہے،اس کے متعلق کچھ ارشاد فرمائیے۔اس پر مولانا نے تقریر فرمائی اور لیلۃ القدر کی حقیقت کو واضح کیا۔''

(۲) ''رانچی ، پلاموں ، ہزار یباغ چھوٹا ناگپور کے اضلاع میں اور ان تمام اضلاع میں مسلمان بالعموم نیم وحشت کے دائرے سے باہر نہیں۔پیر پرستی ،قبر پرستی اور طرح طرح کی اوہام پرستی یہاں موجود ہے اور جہالت سے زیادہ غربت وافلاس کے نتیجہ میں یہ لوگ نیم جان ہیں مگر باوجود اس غربت کے پیر پرستی کا یہ عالم ہے کہ کوئی چرب زبان جاہل واعظ آجائے اس کے سامنے

سجدے کرنے کیلئے تیار ہیں۔صرف اس کی ضرورت ہے کہ لابنی جتائیں اس کے شانوں پراورعبا کے دامن زمین پر لٹک رہے ہوں۔باوجود صبر آزما افلاس کے ایک ایک واعظ یا پیر ڈیڑھ دو ہزار روپیہ تک یہاں سے وصول کر کے لے گئے ہیں۔بعض دیہات میں اب تک پیر کی پڑھی ہوئی چھری سے مرغ وبکرے ذبح کئے جاتے تھے۔اول تو یہاں مسلمان تعلیم یافتہ نہیں اور جو کچھ ہیں تو وہ اردو کے بجائے ہندی پڑھتے ہیں۔بالعموم مسلمان تاجروں کا بہی کھاتا ہندی میں ہے۔یہاں تک کہ جامع مسجد رانچی کی جائداد موقوفہ کے رجسٹر ورسید بہیاں خود احقر مدیر مدینہ نے اپنی آنکھوں سے ہندی میں دیکھیں۔غرض جہالت اور جہالت کہ تمام لوازم ایک بدترین شکل میں یہاں موجود ہیں۔ایک دوسری بلائے عظیم اور ہے کہ وہ یہ کہ بالعموم اس نواح کے باشندے اراؤں اور ڈمراؤں ہیں۔جوکول قوم کی دو صنف ہیں.....بہر حال انگلش،رومن مشن، یہاں پہنچے اور چند سال کے عرصے میں کئی لاکھ آبادی کو عیسائی بناڈالا.....ایسی حالت میں یہ ناممکن تھا کہ لوگوں پر مشنریوں کا جادو نہ چلے اور جاہل مسلمان محفوظ رہیں۔چنانچہ اکثر مسلمان بھی مسیح کے گلے میں شامل ہو گئے اور شامل ہور ہے ہیں۔"

ایک تحریر مولانا کے رفیق کار اور اردو کے بلند پایہ ادیب سید سلیمان ندوی کی ملاحظہ ہو۔مولانا سید سلیمان ندوی نے نہایت ہی بلیغ انداز میں رانچی میں مولانا آزاد کے کارہائے نمایاں،اُن کے جذبہ ایثار اور خدمات ملی کا نقشہ کھینچا ہے۔مولانا سید سلیمان ندوی مولانا آزاد کی دعوت پر انجمن اسلامیہ کے جلسے میں شرکت کیلئے رانچی تشریف لائے۔انہوں نے یہاں کے تمام احوال وکوائف کا بغور مشاہدہ کیا اور جو کچھ تحریر کیا اس کی حیثیت ''شہادت حق'' کی ہوگئی ہے۔ دیکھئے یہ تحریر:۔

''اگر ہمارے نظر بندوں میں کوئی ایسا ہے جو اُسوۂ محمدی پر فائز ہوا۔(شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی طرح اشارہ ہے) تو ہم میں ایک اور ہستی ایسی ہے جو اُسوۂ یوسفی کے درجہ پر ممتاز ہوئی جس عزم و استقلال استغناء اور قوت ایمانی کے ساتھ مولانا نے یہ زمانہ بسر کیا ہے وہ آئمہ سلف کی یاد کو تازہ کرتا ہے شاید سب کو معلوم نہ ہو کہ انہوں نے حکومت کا وظیفہ لینے سے انکار کر دیا اور اعانت نظر بنداں کا موہوار عطیہ بھی قبول نہیں کیا۔ اس زمانے میں ان کو جو مالی دقتیں پیش آئیں وہ صرف عبادی الشکور کے رمز میں پنہاں ہیں۔ یہ معلوم ہوگا کہ رات کو انہیں گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس بناء پر وہ نماز عشاء کی جماعت میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے اسے گوارا نہ کیا انہوں نے حکومت سے اجازت چاہی اور جب کوئی جواب نہ ملا تو برملا اعلان کر دیا کہ فریضہ الٰہی میں انسانوں کے فرمان مانع نہیں آ سکتے! آہ ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو آزادی کے بستر پر بھی اٹھ کر خدا کے آگے سر نہیں جھکاتے اور ایک وہ عباد صالحین ہیں جو قید و تنگی میں بھی مساجد الٰہی کو فراموش نہیں کر سکتے۔

رانچی ایک ایسا مقام تھا جہاں مسلمان نہایت ذلت و نکبت کی حالت میں تھے۔ جہالت اور باہمی خانہ جنگی نے ان کو گرد و پیش کے حالات سے ناواقف کر رکھا تھا۔ عیسائی مشنریوں کا جال ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ عالم دین کا وجود اس خطہ پر نہ تھا۔ مذہبی احساسات کی روح ان میں مردہ تھی لیکن مولانا کے پُر تو صحبت نے چند ہی سال کے بعد وہاں کی زمین و آسمان کو ملا دیا۔ اب ہم وہاں ''اسلامی انجمن'' کا نام سنتے ہیں۔ ایک مدرسہ اسلامیہ کی بنیاد دیکھتے ہیں۔ علماء و مشاہیر کے مواعظ حسنہ کا وہاں جلوہ نظر آتا ہے۔ مذہب و ملت کی روح کو ان کے جسم و تن میں گردش کرتے ہوئے پاتے ہیں اور وہاں کے فقراء

اورخاک نشینوں میں اب یہ حوصلہ دیکھتے ہیں کہ علم کا پہلا کعبہ اس دیار میں وہ خود اپنے زور بازو سے قائم کر کے رہیں گے۔ جہاں ایک عالم دین کا وجود نہ تھا وہاں اب یہ کوششیں ہو رہی ہیں کہ سینکڑوں علماء دین اس خاک سے پیدا ہو کر اس سرزمین کو منور کریں جہاں مسجدیں بے چراغ تھیں وہاں ایک خورشید سے دیر وحرم میں اجالا نہ گیا۔

زمانہ قیام رانچی میں ایک سال تک جامع مسجد میں مولانا نے مسلمانوں کو قرآن مجید کا درس دیا۔ زیادہ تر اوقات تالیف وتصنیف میں بسر ہوئے۔ ''ترجمان القرآن'' اسی زمانے میں ختم ہوا۔ '[البیان'' تفسیر القرآن میں ایک جامع تصنیف کا سلسلہ ۲۳ پاروں تک پہنچا۔ فقہ اسلامی پر بغیر فریقانہ تعصب کے صرف کتاب وسنت کو پیش نظر رکھ کر متعدد رسائل' [الصلوۃ]، [الزکوۃ]، [الحج]، [النکاح] ترتیب دیئے۔ سوانح مجددین کا سلسلہ شروع کیا۔ اوراس میں علامہ بن تیمیہ علامہ ابن قیم اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی صاحب کے سوانح قلمبند کئے۔ ایک رسالہ منطق اور بعض دوسرے عنوانات علمی تحریر کئے۔ ان سطروں کو لکھتے وقت مجھے دھوکا ہوا ہے کہ میں خود امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم یا شمس الائمہ سرخسی اور امیہ بن عبدالعزیز اندلسی کے حالات تو نہیں لکھ رہا ہوں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ نوجوان مسلمانوں میں قرآن پاک کا ذوق مولانا ابوالکلام کے [الہلال]، [البلاغ] نے پیدا کیا۔ جس اسلوب بلاغت، کمال انشاپردازی اور زور تحریر کے ساتھ انہوں نے انگریزی خواں نوجوانوں کے سامنے قرآن پاک کی ہر آیت کو پیش کیا اس نے ان کے لئے ایمان اور یقین کے نئے نئے دروازے کھول دیئے اور ان کے دلوں میں قرآن پاک کے معانی ومطالب کی بلندی ووسعت کو پوری طرح نمایاں کر دیا۔ ضرورت تھی کہ اسی

موثر قلم سے قرآن پاک کی پوری تفسیر شائع ہوتی کہ عربی سے نابلد مسلمانوں کے لئے نور بخش اور افزائش بصیرت کا سروسامان اردو میں میسر آئے۔

۱۹۱۲ کے شائقین کا اصرار تھا اور خود مولانا کی بھی خواہش تھی کہ وہ قرآن پاک کا ایک ترجمہ اور ایک تفسیر لکھیں چنانچہ نظر بندی کے زمانے میں آپ نے تفسیری ترجمہ کی طرف توجہ کی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ بڑی تفسیر لکھنے کا خیال بھی ان کے دل سے محو نہیں ہوا۔ لیکن جنگ عظیم کے اعلان کے بعد سیاسی دارو گیر کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس نے ان کے جیسے آزاد کو بارہا گرفتار اور بارہا آزاد کیا۔ اس سلسلہ قید و حبس میں ان کے کاغذات، مسودات بھی بارہا نظر بند ہوئے آخر ان پے در پے حوادث کی بادتند نے۔ ان اوراق کو پراگندہ اور منتشر کردیا۔!

مصنف کو جب کبھی جیل کے اندر یا باہر یک سوئی نصیب ہوئی اس نے ان اوراق پریشاں کو از سرنو مرتب کرنا شروع کردیا اور عجب نہیں کہ مولانا حالؔی کا یہ شعر اس وقت ان کی زبان پر ہو۔

میں آج بیٹھا ہوں ترتیب دینے دفتر کو
ورق ہی جب کہ اڑا لے گئی ہوا ایک ایک

بہرحال وہ مبارک وقت آیا کہ مولانا آزاد نے اپنے ترجمہ و تفسیر کی پہلی جلد ''ترجمان القرآن'' مرتب کر کے شائع کی۔ اس جلد میں سورۂ فاتحہ کی مکمل تفسیر اور سورۂ بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ اور انعام پانچ سورتوں کا (جو آٹھ پاروں پر مشتمل ہیں) تفسیری ترجمہ ہے۔ مصنف ''ترجمان القرآن'' کی یہ دیدہ وری داد کے قابل ہے کہ انہوں نے وقت کی روح کو پہنچانا اور فتنۂ فرنگ کے عہد میں اس طرز وروش کی پیروی کی جس کو ابن تیمیہ اور ابن قیم نے فتنۂ تاتار میں پسند کیا تھا۔

''ترجمان القرآن'' وقت کی اہم چیز ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو گھر گھر پھیلایا جائے اور نوجوانوں کو اس کے مطالعہ کی ترغیب دی جائے!''[15]

خود مولانا آزاد نے رانچی میں نظر بندی کے زمانے پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے جذبات، احساسات و تاثرات کا اظہار ہفتہ وار پیغام' بابت ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ کے شمارے میں اس طرح کیا ہے:

'' عین ۱۹۱۸ء کے اواخر عہد میں جب کہ امیدوں اور آرزوؤں کی پوری دنیا اُلٹ چکی تھی اور اُس کی ویرانیوں اور پامالیوں پر سے سیلاب حوادث پورے زور و شور کے ساتھ گذر چکا تھا تو میں رانچی کے گوشۂ عزلت میں بیٹھا ہوا ایک نئی دنیائے امید کی تعمیر کا سروسامان دیکھ رہا تھا اور گو دنیا نے دروازہ کے بند ہونے کی صدائیں سنی تھیں مگر میرے کان ایک نئے دروازہ کے کھلنے پر لگے ہوئے تھے۔

تفاوت ست میان شنیدن من وتو
تو لستن درومن فتح باب می شنوم

۱۸ء رمضان المبارک کا پہلا ہفتہ اور اس کی بیدار و معمور راتیں جب میں اپنی ہاتھوں سے اُمیدوں اور ارادوں کے لئے نقشوں پر لکیریں کھینچیں جن سے تمام پچھلے نقشے چاک کر چکا تھا۔''[16]

مولانا آزاد کے انتقال کے بعد رانچی کے حوالے سے ہمیں دو مضامین کا سراغ ملتا ہے۔ ایک مضمون مولانا ابو محمد مصلح کا ہے جو پٹنہ سے نکلنے والا رسالہ ''الکلام'' کے ۲۴ فروری ۱۹۶۰ کے شمارے میں شائع ہوا۔ رانچی کے حوالے سے اس مضمون کی حیثیت ایک مستند دستاویز کی ہوگئی ہے

مولانا ابو محمد مصلح کے مضمون کا تراشہ:۔

'' مکتبہ میں میرا قیام تھا اور رہائش مسجد ناخدا کے قریب تھی جو شہر کے مسلمانوں کا مرکزی مقام بھی ہے۔ کچھ دنوں پیشتر سے یہ خبر عام ہوگئی کہ مولانا آزاد رانچی میں نظر بند کئے جارہے ہیں اور آئندہ جمعہ کی نماز وہ مسجد ناخدا میں ادا کریں

گے۔ جس کے بعد ان کو یہاں کے لوگوں سے کب تک کے لئے جدا ہونا پڑے گا۔ اور کلکتہ کو چھوڑ دینا پڑے گا۔ وقفہ کے دن عوام کے لئے ایک طرح کے غم وغصہ اور رنج وغم میں گزرے اور جمعہ کا دن آیا۔ آج صبح سے نماز کی صف میں آگے بڑھ کر جگہ لینے کی فکر ہر شخص کو دامن گیر تھی۔ راستہ بند ہو گیا۔ ٹریفک رک گئی۔ ٹراموے وغیرہ کی آمد ورفت کو بند ہو جانا پڑا۔ اس لئے کہ مسجد کا اندر حصہ اور صحن مسجد کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ لوگوں کو خیال تھا کہ شاید مولانا کوئی تقریر کریں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ مصری خطیب نے خطبہ دیا اور نماز جمعہ ختم ہوئی۔ دعا کے بعد مولانا اپنی جگہ سے اٹھے۔ ہجوم نے دست بوسی کی بے تابانہ کوشش شروع کر دی جس کی وجہ سے مسجد سے باہر آنے میں کافی وقت لگا۔ مولانا عالمانہ لباس زیب تن کئے ہوئے تھے۔ پنجابی نما عمامہ سر پر تھا۔ سنہری عینک آنکھوں پر لگی ہوئی تھی۔ شروانی کے اوپر عبا اوڑھے ہوئے تھے۔ بہر حال مسجد کے دوسرے دروازے سے ٹراموے کے راستہ پر آئے تو کئی موٹر نشیں اپنی اپنی موٹر لئے ہوئے موجود تھے اور ان میں سے ہر ایک کی کوشش تھی کہ مولانا ان کی موٹر میں بیٹھیں۔ موٹروں میں غالباً ایک موٹر جناب شہید سہروردی صاحب کی بھی تھی۔ مگر معلوم نہیں یہ سعادت کس کے حصہ میں آئی۔ میں نے اپنا یہ موزوں کیا ہوا شعر خود ہی کہا اور خود ہی سنا کا مصداق بنا ہوا روانہ ہو گیا۔

آزادیاں ہوں قرباں قید بلا پہ تیری
جا اے مرے مسافر تجھ کو خدا پہ چھوڑا

رانچی صوبہ بہار کا ٹھنڈا مقام ہے مولانا یہاں صرف نظر بند تھے قید میں نہیں تھے اس لئے باہر کے لوگوں کا آنا جانا جاری تھا زیادہ تر کلکتہ کے لوگ آتے تھے اور تحفہ تحائف ساتھ لاتے تھے۔ مولانا پابندی کے ساتھ پانچ وقتوں کی نماز قریب

کی مسجد میں ادا فرماتے تھے۔ شب کا وقت تھا عشاء کی نماز خوب خشوع وخضوع کے ساتھ ادا فرمارہے تھے کہ برسات شروع ہوگئی۔ شرابور ہوگئے مگر نماز اپنے وقت پر ختم ہوئی۔

ڈالٹن گنج (ضلع پلامو) کے ایک ہندو وکیل صاحب رانچی میں وکالت کرتے تھے۔ مولانا نے ان کو کسی معاملہ میں مشورہ لینے کے لئے بلایا مشورہ لینے کے بعد ان کی فیس پیش کی وکیل صاحب نے تعجب کیا اور اس کو معمولی بات سمجھ کو فیس لینے سے انکار کیا مگر مولانا کے سامنے وکیل صاحب کی کب چل سکتی تھی۔ مولانا نے کہا، آپ کا یہ پیشہ ہے چنانچہ میں آپ سے مفت کیوں کام لوں بیچارے وکیل صاحب کو فیس لینی پڑی۔

نظر بندوں کو قانون الاؤنس ملنا چاہئے چنانچہ علی برادرز وغیرہ نے بھی حاصل کیا ہے اس راہ میں بھی مولانا منفرد نظر آتے ہیں۔ گورنمنٹ کی طرف سے ان کے لئے جو الاؤنس مقرر کیا گیا وہ غالباً دو تین سو روپئے کی مقدار کا تھا۔ مولانا نے اپنا جائز مطالبہ اس سے زیادہ پیش کیا جس پر حکومت سے خط وکتابت شروع ہوئی اس صورت حال کو ختم کرنے کے لئے یہ آخری جملے تحریر فرمائے" یہ رقم میرے یہاں خرچ کے لئے بالکل ناکافی۔ میرا مطالبہ صحیح ہے۔ اگر گورنمنٹ کے خزانہ میں اس کی گنجائش ہے تو الحمد للہ میرے دل میں اس کی جگہ ہے کہ اس کو بھی نہ لوں۔"

رانچی میں مولانا نے ایک بڑا کام یہ کیا کہ ایک اسلامی مدرسہ کی شاندار عمارت تعمیر کرائی اور ہندوستان کے نامور علماء اور مشاہیر کو بلالیا اور ایک بڑا افتتاحی جلسہ منعقد ہوا۔

دوسرا اہم کام جو مولانا نے رانچی کی نظر بندی کے زمانے میں انجام دیا، وہ ان

کی کتاب ''تذکرہ'' کی ترتیب پاتا ہے۔اس کتاب کو ایک طرح سے مولانا کی سوانح عمری کا پیش خیمہ سمجھنا چاہئے۔معلوم نہیں ''تذکرہ'' کس طرح کتابی شکل پاسکا۔شاہ وارث امام صاحب پھلواری (میرے پھلواری بھاگلپور سنٹرل جیل کے رفیق) جو کچھ دنوں میں مولانا کے ہاں رہے ہیں کہتے تھے کہ مولانا کے ساتھ ایک صندوق بھی رہتا ہے جس پر لکھا ہوا ہے ''بوقت فرصت''

لطیفہ: کسی مقام سے کسی صاحب نے لکھا کہ میں رانچی آکر کچھ دنوں آپ کی خدمت میں رہوں۔مولانا نے جواب میں لکھا۔ضرور آیئے مگر رانچی آنے کے لئے نظر بند ہوکر آنا ضروری ہے۔'' [۱۷]

سہیل عظیم آبادی کے مضمون کے اقتباس:۔

دوسرا مضمون بہار سے تعلق رکھنے والے مشہور فکشن نگار سہیل عظیم آبادی کا ہے جو ''ماحول'' کراچی کے خصوصی شمارہ '' آزاد نمبر'' میں ستمبر ۱۹۶۰ میں شائع ہوا۔اس مضمون کے مطالعہ سے رانچی میں مولانا کے معمولات، مصروفیات کا تو اندازہ ہوتا ہی ہے ساتھ ساتھ اُس عہد میں رانچی کے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی سے بھی بخوبی واقفیت ہوجاتی ہے۔رانچی میں مولانا کو لوگوں کی فتنہ پردازیوں سے بھی نبرد آزما ہونا پڑا ان کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ملاحظہ ہو یہ تحریر:۔

''مولانا آزاد کے رانچی کے قیام کی 4 سالہ زندگی پر پردہ پڑا ہوا ہے لوگوں کا خیال ہے کہ مولانا رانچی میں خاموش رہ کر مطالعہ اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہے۔لیکن واقعہ یہ نہیں ہے۔ مولانا رانچی میں خاموش بالکل نہیں رہے۔جب وہ وہاں پہنچے تو رانچی کا عجب حال تھا۔ایک چھوٹا سا شہر تھا۔جس کی بہت بڑی آبادی حد درجہ پس ماندہ تھی۔مقامی آبادی میں صرف عیسائیوں میں تبلیغی مشن کی سرگرمیوں کی وجہ سے تعلیم تھی۔ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو لوگ تعلیم یافتہ تھے۔وہ عام طور پر دوسری جگہوں سے آکر آباد ہوئے تھے۔ان کے وہاں پہنچتے ہی مقامی لوگ ان کے گرد جمع ہونے لگے لیکن دلوں میں عقیدت رکھنے کے باوجود اکثر پڑھے لکھے لوگ ان سے دور رہتے

تھے۔ کیونکہ مولانا حکومت کی نظر میں ''خطرناک'' آدمی تھے۔ ان چند پڑھے لکھے لوگوں میں ایک تو تھے مرزا فضل الدین مرحوم جن کا ذکر ''تذکرہ'' کی اشاعت کے سلسلے میں آیا ہے۔ دوسرے تھے الطاف حسین خاں مرحوم جو پولس انسپکٹر تھے۔ مرزا فضل الدین کی دل چسپیاں صرف علمی و ادبی تھیں اور الطاف حسین خان صاحب عملی انسان تھے۔ مولانا نے رانچی میں رہ کر مقامی آبادی کی اصلاح کے لیے جو کچھ کیا۔ اس میں ان کے دست راست بنے رہے۔ ۱۸

مولانا نے نماز جمعہ کے بعد ایک مسجد میں خطبہ دینا شروع کیا۔ جس میں لوگ کثرت سے جمع ہوتے تھے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ مولانا کے اکثر شیدائی مولانا سے ملنے اور خطبہ جمعہ سننے کے لیے کلکتہ سے آیا کرتے تھے۔ رانچی شہر اور دیہاتوں کے مسلمان ان خطبوں میں شریک تو ہوتے تھے۔ لیکن معدودے چند لوگوں کے سوا شاید ہی کوئی کچھ سمجھ بھی سکتا ہو۔ یہ حال دیکھ کر مولانا نے رانچی میں انجمن اسلامیہ کی بنیاد ڈالی۔ اور اس کی نگرانی میں ایک مدرسہ قائم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس زمانے میں یہ کام ذرا سخت ہی تھا۔ ہندوستان کی قومی تحریک شروع تو ہو چکی تھی۔ لیکن عام لوگوں کا شعور بیدار نہیں ہوا تھا۔ پھر یہ کہ رانچی کے مسلمانوں کی عام آبادی غریب تھی۔ مدرسے کے قیام کے لیے فنڈ اکھٹا کرنا مقامی طور پر تقریباً ناممکن تھا۔ پھر بھی جب مولانا نے اپیل کی تو اکثر مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا۔ لیکن اس وقت کا رانچی، آج کا رانچی نہیں تھا۔ مولانا نے اپنے کلکتہ کے دوستوں اور عقیدت مندوں کے پاس الطاف حسین خاں صاحب کو بھیجا او رکافی سرمایہ جمع ہوگیا جس سے انجمن اور مدرسے کی عمارت بن گئی۔ بعد میں کلکتہ کے بعض اہل خیر مسلمانوں نے سوچا کہ روپیہ اکھٹا کر کے اتنی عمارتیں بنادی جائیں کہ کرایہ کی آمدنی سے مدرسہ اور انجمن کے اخراجات پورے ہوتے رہیں۔ اور ایسا ہوا بھی۔ لیکن مولانا کے رانچی سے چلے جانے کے بعد پورے پروگرام کی تکمیل نہ ہوسکی۔ البتہ انجمن اور مدرسہ اب بھی قائم ہے۔ بلکہ بعض نو جوانوں نے اس سے متعلق ایک ہائی اسکول بھی قائم کرلیا ہے۔ جو مولانا کے نام سے منسوب ہے۔ اور قابل قدر خدمت انجام دے رہا ہے۔

مولانا جب رانچی میں قیام فرماتے تھے تو وہاں کا عجب حال تھا...... مسلمانوں میں تعلیم کا
فقدان تھا۔ اور غریبی بھی تھی۔ مسلمانوں کا صرف ایک طبقہ خوش حال تھا جو دیسی شراب کا کاروبار کر
تا تھا۔ یہ لوگ شہر میں آباد تھے۔ مولانا نے اپنے خطبوں میں دینی اور سماجی مسئلوں پر روشنی ڈالی۔
اور اس کا اثر یہ ہوا کہ بہت سے مسلمانوں نے شراب کا کاروبار ترک کر کے دوسری تجارتیں شروع
کر دیں، حالانکہ ان مسلمانوں کا یہ خاندانی پیشہ سمجھا جا تا تھا۔ بہ ظاہر انہیں بڑا مالی نقصان اٹھانا پڑا۔
ان دنوں رانچی میں دوسرا بڑا جھگڑا حنفی اور وہابی کا تھا۔ چونکہ خود مقامی مسلمانوں میں اتنا
علم نہ تھا کہ سمجھ سکیں۔ اس لیے اکثر پیشہ ور مولویں اور پیروں کے شکار تھے۔ جو کچھ یہ کہتے تھے یہ
سیدھے سادے مسلمان مان لیا کرتے تھے۔ مولانا نے اس مسئلے پر متعدد خطبے رانچی کی مسجد میں
دیے۔ اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ کچھ لوگ مولانا کے مخالف ہو گئے۔ اور انہیں بھی وہابی اور غیر
مقلد کہنا شروع کر دیا۔ لیکن یہ فتنہ بھی جلد دب گیا۔ اس کے ساتھ ہی حنفی اور وہابی کا جھگڑا بھی۔
مولانا کا قیام مورابادی کے ایک بنگلے میں تھا۔ یہ بنگلہ کلکتہ کے ایک مسلمان تاجر کا تھا۔
حکومت نے جو وظیفہ ان کے لیے مقرر کیا تھا۔ وہ بالکل ناکافی تھا۔ وہ خود بڑی صاف ستھری زندگی
گزارنے کے عادی تھے۔ پھر مسلسل مطالعے کا شوق اور مطالعے کے لیے بہت زیادہ روپوں کی
ضرورت ہوتی تھی۔ نئی نئی کتابیں، اخبارات رسالے اور سب کے بعد مہمانی کا سلسلہ۔ مولانا سے
ملنے کے لیے سارے ملک سے لوگ آیا کرتے تھے۔ ان میں علماء ہوتے تھے۔ جن کی مدد مولانا
کو کرنا پڑتی تھی۔ اور مولانا کی آمدنی کے ذرائع محدود ہی نہیں بلکہ مفقود تھے۔ لیکن کسی نے ان کا
منہ میلا نہیں دیکھا۔ اور نہ کبھی انہوں نے مدد چاہی۔ بلکہ مولانا کے رانچی سے واپس جانے کے
بعد پتہ چلا کہ مدرسہ کی عمارت کی دوسری منزل انہوں نے اپنے روپوں سے بنوائی تھی۔ جو انہیں
پریس فروخت کر کے حاصل ہوئے تھے۔

یہ تو درست ہے کہ ان دنوں مولانا کو صرف رانچی ہی میں نہیں۔ بلکہ سارے ملک میں غیر
معمولی ہردل عزیزی ان کی نظر بندی کا سبب تھی۔ لیکن رانچی میں کچھ لوگ تھے جو برابر مولانا کے

خلاف فتنہ پردازیوں میں مشغول رہتے تھے۔ان میں اکثر وہ لوگ تھے جن کو سرکاری عنایات اور خطبات کی توقع تھی۔اور مولانا کے وعظوں اور تقریروں کی وجہ سے جن کی برتری کو ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا۔اس کا موقع نہیں کہ ان لوگوں کے نام لکھے جائیں ان باتوں سے بحث کی جائے۔لیکن یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے بعض پیشہ ور مولویوں کو روپے دے کر بلوایا۔اور مناظرے کی تیاریاں کیں۔یہ دوسری بات ہے کہ جو بھی آیا وہ مولانا سے چند باتیں کرنے کے بعد ان کے بنگلے سے سر جھکائے اور ان کے رنگ میں رنگا ہوا نکلا۔

مولانا آزاد کی رانچی کی زندگی کئی حیثیتوں سے بے حد اہم تھی۔اس لیے ضرورت یہ ہے کہ باضابطہ اس کی تحقیقات کی جائے۔اب بھی رانچی اور بہار میں ایسے افراد موجود ہیں جو مولانا سے اس دور میں بہت قریب تھے..... اور بعض دوسرے لوگ رانچی کے زندگی پر کافی روشنی ڈال سکتے ہیں۔"١٩

رانچی میں نظر بندی کے حوالے سے مولانا کے روز مرہ کی زندگی کے معمولات ، احوال وکوائف پر تفصیلی روشنی ڈالنے کی ایک طالب علمانہ کوشش کی گئی ہے۔میں اپنی باتوں کا اختتام مولانا امداد صابری کی اس تحریر پر کرتا ہوں:۔

> "رانچی میں حضرت مولانا آزاد کی زندگی کیا تھی ،صبح وشام کے معمولات کیا تھے،شب وروز کن مشاغل میں بسر ہوتے تھے۔قید ونظر بندی کی زندگی میں حضرت مولانا کے کس کیریکٹر کا اظہار ہوا،ان کے فکر وعمل نے کیا نتائج پیدا کئے۔ان کے پرتو صحبت سے وہاں کے زمین وآسمان میں کیا تبدیلیاں رونما ہوئی، علمی وتعلیمی زندگی میں کیا انقلاب آیا اور مسلمانوں کی زندگی میں کیا تغیر رونما ہوا،ان تمام سوالات کے جوابات حضرت مولانا کی تحریروں سے تو نہیں ملتے نہ ایسی کوئی روایت موجود ہے کہ مولانا آزاد نے اپنی خدمات کے بارے میں کسی سے کچھ کہا ہو لیکن چند ایسی شہادتیں موجود ہیں ،جن سے رانچی کے انقلاب

حالات پر روشنی پڑتی ہے۔رانچی میں حضرت مولانا آزاد کی چار سالہ نظر بندی اور اس کے ثمرات ونتائج تاریخ انقلاب ملت اسلامیہ کا تنا اہم موضوع اور حضرت آزاد کی زندگی کا ایسا عظیم الشان واقعہ ہے کہ اسے تاریخ کی روشنی میں لانا نہایت ضروری ہے۔[۲۰]

مولانا آزاد نے رانچی میں نظر بندی کے دوران علمی، دینی، قومی و ملی اعتبار سے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ اظہر من الشمس ہے۔علمی اعتبار سے" تذکرہ"،" ترجمان القرآن" اور" جامع الشواہد" کی تصنیف کی۔مولانا آزاد کا یہ قیمتی اثاثہ علمی اعتبار سے شاہکار بھی ہے اور رانچی کی نظر بندی کی یادگار بھی۔عملی اعتبار سے مولانا آزاد نے انجمن اسلامیہ کی بنیاد ڈالی اور مدرسہ اسلامیہ کا قیام بھی ان ہی کی مرہون منت ہے۔آئیے اب علیحدہ علیحدہ باب میں ان پر تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔

حواشی:۔

۱۔تذکرہ، مولانا ابوالکلام آزاد، مرتبہ مالک رام، صفحہ۔۳۳۲

۲۔مکاتیب، ابوالکلام۔ادبستان۔لاہور، ص۔۲۷

۳۔غبار خاطر، مولانا ابوالکلام آزاد، مرتبہ مالک رام۔ص۔۳۴۔۳۵

۴۔امام الہند مولانا آزاد۔امداد امام صابری، ص۔۱۲۹

۵۔خطبات۔مولانا ابوالکلام آزاد، ابوالکلام آزاد، ص۲۷۔۲۳

۶۔مکاتیب ابوالکلام آزاد، بار اول، ادبستان لاہور۔ص۱۰۱

۷۔تذکرہ مولانا ابوالکلام آزاد، مرتبہ مالک رام، ص۔۳۳۶

۸۔ترجمان القرآن، مولانا ابوالکلام آزاد، ص۱۹۔۲۰

۹۔امام الہند مولانا آزاد۔امام صابری۔ص۱۳۰۔۱۳۱

۱۰۔غبار خاطر، مولانا ابوالکلام آزاد، مرتبہ مالک رام۔۔ص۔۳۵۔۳۶
۱۱۔تذکرہ مولانا ابوالکلام آزاد، مرتبہ مالک رام۔ص۳۳۴
۱۲۔ایضاً۔ص۳۳۳۔۳۳۴
۱۳۔یضاً۔ص۔۳۳۶
۱۴۔یضاً۔ص۳۳۵
۱۵۔آئینہ ابوالکلام۔ص۔۲۷۲۔۲۷۳
۱۶۔ہفتہ وار پیغام، بابت ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء
۱۷۔امام الہند مولانا آزاد۔امداد صابری۔ص ۱۳۲۔۱۳۴
۱۸۔امام الہند مولانا آزاد) ماحول کراچی۔آزاد نمبر۔ستمبر ۱۹۶۰
۱۹۔ماحول، کراچی آزاد نمبر، ستمبر ۱۹۶۰
۲۰۔امام الہند مولانا آزاد۔ص۔۱۳۲

☆☆☆

''تــذکــرہ''

مولانا آزاد کی علمی دانشوری کی شاہکار تصنیف

''تذکرہ'':۔مولانا آزاد کے عہد جوانی کی یادگار شاہکار تصنیف ہے جو قیام رانچی کے دوران سپرد قلم کی گئی۔گرچہ یہ کتاب مولانا کے سوانحی واقعات اوران کے اسلاف کے کارناموں پر مشتمل ہے جن کو وہ اپنا ہیرو تسلیم کرتے تھے لیکن اس کا اصل موضوع دعوت و اصلاح اور عمل وعزیمت کا پیغام ہے،بقول پروفیسر محمد مجیب:۔

''تذکرہ اسلامی فکر کے موضوع پر ایک مقالہ کی حیثیت سے پڑھا جاسکتا ہے۔
اس کی حیثیت ایک کتاب سے بہت زیادہ ہے، وہ ایک اشاریہ ہے،ایک
شخصیت ہے، ایک شعلہ اور جوش ہے، ایک الہامی واعظ کی قوت نطق، ایک
بڑے دل کا گریہ وبقا،ایک المیہ کا محزوں نغمہ اور ایک فتح کا مسرت انگیز زمزمہ۔
وہ ایک ایسی خودنوشت سوانح عمری ہے جوایک تصور کا پیکر بن گئی ہے اور ایسا تصور
جوفطرت انسانی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔''[1]

یہ کتاب مولانا آزاد نے اپنے دوست مولوی فضل الدین مرزا کے اصرار پر لکھی۔ان کا تعلق مولانا آزاد سے الہلال کی اشاعت سے بہت پہلے سے ہی تھا ۔مولوی فضل الدین مرزا کون تھے؟ان کے سوانحی کوائف کا ذکر کرتے ہوئے مالک رام یوں رقم طراز ہیں:۔

'' الہلال اور اس کے بعد البلاغ کے مہتمم ایک صاحب فضل الدین احمد مرزا

تھے؛اور جب انہوں نے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی مدد سے پیغام جاری کیا تو اس کے منیجر بھی وہی مقرر ہوئے۔ وہ ضلع گورداسپور (پنجاب) کے ایک دیہات کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے جاپان میں انجنیری کی تعلیم پائی تھی۔ جب وہاں سے لوٹے تو کلکتہ چلے گئے، جہاں ان کے بھائی پہلے سے غالباً انجینئرنگ ہی کے محکمے میں ملازم تھے۔ یہ ۱۹۰۲ء کی بات ہے، جب مولانا آزاد ہنوز تعلیم سے بھی فارغ نہیں ہوئے تھے۔ دونوں کی ملاقات ہوئی اور رفتہ رفتہ اس نے دوستی کی شکل اختیار کر لی، جس میں زمانے کے ساتھ استواری آ گئی۔ جب مولانا آزاد رانچی میں نظر بند ہوئے، تو فضل الدین احمد مرزا نے بہ اصرار انہیں اپنی سرگزشت لکھنے پر رضامند کر لیا۔

مولانا نے جب لکھنا شروع کیا، تو ابتدا اپنے بزرگوں کے حالات سے کی مسودہ خاصا ضخیم ہو گیا۔ اِسے مناسب حدود میں رکھنے کی خاطر فضل الدین احمد مرزا نے کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلا حصہ یہی کتاب تذکرہ ہے۔ اس میں مولانا آزاد نے اپنے پردادا شاہ محمد افضل کے مادری سلسلے کے ایک بزرگ حضرت شیخ جمال الدین دہلوی کے حالات دیئے ہیں۔ یہ دراصل پوری کتاب کا پہلا باب ہے، جو سرتاسر صرف شیخ جمال الدین دہلوی کے حالات پر مشتمل ہے۔ دوسرے باب میں جو شائع نہ ہو سکا، شیخ جمال الدین کے بیٹے شیخ محمد کے حالات تھے۔ تیسرے باب میں ان کے پردادا شاہ محمد افضل کے اور والد مولانا خیر الدین کے نانا مولانا منور الدین کے سوانح حیات تھے۔ ان کے علاوہ موجودہ کتاب کے کئی حواشی بھی انہوں نے روک لئے تھے۔ یہ سارا مواد وہ دوسرے حصے میں شائع کرنے والے تھے۔ لیکن حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی کہ وہ مولانا کی رہائی سے پہلے ہی کلکتہ چھوڑ کر پنجاب چلے

آئے ۔۱۹۲۱ء میں وہ لدھیانہ میونسپل کمیٹی میں سکتر کے عہدے پر فائز تھے۔
جب ترک موالات کی تحریک نے زور پکڑا، تو وہ بھی ملازمت ترک کرکے اپنے
وطن چلے گئے ۔ جہاں غالباً ۱۹۲۲ء میں ان کا اچانک انتقال ہوگیا۔ مولانا آزاد
نے اپنی زندگی میں بقیہ مسودہ حاصل کرنے کی بہت کوشش کی تھی؛ خاص آدمی
تک مرزا صاحب مرحوم کے مکان پر بھیجا کہ ان کے لواحقین اور پسماندگان
سے اس کا کھوج نکالے، لیکن بے سود؛ یہ دستیاب نہ ہوا۔
مولانا آزاد کو اس کتاب کی تصنیف میں زیادہ دن نہیں لگے تھے۔ جیسا کہ خود
فضل الدین احمد مرزا صاحب نے لکھا ہے، یہ جون ۱۹۱۶ء سے ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۶
ءتک کے درمیانی پانچ مہینے میں قلمبند ہوئی ۔۔۔۔۔ چونکہ تذکرہ کی تصنیف کے
آغاز سے پہلے انہوں نے فضل الدین احمد مرزا سے وعدہ کرلیا تھا کہ اس
دوران میں جو کچھ بھی لکھا جائیگا، وہ انہیں کے سپرد ہوگا؛ اس لئے سیرۃ شیخ احمد
سرہندی بھی انہیں کے پاس بھیج دی گئی تھی؛ اور افسوس کا مقام ہے کہ تذکرہ
کے بقیہ مسودہ کی طرح یہ بھی ضائع ہوگئی۔"۲

مولوی فضل الدین مولانا کے عقیدت مند بھی تھے اور دوست بھی۔ الہلال کے اجراء نے مولانا آزاد کی شہرت کو بام ثریا تک پہنچادیا تھا۔ عوام وخواص میں یہ خواہش شدت سے انگڑائیاں لینے لگی تھیں کہ وہ مولانا کے حالات زندگی سے روشناس ہوسکیں۔ مولوی فضل الدین نے اسی مقصد اور ضرورت کے پیش نظر مولانا سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اپنی زندگی کے حالات قلمبند کردیں۔ مولانا فضل الدین کی اس تجویز کو ٹالتے رہے لیکن جب وہ مئی 1914 میں مولانا سے ملنے رانچی آئے تو ایک بار پھر اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ اپنے حالات زندگی قلمبند کرنے پر راضی ہوجائیں اس بار مولانا انکار نہ کرسکے۔ مولوی فضل الدین نے "تذکرہ" کے مقدمے میں اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ دیکھئے یہ تراشہ:۔

"خاکسار ان معدودے چند لوگوں میں سے ہے، جو ایڈیٹر "الہلال" سے "الہلال" کی اشاعت کے بعد نہیں، بلکہ پیشتر سے واقفیت رکھنے کا فخر رکھتے ہیں۔ میری ان سے پہلے پہل ملاقات ۱۹۰۲ء میں ہوئی جب وہ مشغول تعلیم تھے۔ کامل اٹھارہ برس اس واقعہ پر گذر گئے۔ زمانے کے حالات وحوادث نے مجھے ہندوستان کے مختلف گوشوں اور پھر ہندوستان سے باہر پہنچادیا۔ وہ کلکتہ سے بمبئی اور پھر حجاز و بغداد چلے گئے اور اس اثنا میں بڑی بڑی تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں۔ لیکن یہ علاقہ بدستور محکم رہا اور میں اس تمام عرصے میں ان کی زندگی کے تغیرات کا مطالعہ کرتا رہا۔ ۱۹۱۴ء میں جب "الہلال" کی شہرت کمال درجہ تک پہنچ چکی تھی اور ہر شخص اس عجیب وغریب شخصیت کے حالات معلوم کرنے کا خواہشمند تھا، جس نے یکا یک ظاہر ہوکر تمام قوم میں انقلاب عظیم پیدا کردیا، تو مجھے پہلی مرتبہ یہ خیال ہوا کہ اگر ان کی زندگی کے حالات قلم بند ہوجائیں، تو کئی اعتباروں سے نہ صرف بغایت دلچسپ بلکہ نہایت نتیجہ خیز ومفید ہونگے۔ چنانچہ میں نے یہ خیال ان پر ظاہر کیا اور عرض کیا کہ وہ خود اپنے ہی قلم سے اپنے حالات قلم بند کردیں۔ لیکن انہوں نے اول تو کئی بار اپنی عادت کے مطابق مذاق میں بات ٹال دی۔ پھر صاف صاف انکار کردیا اور کہا کہ کتنی بزرگ اور عظیم الشان زندگیاں ہمارے سامنے ہیں جن کے سوانح وحالات نہیں لکھے گئے۔ ان کو چھوڑ کر میری زندگی کے حالات مرتّب کرنا محض ایک تمسخر انگیز حرکت ہوگی۔

لیکن جس کام کو وہ "تمسخر انگیز" کہتے تھے (اس کو دلی محبت وارادت کا نتیجہ سمجھا جائے یا حقیقتِ حال کا) میں ہر طرح اس کو ایک نہایت ضروری کام سمجھتا تھا۔ اور چونکہ ایک عرصہ کی واقفیت کی وجہ سے حالات کا بڑا حصہ پیشِ نظر

تھا، اس لئے سمجھتا تھا کہ ان کی پچیس برس کی زندگی میں ایسے ایسے عظیم الشان
تغیرات موجود ہیں جو بڑی بڑی طویل زندگیوں میں بھی نہیں پیش آتے، اور اس
لئے ان کا مطالعہ ہزاروں انسانوں کے لئے رہنمائی و ہدایت کا ذریعہ ہوگا۔

گو انہوں نے انکار کر دیا، لیکن میں نے اپنا اصرار برابر جاری رکھا اور برابر
اس کے لئے خطوط لکھتا رہا۔ اپریل ۱۹۱۶ء میں جب گورنمنٹ بنگال نے بنگال
سے باہر چلے جانے کا آرڈر جاری کیا اور وہ رانچی چلے گئے، تو مئی میں میں ان
کی ملاقات کے لئے رانچی گیا۔ اس واقعہ نے جو اثر تمام ملک پر ڈالا تھا، اس کا
قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ اُن کے حالاتِ زندگی معلوم کرنے کا اشتیاق عام طور پر اور
زیادہ ہو گیا تھا۔ جن جن لوگوں سے اس کا ذکر آیا، سب نے بالاتفاق کہا کہ کسی
نہ کسی طرح ان کے حالاتِ زندگی خود انہی سے لکھوانے چاہئیں۔ چنانچہ اس
مرتبہ میں نے سخت کوششوں کے بعد اُن سے وعدہ لے ہی لیا، اور ساتھ ہی یہ
شرط بھی کر لی کہ جس قدر وہ لکھتے جائیں، بلا انتظارِ تکمیل مجھ کو بھیجتے رہیں، اور
کوئی ہفتہ اس سے خالی نہ جائے۔ البتہ اُن کو اصرار تھا کہ بلا اُن کے علم کے
کتاب شائع نہ کی جائے۔ اس کے ماننے میں مجھے کوئی تامل نہ ہوا۔

اس کے بعد میں رائے پور چلا گیا اور دو ہفتہ کے بعد سولہ صفحے
انہوں نے لکھ کر بھیج دیئے۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ سب سے پہلے
اپنے خاندانی حالات قلمبند کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر مجھے مزید مسرت ہوئی کہ
ضمناً ایک مستقل کتاب بزرگانِ سلف کے حالات میں ان کے قلم سے مرتب
ہو جائے گی۔ لیکن جوں جوں سلسلہ آگے بڑھتا گیا، نئی نئی بحثیں نکلتی آئیں، اور
ہر مبحث کو وہ اپنی عادت کے مطابق تفصیل سے لکھنے لگے۔ اس پر مجھے خوف
ہوا کہ کہیں اس ضمن میں اصلی مقصد نہ رہ جائے۔ چنانچہ میں نے بار بار اختصار

کے لئے اصرار کیا۔لیکن انہوں نے لکھا کہ میری طبیعت میں رکاوٹ پیدا نہ کرو۔جو کچھ بےاختیار قلم سے نکل جاتا ہے۔بھیج دیتا ہوں،جمع کرتے جاؤ۔ہرحال میں فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

جون ۱۹۱٦ء سے ۱۷ اکتوبر ۱۹۱٦ء تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔درمیان میں کبھی کبھی رک جاتا اور پھر مجھے دو چار خط لکھنے پڑتے جس قدر صفحات وہ لکھتے،بھیج دیتے۔مطالب میں کسی طرح کی قرارداد تقسیم وترتیب نہ تھی اور ہو بھی نہیں سکتی تھی۔کیونکہ نہ تو ایک سلسلے میں لکھی گئی،نہ مسودہ ان کے سامنے تھا۔جہاں کہیں کوئی نیا مطلب شروع ہوجاتا تھا،"فصل" کا لفظ لکھ دیتے تھے!اس کے ساتھ نمبروشمار کی کوئی ترتیب نہ تھی۔

مگر مجھ کو اصلی کاوش خود ان کے حالات کی تھی۔خاندانی حالات کے مسودہ کو دیکھا تو متوسط سائز کے کاغذ پر اصل مسودہ پانچسو صفحوں سے زیادہ ہو چکا تھا۔اور یہ بھی اس وجہ کہ بار بار اختصار پر زور دیتا رہتا تھا۔ورنہ نہیں معلوم ،ان کے دماغ کی آمد کہاں کہاں انہیں لے جاتی اور کتاب ختم بھی ہوتی یا نہیں!جب انہوں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے حالات بھی ختم کردیئے،تو اب میں منتظر ہوا کہ حسب وعدہ اپنے حالات لکھنا شروع کرینگے۔لیکن اس کے بعد بالکل خاموشی رہی۔اور کچھ عرصہ کے بعد پھر وہی عذرات کئے گئے،جو پہلے بارہا ہو چکے تھے۔جب میں نے پھر لگاتار اصرار شروع کردیا،تو بیس صفحوں میں ایک فصل لکھ کر بھیج دی اور لکھا کہ"اس سے زیادہ میں اپنا حال نہیں لکھ سکتا"۔یہ فصل اسی حصہ کے آخر میں درج کردی گئی ہے۔اس کو دیکھا تو اس میں کوئی بات ایسی نہ تھی،جس پر حالات کا اطلاق ہو سکے۔البتہ اپنے مخصوص طرز میں کچھ اشارات کئے ہیں،اور پھر شاعرانہ

پیرایہ میں بات ٹال دی ہے۔اصل میں ان کو میری درخواست منظور کرنی ہی نہ تھی۔سخت اصرار دیکھ کر چاہا کہ اپنے خاندانی حالات پر اس بہانے ایک کتاب لکھ دیں۔اور جب خود اپنے ذاتی حالات کا موقعہ آئے،تو کسی نہ کسی طرح ٹال دیں۔میں نہیں سمجھتا کہ اس میں مصلحت کیا ہے!یقیناً ان کا فیصلہ میرے فیصلے پر ترجیح پانے کا مستحق ہے۔مگر یہ ضرور ہے کہ اتنے انتظار و امید کے بعد یہ مایوسی میرے لئے بہت ہی رنج دہ تھی؛اور ایسی تھی کہ اگر میری جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا،تو یقیناً اس کام سے بالکل دست بردار ہو جاتا۔

اب اِس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میں خود ان کے حالات قلم بند کروں۔اسی اثنا میں یکا یک وہ نظر بند کردیے گئے۔اس کی وجہ سے خط وکتابت کی سہولت و آزادی بھی جاتی رہی۔ بالآخر فروری ۱۹۱۷ء میں ایک طویل مہلت اپنے کاموں سے نکال کر رانچی گیا،اور متصل چھ ماہ تک ان کی خدمت میں مقیم رہا میں نے اُن کے حالاتِ زندگی کے متعلق ۱۵ سوال لکھ لئے تھے۔سخت سعی واصرار سے ان کے جوابات لکھوائے۔یہ مجھے معلوم تھا کہ جہاں ایک مرتبہ اس موضوع پر اُن کا قلم اٹھ گیا،پھر کسی تحریک کی ضرورت باقی نہ رہیگی اور ان کے جوشِ فکر کا سیلاب کسی کے روکے بھی نہیں رُک سکیگا۔چنانچہ ایسا ہی ہوا اور گو نہایت بے توجہی اور بے مزگی کے ساتھ وہ سوالات کے جوابات لکھنے پر مستعد ہوئے،لیکن پھر بھی اُن ۱۵ سوالوں کی تحریک نے ان کے خیالات کو جنبش دے دی۔اور حالات کا ایک معتد بہ حصّہ ان کے قلم سے بے اختیار نکل گیا۔سوالات کے جوابات لے کر میں رائے پور واپس آیا جہاں تک ممکن تھا،جابجا خود ان تحریر کو بجنسہٖ درج کرنے کی کوشش کی۔بہت سے حالات میرے ذہن میں محفوظ تھے۔ان سے بھی مدد ملی؛اور اس طرح ایک

کتاب مرتب ہوگئی۔ اس کا تو مجھے ابتدا سے اعتراف رہا ہے کہ اُن کے حالات لکھنے کے لئے جیسے دماغ وقلم کی ضرورت ہے، وہ مجھے کہاں میسر! اور اسی لئے میری ابتدا سے خواہش تھی کہ وہ خود ہی اول سے آخر تک لکھیں۔ اگر ایسا ہوتا، تو اس میں شک نہیں کہ اُردو لٹریچر میں ایک یادگار چیز ہوتی۔ لیکن بہر حال، نہ ہونے سے ایک مفید کام کا ہوجانا بہتر ہے۔ ہزاروں انسانوں کی طرح میرا بھی یقین ہے کہ مولانا نے اپنی اس قلیل عمر میں جس قدر علمی وعملی خدمات انجام دی ہیں، فی الحقیقت یہ اُن کے آنے والے کارناموں کی محض ایک ابتدائی قسط ہے۔ اللہ تعالی ابھی عرصہ تک ان کے وجود کو قوم میں قائم رکھے گا اور نہیں معلوم، کیسی کیسی عظیم الشان خدمتیں اُن کے ہاتھوں انجام پائیں گی! پس وہ وقت قریب ہے، جب بڑے بڑے لوگ اُن کے حالاتِ زندگی کی ترتیب پر مستعد ہونگے، اور ایسے ہاتھوں سے یہ کام انجام پائیگا، جو ہر طرح اس کے اہل ہونگے۔ عجب نہیں کہ میری یہ پہلی اور ناچیز کوشش اُس وقت اُن بزرگوں کے کچھ کام آجائے، اور اس طرح میری کئی ماہ کی محنت ضائع نہ جائے۔

چند الفاظ اس کتاب کی اشاعت کی نسبت بھی کہنا ضروری ہیں۔

جس وقت مولانا نے اس کی تصنیف کا وعدہ کیا، تو ساتھ ہی شرط بھی کرالی تھی کہ بلا اُن کی اجازت کے شائع نہ کیا جائے۔ اُن کا قصد یہ تھا کہ آئندہ کسی فرصت کے موقع پر نظر ثانی کرینگے، اور اس کے بعد کتاب شائع ہوگی۔ میں نے سال بھر تک اس موقع کا انتظار کیا۔ جب اوائل ۱۹۱۷ء میں رانچی گیا، تو بہت کوشش کی کہ کسی طرح میری موجودگی میں نظر ثانی ہوجائے۔ لیکن افسوس ہے کہ اُنہوں نے برابر تساہل وہ اغماض سے کام لیا۔ بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ "محض تمہارے اصرار سے مجبور ہوکر یہ دفتر لکھ دیا تھا۔ یہ مقصود ہی کب تھا کہ

کتاب کی شکل میں شائع کیا جائیگا۔" وہ مُصِر تھے کہ مسودہ اُن کے حوالے کر دیا جائے ،فرصت کے وقت درست کر دینگے۔لیکن چونکہ خوش قسمتی سے میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو ان کی اصطلاح "بوقت فرصت" کے معانی سے اچھی طرح واقف ہیں، اس لئے میں اس کی تعمیل نہ کر سکا۔ اگر کرتا، تو اس کے معنی صرف یہ تھے کہ برسوں تک کے لئے یہ کتاب بھی اسی ذخیرۂ نسیاں کے سپرد ہوجاتی ،جس کا ایک پورا صندوق" وقت فرصت" کے انتظار میں ہمیشہ اُن کے ہمراہ رہا کرتا ہے!

اس میں شک نہیں کہ جن اہم تصنیفات کی تکمیل میں وہ آج کل شب و روز مشغول رہتے ہیں، مثلاً تفسیر القرآن ، اُن کے مقابلہ میں یہ کتاب چنداں اہمیت نہیں رکھتی۔ تاہم اگر وہ چاہتے ،تو یقیناً وقت نکال سکتے تھے اور چند دنوں کے اندر ہی پوری کتاب پر نظرِ ثانی ہو جا سکتی تھی۔ جو شخص بلا کسی سامان و مواد کے ،محض قلم دوات لے کر ایک شب و روز میں پورا ایک ایک رسالہ لکھ دے، اس کے لئے ایک لکھی ہوئی چیز پر نظر ثانی کر دینا کیا مشکل تھا؟ مگر افسوس ہے کہ وہ ہر کام کو اپنے معیارِ نظر سے جانچتے ہیں؛ دوسروں کی خواہشوں کی اس بارے میں کچھ پروا نہیں کرتے ۔ یہ پوری کتاب محض بطور تفریحِ دماغ کے انہوں نے قلم برداشتہ لکھ دی۔ اپنے خیال میں اِس کو محض ایک بے حقیقت چیز سمجھتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی نظرِ ثانی و اشاعت کے معاملے میں ان کو کوئی دلچسپی نہ ہوئی ۔لیکن کاش اُن کو معلوم ہوتا کہ اُن کا معیارِ نظر جس قدر بلند ہے، ہمارا نہیں ہے۔ اُن کی قلم برداشتہ تحریریں ایک طرف ، اور اوروں کی برسوں کی محنت و جان کا ہی ایک طرف ۔اسی کتاب کو دیکھ لیا جائے کہ کس بے سروسامانی و بے توجہی کے ساتھ قلم برداشتہ لکھی گئی ہے۔ جس قدر اوراق لکھتے جاتے تھے،

میرے پاس بھیج دیتے تھے، اور آئندہ ربطِ تحریر کے لئے صرف آخری صفحے کی آخری سطر یا بعض حالات میں صرف چند الفاظ ایک سادہ صفحے کی پیشانی پر باقی رہتے تھے۔ درمیان میں ہفتوں دوسری تصنیفات جاری رہتیں۔ پھر جب کبھی کسی وجہ سے دماغ آرام لینا چاہتا اور تفسیر وغیرہ کا سلسلہ رکتا، تو دو چار گھنٹے کے لئے اس طرف متوجہ ہو جاتے۔ ہمارے بڑے بڑے مصنف شاید اس طرح ایک خط بھی نہ لکھ سکیں، چہ جائیکہ ایک پوری مرتب کتاب، چھ سات سو صفحوں سے زیادہ؛

جب نظرِ ثانی کی طرف سے مایوس ہو گیا تو ارادہ کر لیا کہ خواہ وہ خوش ہوں یا ناراض، مگر بلا ان کے علم کے مسودے کو اصلی حالت ہی پر شائع کر دینا چاہئے۔ ساتھ ہی یہ خیال بھی ہوا کہ نظر ثانی کا انتظار بھی دراصل اشاعت روکنے کا ایک حیلہ ہے، ورنہ آج تک کسی تحریر پر مصنفوں کے طریقہ کے مطابق ان کو نظرِ ثانی کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ "الہلال" و "البلاغ" میں کیسے کیسے معرکۃ الآرا مضامین ہمیشہ نکلتے رہے! لیکن میں خود دیکھا ہے کہ ہمیشہ محض قلم برداشتہ لکھے جاتے تھے؛ ساتھ ہی ساتھ کمپوزیٹر کمپوز بھی کرتے جاتے تھے۔ ایک صفحہ پورا ہوا اور کمپوز کے لئے گیا۔ البتہ ایک پروف وہ خود دیکھتے تھے، اور اس میں کچھ تبدیلیاں ضرور کر دیتے تھے۔ مگر ظاہر ہے کہ پروف میں کوئی ایسی بڑی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ زیادہ سے زیادہ بعض الفاظ بدلے جا سکتے ہیں۔

بہر حال میں نے کتاب کو خود اپنی نگرانی میں چھپوانا شروع کر دیا۔ کتاب کے ۲۰۴ صفحے چھپ چکے تھے اور مولانا کو اس کی طباعت کا بالکل علم نہ تھا۔ جب جنوری ۱۹۱۹ء میں میں نے اخبارات میں ایک ابتدائی اطلاع

اس کی نسبت شائع کی، تو اُن کو معلوم ہوا؛ اور جیسی توقع پیشتر سے تھی، سخت اصرار کر کے انہوں نے چھپائی کا سلسلہ موقوف کرا دیا اور لکھا کہ کتاب ہرگز ہرگز شائع نہ کی جائے۔ تاہم اب مجھے پورا اطمینان تھا کہ جب کام یہاں تک پہنچ چکا ہے، تو کسی نہ کسی طرح اُن کو اجازت دینی ہی پڑے گی۔ پانچ ماہ اس میں نکل گئے۔ بالآخر میں رانچی گیا اور مجبوراً اُن کو اشاعت پر راضی ہونا ہی پڑا۔ میں اُن صدہا شائقین سے جنہوں نے ابتدائی اعلان دیکھتے ہی درخواست بھیج دی تھی، اس تاخیر کے لئے خواستگار معافی ہوں، اور یقین دلاتا ہوں کہ اس بارے میں میری مجبوریاں بڑی ہی سخت تھیں۔

اصل مسودے میں میں نے کسی طرح تبدیلی نہیں کی۔ البتہ مجبوراً کتاب کی ضخامت کو معتدل کرنے کے لئے بعض مقامات سے بعض ٹکڑے نکال دینے پڑے۔ مولانا کے جوشِ فکر کا یہ حال ہے کہ جس جانب قلم کی باگ مڑ گئی، پھر اُس کا رکنا مشکل ہے۔ علاوہ بریں کتاب اس طرح لکھی گئی کہ مسودہ خود ان کے پیش نظر بھی نہ تھا۔ دس بارہ صفحے لکھے اور میرے پاس بھیج دیئے۔ اُن کو خود اندازہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ کونسا مضمون کتنے صفحوں تک پہنچ چکا ہے۔ جا بجا فٹ نوٹس شروع کر دیتے تھے اور وہ بیس بیس پچیس پچیس صفحوں تک چلے جاتے تھے۔ مجبوراً میں نے چار مقام سے تین فصلیں اور چار بڑے بڑے فٹ نوٹس نکال دیئے، اور دو فٹ نوٹ اصل کتاب کے آخر میں مستقل فصل کے عنوان سے شامل کر دیئے۔ اسی طرح بعض نوٹ اصل کتاب میں ملا دیے گئے۔ ناظرین یقین کریں کہ ان کے دلوں میں مولانا کے قلم سے نکلی ہوئی تحریر کی جس قدر وقعت و عزت ہوگی، اس سے وہ چند میرے دل میں ہے، اور میں ہرگز ایسا نہ کرتا، اگر سامانِ طبع کی بے حد گرانی نے مجھے اختصار پر سخت مجبور نہ

کردیا ہوتا۔ یہ جس قدر فصلیں اور حواشی نکالے گئے، سب محفوظ ہیں، اور بجائے خود مستقل مضمون کا حکم رکھتے ہیں۔ انشاء اللہ اُن کو بھی کسی نہ کسی عنوان سے عنقریب شائع کردونگا یا بشرط گنجائش دوسری جلد کے آخر میں بطور ضمیمے کے درج کردینے کی کوشش کرونگا۔ جب کتاب پریس میں دی گئی، تو ارادہ تھا کہ ایک ہی جلد میں شائع کی جائیگی لیکن کپوز شروع ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ میرا اندازہ ضخامت کے بارے میں غلط تھا۔ اگر ایک ہی جلد میں کتاب شائع کی جائیگی، تو عجب نہیں، سات آٹھ سو صفحوں تک ضخامت پہنچ جائے۔ مجبوراً کتاب کو دو جلدوں میں تقسیم کردیا گیا۔ یہ پہلی جلد ہے۔ دوسری جلد کے پہلے حصے میں مولانا کے خاندانی حالات کا بقیہ حصہ ہے؛ دوسرے حصے میں خود مولانا کی سوانح عمری ہے، جو خاکسار نے ترتیب دی ہے اور اُس کا بھی اکثر حصہ سوالات کے جواب میں خود ان کا لکھا ہوا ہے۔'' ۳

مولوی فضل الدین کا ''مقدمہ'' کے اختتام پر جو دستخط ہے وہاں کلکتہ 16 اگست 1919ء درج ہے۔ کتاب کا اختتام مولانا آزاد کی اس تحریر پر ہوا ہے جس میں انہوں نے مولوی فضل الدین مرزا کے تئیں کھلے دل سے اظہار تشکر پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی اس تاسف کا بھی اظہار کیا ہے کہ مذکورہ تصنیف کے سلسلے میں جن کتابوں کی ضرورت تھی ہمراہ نہ تھی سوائے اپنے قلمی مسودات اور ایک نسخۂ مصحف کے۔ جب ''تذکرہ'' لکھنا شروع کیا تو بعض حالات کے لئے صرف تذکرۃ الواصلین''، ''اخبار الاخیار'' اور ''طبقات اکبری'' منگوائی اور بعد کو منتخب التواریخ'' بھی آ گئی اس کے علاوہ کوئی کتاب پیش نظر نہ رہی ہے۔ جو کچھ لکھا ہے، صرف اپنے حافظے کے اعتماد پر لکھا ہے۔ دیکھئے یہ تراشہ:۔

''یہ اوراق پریشاں کہ دوست عزیز مسٹر فضل الدین احمد کے بے حد اصرار سے قلم بند ہوئے، اپنی پریشانی طبع و برہمی خاطر کی یادگار ہیں۔ اگر وہ کئی بار قصد کیا

مگر جمعیتِ خاطر کا وقت اِن کے لئے بہم نہ ہو سکا۔ ابتدا سے اب تک یہ حالت
رہی ہے کہ جب کبھی اپنے ضروری اشغال سے کچھ وقت بچا، چند اجزا لکھ
ڈالے اور عزیزِ موصوف کو بھیج دیئے۔ نہ پورا سلسلہ سامنے رہا، نہ ربط و ترتیب
اور تقسیم و تبویب کی مہلت ملی کہ شیوۂ اصحاب تصنیف و تدوین ہے۔ تمام
کتابیں کلکتے میں پڑی ہیں۔ بجز اپنے قلمی مسودات اور ایک نسخۂ مصحف کے اور
کوئی کتاب ہمراہ نہیں۔ جب یہ تذکرہ لکھنا شروع کیا، تو بعض حالات کے
لئے صرف "تذکرۃ الواصلین"، "اخبار الاخیار"، اور طبقاتِ اکبری" منگوالی،
اور بعد کو "منتخب التواریخ" بھی آ گئی۔ ان کے سوا کوئی کتاب پیشِ نظر نہیں رہی
ہے۔ جو کچھ لکھا ہے، صرف اپنے حافظے کے اعتماد پر لکھا ہے۔ حالانکہ سچ یہ ہے
کہ شائستۂ اعتماد نہ تھا۔ جا بجا ضمنی مباحث فقہ و حدیث اور تاریخ و سنین کے
آ گئے ہیں، جن کی تنقیح بغیر رجوعِ کتب مشکل تھی۔ علی الخصوص احادیث کی
تخریجات و اسناد کہ اس میں سب سے زیادہ احتیاط مطلوب و لازم ہے۔ لیکن
افسوس کہ کتابیں موجود نہیں، اور نہ اس کی مہلت کہ اب ایک ایک حوالے کی تصحیح
اور ایک ایک حدیث کی تخریج کے لئے کتابوں کے منگوانے کا سروسامان
کروں۔ پس جو کچھ حافظے نے کمزوری دکھلائی، تو وہاں اس کا اشارہ کر دیا گیا
ہے۔ اور شاید ایک دو جگہ تخریج کی جگہ خالی بھی چھوڑ دینی پڑی۔ بایں ہمہ اللہ
تعالیٰ کے لطف و کرم سے اس قدر توقع ضرور ہے کہ جہاں جہاں سند و تخریج
درج کر دی ہے، شاید تحقیق سے غلط نہ نکلے گی۔ آیاتِ قرآنیہ کے اندراج میں
اب تک یہ عادت رہی ہے کہ ہنگامِ تحریر جو آیات یاد آ جاتی ہیں، درج کر دیتا
ہوں، اور پھر پروف کی تصحیح میں مراجعت کے بعد سورہ و آیات کے نمبر بھی درج
کر دیے جاتے ہیں۔ لیکن فلوگل والا نسخہ، جس میں نمبر ہیں، ساتھ نہیں، اور نہ

طبیعت مزید صرفِ وقت پر مائل۔ اس لئے محض حافظے کی بنا پر سورتوں کا حوالہ دے دیا ہے۔ امید ہے کہ اکثر حالتوں میں صحیح ہوگا سردست محض ایک عزیز کی خواہش کی تعمیل پیش نظر ہے، انطباع واشاعت مقصود نہیں۔ زمانے نے اگر مہلت دی تو نظر ثانی کے وقت مزید تصحیح وتہذیب ہو جائے گی۔''[۴]

پروفیسر ملک زادہ منظور کا اعتراض:۔

مذکورہ بالا تحریر کو پروفیسر ملک زادہ منظور نے مبالغہ آمیز بیان سے موسوم کیا ہے۔ وہ اپنے تحقیقی مقالہ ''مولانا آزاد فکر وفن'' میں لکھتے ہیں:۔

''اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ مولانا کی قوت حافظہ غیر معمولی طور پر زبردست تھی لیکن تذکرہ کا پہلا مطالعہ، اس کے داخلی شواہد اور خارجی حالت اس بات کے متقاضی ہیں کہ مولانا کے بیان کو مبالغہ آمیز کہا جائے یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ رانچی کے دوران قیام میں تذکرہ کے علاوہ مولانا مقدمہ تفسیر، تفسیر البیان اور ترجمان القرآن پر بھی وقت صرف کر رہے تھے۔ یہی نہیں بلکہ ''قیام رانچی کے ابتدائی زمانے میں دو رسالے نئے لکھنا شروع کئے تھے۔ ایک وحدت قوانین کائنات پر، دوسرا انتخاب طبیعی اور معنویہ کائنات پر''[۵]

ملک زادہ منظور اتنا ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اپنی باتوں کی تائید میں ۱۶ نومبر ۱۹۳۰ کی ایک تحریر کا بھی حوالہ دیتے ہیں جو مولانا آزاد نے ڈسٹرکٹ جیل میرٹھ میں لکھے۔ اس کے علاوہ مولانا سید سلیمان ندوی کے ایک مضمون کا ایک اقتباس بھی پیش کرتے ہیں جو ''یوسف ثانی'' کے عنوان کے تحت رسالہ ''ماحول'' کراچی کے آزاد نمبر بابت ۱۹۶۰ میں شائع ہوا۔ آگے چل کر مولانا آزاد کے ۳ خطوط کا تراشہ بھی پیش کرتے ہیں جو بالترتیب سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد کو رانچی سے لکھے گئے ہیں اور پھر اپنی باتوں کی تائید میں یہ فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ تذکرہ کی تصنیف کے دوران مولانا کے پاس کچھ اور کتابیں بھی موجود تھیں۔ دیکھئے یہ تحریر:۔

''کہا جا سکتا ہے اور حقیقت بھی ہے کہ یہ خطوط تذکرہ کے بعد کے ہیں لیکن ان میں اقتباسات سے مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ رانچی کے دورانِ قیام میں مولانا کے پاس کتب ورسائل کی آمد ورفت ہوتی رہی اور وہ باہر کی علمی دنیا سے رابطہ قائم رکھتے رہے۔ تذکرہ کے طویل حواشی اور خود اس کے موضوعات مولانا کے بیان کو مبالغہ آمیز سمجھنے پر مجبور کرتے ہیں۔''[۲]

مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ ملک زادہ منظور نے مولانا کے بیان کو مبالغہ آمیز کہہ کر منفی تاثر دینے کی ناکام کوشش کی ہے۔ مولانا خودنوشت لکھ رہے تھے کسی مشاعرے کی روئداد نہیں۔ مولانا کے ''تذکرہ'' میں خودنوشت کا استناد بھی ہے، آپ بیتی کے تجربات ومشاہدات بھی۔ ذاتی سرگذشت اور احوال وکوائف بھی ہیں اور اسلاف کے کارناموں کا بکھان بھی۔ ساتھ ہی تاریخ کے مدّ وجزر سے ابھرنے والے ذہنی فسادات پر بھی ان کی نظر تھی۔ علمائے حق اور علمائے سو کی اصطلاح اور ان کے مابین امتیاز کی بھی شناخت امتِ مسلمہ کو کرانا مقصود تھا۔ اپنے مورث اعلی حضرت مولانا جمال الدین معروف بہ شیخ بہلول دہلوی کو سرعنوان بنا کر انہوں نے کئی عظیم اسلامی شخصیتوں کے حالات زندگی اور ان کے کارناموں پر بھی روشنی ڈالی ہے جن میں احمد بن حنبل، ابن تیمیہ، شیخ داؤد، شیخ نیازی، مالک بن انس، شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ جیسے اکابر کے نام شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ مطلوب تھا۔ اسی احساس کو انہوں نے اپنی تصنیف کے اختتام پر اجاگر کیا ہے۔ لہٰذا پروفیسر ملک زادہ منظور کا مذکورہ اعتراض

''تذکرہ کا پہلا مطالعہ اس کے داخلی شواہد اور خارجی حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ مولانا کے بیان کو مبالغہ آمیز کہا جائے''

بے معنی ہے اور ان کی منفی ذہنیت کا غماز بھی۔

''تذکرہ'' کی اشاعت :۔ ابھی مولانا ابوالکلام آزاد رانچی میں ہی مقیم تھے کہ مولوی فضل الدین نے ستمبر ۱۹۱۹ء میں ''تذکرہ'' کا پہلا ایڈیشن البلاغ پرنٹنگ ہاؤس کلکتہ سے شائع کردیا۔ یہ

کتاب ٹائپ حروف میں چھپی اور ۳۱۷ صفحات پر مشتمل تھی۔ سرورق پر **لا تھنو ولا تحزنو وانتم الاعلون ان کنتم مومنین ھذہٖ تذکرہ** چھپا ہوا تھا۔ آخری صفحہ پر دنیا کا نقشہ آل رائٹس ریزروانگریزی میں لکھا ہوا تھا۔ مقدمہ میں جلد دوم کی اشاعت کی بھی خبر دی گئی تھی دیکھئے یہ تراشہ:۔

''جب کتاب پریس میں دی گئی، تو ارادہ تھا کہ ایک ہی جلد میں شائع کی جائیگی لیکن کمپوز شروع ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ میرا اندازہ ضخامت کے بارے میں غلط تھا۔ اگر ایک ہی جلد میں کتاب شائع کی جائیگی، تو عجب نہیں، سات آٹھ سو صفحوں تک ضخامت پہنچ جائے۔ مجبوراً کتاب کو دو جلدوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہ پہلی جلد ہے۔ دوسری جلد کے پہلے حصے میں مولانا کے خاندانی حالات کا بقیہ حصہ ہے؛ دوسرے حصے میں خود مولانا کی سوانح عمری ہے، جو خاکسار نے ترتیب دی ہے اور اُس کا بھی اکثر حصّہ سوالات کے جواب میں خود ان کا لکھا ہوا ہے۔''[۲۶]

تصویر نہ چھپوانے کی ممانعت:۔ مولوی فضل الدین نے مقدمہ کے آخر میں ''مولانا کا فوٹو'' ذیلی عنوان کے تحت اس کا بھی انکشاف کیا ہے کہ مولانا آزاد تصویر کھینچوانے اور شائع کرانے کو شرعی اعتبار سے غلط سمجھتے تھے۔ مذکورہ عنوان کے تحت مولوی فضل الدین لکھتے ہیں۔

''.....موجودہ زمانے میں کسی شخص کی سوانح عمری کا بغیر فوٹو کے شائع کرنا ایک ایسی بے قاعدگی ہے جس کو کوئی خوش مذاق آدمی گوارا نہیں کر سکتا۔ علاوہ بریں مولانا کے ہزاروں ارادت مند ہیں۔ جن کو بڑی مایوسی ہوتی اگر کتاب ان کے فوٹو سے خالی ہوتی اس لئے میں نے کوشش کی کہ مولانا کا سب سے آخری فوٹو حاصل کر کے درج تذکرہ کروں .....لیکن اس کا تو کبھی خیال بھی نہ ہوا تھا کہ مولانا تصویر کھینچوانے اور رکھنے کو شرعاً ناجائز سمجھتے ہونگے۔ خود''

الہلال'' انہوں نے باتصویر نکالا، اور ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی تصویر بھی کھنچوائی ؛لیکن جب میں نے تصویر کی نسبت کہا تو انہوں نے لکھا کہ'' تصویر کا کھینچوانا، رکھنا، شائع کرنا، سب ناجائز ہے۔ یہ میری سخت غلطی تھی کہ تصویر کھنچوائی تھی اور'' الہلال'' کو باتصویر نکالا تھا۔ میں اب اس غلطی سے تائب ہو چکا ہوں۔ میری پچھلی لغزشوں کو چھپانا چاہئے، نہ کہ ازسرِ نو اُن کی تشہیر کرنی چاہئے۔

بہرحال مولانا کے اس حکم کی میں تعمیل نہ کر سکا اور کتاب کے ساتھ ان کا سب سے آخری فوٹو شائع کر دیا ہوں۔ یہ فوٹو رانچی میں لیا گیا ہے اور مولانا کی بریت کے لئے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ کم سے کم اس کے کھینچوانے میں خود مولانا کے ارادے کو کوئی دخل نہ تھا۔''۸

کتاب کی اشاعت کے بعد مولانا کے ''اعتذار'' کی شمولیت:۔

مولوی فضل الدین نے ستمبر 1919 میں'' تذکرہ'' کو شائع کر کے منظر عام پر لانے کی سعی مستحسن کی۔ چونکہ ایک خاص حلقہ کو اس کی اشاعت کا سخت انتظار تھا لہذا لوگوں کے پاس بھیج دی گئی۔ ستمبر 1919 میں ہی اردو کے بلند پایہ انشاء پرداز مہدی افادی کو بھی'' تذکرہ'' کی ایک کاپی تحفتاً ارسال کی گئی۔ اس کی خبر مہدی افادی نے اپنی بیگم کو ایک خط میں دیا ہے جو ۲۹ ستمبر ۱۹۱۹ کو ڈیرا سے لکھا گیا ہے۔ دیکھئے خط کا تراشہ:۔

'' کل مولانا ابوالکلام آزاد کے'' تذکرہ'' کی پہلی جلد تحفتاً آئی ••••• کتاب کا تحفتاً آنا خود ایک عزت کی بات ہے••• بڑی عزت یہ تھی کہ مصنف نے شائع کرنے والے کو ہدایت کی تھی کہ پہلی جلد کے بعد جو مصنف کا حق ہے، دوسری رجسٹری مہدی حسن کو بھیجی جائے۔،،۹

کتاب کے شروع میں مولانا کا'' اعتذار'' شامل کیا گیا ہے جس کے اختتام پر **احمد رانچی یکم اکتوبر** درج ہے۔ ظاہر ہے یہ حصہ کتاب کی اشاعت کے بعد شامل کیا گیا ہے۔ مولانا کو اس کا

احساس اور زبردست احساس تھا کہ کتاب نظرِ ثانی کی محتاج تھی جو نہ ہو سکی۔ لہذا ''اعتذار'' کی ابتدا میں ہی وہ اعتراف کرتے ہیں:۔

''یہ اجزاء جس وقت لکھے گئے، اُس وقت وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس قدر جلد اور اہم تالیفات سے پہلے شائع ہو جائیں گے۔ متعدد حصے نظرِ ثانی کے محتاج تھے۔ ضمنی مطالب میں بھی بہت طول ہو گیا، نہیں معلوم، نظرِ ثانی کے بعد کتاب کی صورت کیا ہوتی! لیکن مرزا فضل الدین احمد صاحب نے بلا میرے علم و مشورہ کے اصل مسودہ چھاپنا شروع کر دیا۔ مجھے جب اطلاع ملی تو دو ثلث سے زیادہ حصہ چھپ چکا تھا۔ مرزا صاحب کی تعجیل ان کے شوق و ذوقِ محبت کا نتیجہ ہے، ان کا شکر گزار ہوں۔ کتاب کے نقائص میرے نقصِ کار و ضعفِ قلم کا نتیجہ ہیں، اس لئے شرمسار و معافی خواہ ہوں چونکہ کتاب کا بڑا حصہ چھپ چکا تھا، اس لئے بقیہ اجزا کی نظرِ ثانی و تہذیب پر طبیعت مائل نہ ہوئی۔ لوگوں نے اپنی دل جمعی و فراغِ خاطر کی یادگاریں چھوڑی ہیں، اپنی پریشان خاطری اور پراگندگیِ طبع کی بھی ایک یادگار رہے تو بہتر ہے۔''۱۰

مولوی فضل الدین کے ''مقدمہ'' کی وہ تحریر جو علامہ اقبال کی دل آزاری کا باعث بنی:۔

مولوی فضل الدین نے ''مقدمہ'' لکھتے وقت وفورِ جذبات اور عقیدت سے مغلوب ہو کر مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور ان کے علمی مرتبے و مقام کو اُجاگر کرنے کے چکر میں علامہ اقبال کے سلسلے میں ایسی باتیں تحریر کر دی جو علامہ اقبال کے لئے دل آزاری کا سبب بنی۔ بات بہت اوچھی تھی۔ علامہ اقبال نے جب ایک خط کے توسط سے سید سلیمان ندوی سے دبی زبان میں شکایت کی تو سید سلیمان ندوی نے مولانا آزاد کو علامہ اقبال کی رنجیدگی سے آگاہ کر دیا۔ مولانا آزاد کو بھی مولوی فضل الدین کے اس ریمارکس سے رنج پہنچا۔ مولوی فضل الدین نے مقدمہ میں لکھا ہے:۔

"ڈاکٹر اقبال کا مذہبی عقائد میں پچھلا حال جو کچھ سنا ہے اس کے مقابلے میں اب
ان کی فارسی مثنویاں دیکھتے ہیں تو سخت حیرت ہوتی ہے۔ اسرار خودی اور رموز بے
خودی فی الحقیقت الہلال ہی کی صدائے بازگشت ہیں۔" ۱۱

علامہ اقبال اور مولانا آزاد دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے لئے بڑی جگہ تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے قدر داں تھے لیکن جب علامہ اقبال کی نظر مولوی فضل الدین کی مذکورہ تحریر پر پڑی تو انہیں تعجب بھی ہوا اور رنج بھی۔ لہذا بہت ہی مہذبانہ اور دبی زبان میں مولوی فضل الدین کی مذکورہ تحریر کی طرف توجہ دلاتے ہوئے سید سلیمان ندوی سے شکایت اپنے ایک خط میں کی جس کا متن اس طرح ہے:۔

"مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ آپ کی نظر سے گذرا ہوگا۔ بہت دلچسپ کتاب ہے مگر دیباچہ میں مولوی فضل الدین احمد مرزا لکھتے ہیں :"اقبال کی مثنویاں الہلال کی بازگشت ہیں۔" شاید ان کو معلوم نہیں کہ جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کیے ہیں، ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کرر ہاں ہوں۔ اس کے شواہد میری مطبوعہ تحریریں نظم ونثر۔ انگریزی واردو میں موجود ہیں، جو غالباً مولوی صاحب کے پیشِ نظر نہ تھیں۔ بہر حال اس کا کچھ افسوس نہیں کہ انہوں نے ایسا لکھا؛ مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت ہے، نہ نام آوری۔ البتہ اس بات سے رنج ہوا کہ ان کے خیال میں اقبالؔ، تحریکِ الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا؛ تحریکِ الہلال نے اسے مسلمان کر دیا۔ ان کی عبارت سے ایسا خیال مترشح ہوتا ہے؛ ممکن ہے ان کا مقصود یہ نہ ہو۔ میرے دل میں مولانا ابوالکلام کی بڑی عزت ہے اور ان کی تحریک سے ہمدردی؛ مگر کسی تحریک کی وقعت بڑھانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اوروں کی دل آزاری کی جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اقبال کے جو مذہبی خیالات اس سے پہلے سنے گئے، ان میں اور مثنویوں

میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ معلوم نہیں، انہوں نے کیا سنا، اور سنی سنائی بات
پر اعتماد کر کے ایسا جملہ لکھا جس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں، کسی طرح ان لوگوں
کے شایانِ شان نہیں جو اصلاح کے علمبردار ہوں۔ مجھے معلوم نہیں، مولوی فضل
الدین صاحب کہاں ہیں، ورنہ یہ موخر الذکر شکایت براہِ راست ان سے کرتا۔
اگر آپ سے ان کی ملاقات ہو، تو میری شکایت ان تک پہنچایئے۔"۱۲

خط بنام سید سلیمان ندوی

علامہ اقبال کے مذکورہ خط کے سلسلے میں مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا ابوالکلام آزاد کی توجہ جب مبذول کرائی تو انہیں بہت قلق ہوا اور علامہ اقبال کی شکایت کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے اپنے ایک مکتوب بابت ۲ جنوری ۱۹۲۰ میں مولانا نے سید سلیمان ندوی کو لکھا:۔

"ڈاکٹر اقبال کا شکوہ بیجا نہیں۔ یہ نہایت ہی لغو اور سبک بات ہے کہ فلاں نے فلاں بات فلاں کے اثر سے لکھی اور فلاں کے خیال میں یوں تبدیلی ہوئی۔ لیکن لوگوں کا پیمانہ نظر یہی باتیں ہیں، تو کیا کیا جائے۔ دراصل اس تذکرہ کی ساری باتیں میرے لئے تکلیف دہ ہوئیں۔ مسٹر فضل دین نے یہ مقدمہ لکھ کر نظر ثانی کے لئے بھیجا تھا، اسلئے کہ وہ موجودہ حالت میں کتاب کو پہلا حصہ کر کے شائع کرنا چاہتے تھے؛ اور میں مُصِر تھا کہ ایک ہی مرتبہ میں پوری کتاب شائع کر دی جائے۔ صرف اتنا ٹکڑا حد درجہ ضمنی مطولات وعدمِ انضباط کی وجہ سے نہایت مکروہ ہوگا خیال کا کیا کہ مقدمہ کا واپس نہ کرنا اشاعت میں روک ہوگا، لیکن انہوں نے بجنسہٖ چھاپ کر جلد باندھ کر یکا یک ایک نسخہ بھیج دیا؛ اور ان ساری باتوں کو وہ مزاح سمجھتے رہے۔ علاوہ ڈاکٹر اقبال وغیرہ والے ٹکڑے کے پورا مقدمہ طرزِ تحریر واستدلال وغیرہ کے لحاظ سے بھی بالکل لغو ہے۔ لطف یہ کہ اس مرتبہ جب وہ جلسہ کے موقع پر آئے اور میں نے پوچھا کہ اقبال کی

نسبت آپ نے کیونکر تبدیلی معلوم کی، تو خود میرے ہی ایک قول کا حوالہ دیا جو کبھی کہا تھا؛ حالانکہ میں نے جو بات کہی تھی، وہ صرف یہ تھی کہ اقبال پہلے آج کل کے عامۃ الناس کے تصوف میں مبتلا تھے، اب ان کے خیالات اس طرف سے ہٹ گئے، اور دونوں مثنویوں میں جو بات ظاہر کرنی چاہتے ہیں، وہ وہی ہے جو میں ہمیشہ لکھتا رہا ہوں۔'' [۱۳]

اس سلسلے میں مالک رام کا قیاس ہے:۔

''یقین ہے کہ اس خط کا اقتباس مولانا سید سلیمان مرحوم نے اقبال کے پاس بھیجا ہوگا۔ اور چونکہ اس کے بعد انہوں نے اس بارے میں کچھ نہیں لکھا، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ غالباً مطمئن ہو گئے تھے۔ اس سے اتنا ثابت ہے کہ یہ دل آزار تحریر نہ مولانا آزاد کی اجازت واستصواب سے شائع ہوئی، نہ وہ اس کے لئے ذمہ دار ٹھہرائے جاسکتے ہیں۔'' [۱۴]

تذکرہ کے موضوعات:۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی خودنوشت ''تذکرہ'' ستمبر ۱۹۱۹ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ تصنیف مولانا کے وسعتِ مطالعہ، تبحر علمی، غیر معمولی حافظہ، ذہانت وفطانت اور مسحور کن بلاغت کا پتہ دیتی ہے۔ تیس سال کی عمر میں لکھی جانے والی اس تصنیف میں جوش وخروش بھی ہے اور جوانی کی امنگوں کے زیر اثر بلند آہنگی بھی۔ کتاب کا آغاز عہد اکبری کے ایک ذی علم شخصیت صاحب طریقت، پیکر صدق وصفا حضرت شیخ جمال الدین معروف بہ شیخ بہلول دہلوی کے احوال سے ہوتا ہے جو ان کے پردادا حضرت شاہ محمد افضل کے مادری سلسلہ کے بزرگ تھے۔ مولانا آزاد میں تفخر کا یہ احساس ہمیشہ جاگزیں رہا کہ ان کا تعلق اس خانوادے سے ہے جن کے اسلاف میں شیخ جمال الدین جیسے پیر طریقت تھے جن کی حق گوئی وحق پرستی اور استقامت نے ملاّ مبارک کے ذریعہ تیار کئے گئے اکبر کے امام وقت ہونے کے محضر پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی وجہ سے شیخ جمال الدین کو بہت ساری مصیبتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ حالات اتنے ابتر

اور مخدوش ہو گئے کہ انہیں اپنے تلامذہ اور مریدین کی ایک جماعت کے ساتھ ہندوستان چھوڑنا پڑا اور وہ مکہ معظمہ ہجرت کر گئے۔ ان کے خلاف علمائے دربار کے بغض وعناد کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شیخ موصوف میر سید محمد جونپوری کو کبار اولیاء اللہ اور صاحبان مدارج ومقامات علیہ سمجھتے تھے۔ حالانکہ شیخ جمال الدین نے سید محمد جونپوری کے مہدی موعود ہونے کے اعتقاد کو باطل قرار دیا تھا۔ شیخ موصوف تیرہ برس تک مکہ معظمہ میں ہجرت کی زندگی گذارتے رہے۔ جب خاں اعظم مرزا کمتاش حج کے لئے گئے تو ان کے اصرار پر انہیں کے ہمراہ ہندوستان واپس آئے۔ چند ہی ماہ ہوا تھا کہ موت کا فرشتہ آ پہنچا اور انہوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اپنے اسلاف کرام کے انہیں اعمال صالحہ نے مولانا آزاد کو اپنے موروثی خزانہ پر فخر کرنے کا موقع عنایت فرمایا اور عقیدے میں استحکام اور طریق صدق وحق پر مستقیم رہنے کی توفیق بخشی۔ کہتے ہیں:۔

> ''بلاشبہ اسلاف کا ورثہ علم وحق پرستی کو دنیا کی ہر نعمت سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں اور نہیں چاہتا کہ کبھی اس نشہ سے میرا دماغ خالی ہو۔۔۔۔ بڑی سے بڑی آرزو جس کو اپنے دل میں رکھ سکتا ہوں یہی ہے کہ زندگی کی آخری گھڑیوں تک اپنے اسلاف کرام کے طریق صدق وحق پر مستقیم رہنے کی توفیق پاؤں اور اپنی ساری زندگی اسی راہ کی کوچہ گردی میں بسر کردوں جس کا نشانِ سفر وہ اپنی یادگار میں چھوڑ گئے ہیں۔ خدمت علم وحق ایک سرمایہ سعادت ہے جو مجھ تہی دست تک پہونچا ہے میری محرومی ہے اگر اس کو بچا نہ سکا اور فضل الٰہی کی بخشش ہے اگر اس کی عزت اور نام نیک کو آنے والوں کے لئے محفوظ چھوڑ گیا۔،،[۱۵]

لیکن یہ بات بھی ملحوظ خاطر رکھنی چاہئے کہ مولانا آزاد نے محض حسب ونسب اور خاندانی تفخر کو ہی اعزاز وافتخار کا معیار نہیں سمجھا بلکہ وہ اس کے مؤید تھے:۔

> ''انسان کے لئے معیار شرف جوہر ذاتی اور خود حاصل کردہ علم وعمل ہے، نہ کہ اسلاف کی روایاتِ پارینہ اور نسب فروشی کا غرورِ باطل۔ ہم کو ایسا ہونا چاہئے

کہ ہماری نسبت سے ہمارے خاندان کو لوگ پہچانیں، نہ یہ کہ اپنی عزت کے
لئے خاندان کے شرف رفتہ کے محتاج ہوا! ارباب ہمت نے ہمیشہ اپنی راہ خود
نکالی ہے اور اپنی عظمت و رفعت کی تعمیر صرف اُسی سامان سے کی ہے جو خود ان کا
بنایا ہوا تھا••• خاندان کے فخر کا بت بھی دنیا کے عہد جاہلیت کی ایک یادگار
مشئوم ہے، اور اسلام نے انسان کے بہت سے بنائے ہوئے بتوں کے ساتھ
اس کو بھی توڑ دیا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ کل کو ایک نو مسلم چمار اپنے حسنِ عمل سے وہ
مرتبہ پائے، جو شیخ الاسلاموں کی اولاد کو نصیب نہ ہو۔ یہ کل کو ہونے والی بات
ہے، اور آج بھی دنیا میں دیکھ رہے ہیں کہ "عمل" کا فرشتہ کتنے ہی بڑوں کو چھوٹا
کرتا ہے اور کتنے ہی چھوٹوں کو بڑا بناتا ہے۔

کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست۔" ۱۶

"تذکرہ" دراصل ایک ایسی خودنوشت ہے جس میں مولانا آزاد نے حضرت مولانا جمال الدین کو سرِ عنوان بنا کر ایک سانچہ مرتب کیا ہے جس میں حق و صداقت کے پیامبروں جنہیں وہ اپنا ہیرو تسلیم کرتے تھے کی داستان حیات، باطل کے خلاف اثبات حق کے لئے ان کی مسلسل جدو جہد، سرفروشی و جاں سپاری کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ساتھ ہی مولانا نے اپنے عادات و خصائص اور فکر و نظر اور اظہار ذات کو بھی موضوع بنایا ہے جن کا خمیر نسل و خاندان کی مٹی سے تیار ہوا ہے۔ اس سلسلے میں "غبار خاطر" کا ایک تراشہ نقل کرنا غیر مناسب نہ ہوگا:۔

"مجھے معلوم ہے کہ میری عادات و خصائل کی مورتی بھی اسی مٹی سے بنی۔ ہر
خاندان اپنی روایتی زندگی کی ایک انفرادیت پیدا کر لیتا ہے اور وہ نسلاً بعد نسلِ
منتقل ہوتی رہتی ہے۔ میں صاف محسوس کرتا ہوں کہ اس روایتی زندگی کے
اثرات میرے خمیر میں رچ گئے ہیں میں ان کی پکڑ سے باہر نہیں جا سکتا۔ میری
عادات و خصائل، چال ڈھال، طور طریقہ، امیال واذواق سب کے اندر خاندان

کا ہاتھ صاف صاف دکھائی دے رہا ہے۔،، ۷ا

تذکرہ کا اصل موضوع دعوت واصلاح، عمل وعزیمت کا پیغام، تصدیق حق کی دعوت تبلیغ ہے تا کہ مسلمانوں میں اصلاح کا جذبہ پیدا ہو۔ بقول ریاض الرحمان خاں شیروانی:۔

''۔۔۔۔۔ میں اس بات کو اس طرح کہنا پسند کروں گا کہ تذکرہ دراصل اظہار ذات سے عبارت ہے اور جن اکابر کا ذکر اس میں انہوں نے کیا ہے وہ ایک رمز اور علامت کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ رمز ہیں حق وصداقت سے اور خود مولانا کی پوری زندگی حق وصداقت ہی کی عملی تفسیر ہے۔ انگریزی کی مثل ہے کہ آدمی کی پہچان اس کے ساتھیوں سے ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ساتھیوں سے بھی زیادہ کسی آدمی کے ہیرو اس کی شناخت کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ مولانا آزاد نے تذکرہ میں اپنے جن ہیروؤں کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے ان کا مشترک وصف حق وصداوقت ہے۔ شیخ جمال الدین دہلوی کے علاوہ جن اکابر کے حالات ضمناً تذکرہ میں ملتے ہیں ان میں نمایاں نام احمد بن حنبلؒ، ابن تیمیہ، شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ کے ہیں۔ ان سب میں مولانا کی عقیدت کا بنیادی سبب ان کا حق وصداقت پر اصرار اور اس کی خاطر کڑی سے کڑی آزمائش میں پورا اترنا ہے۔ اگر آپ خود مولانا کی زندگی پر ایک نظر ڈالیں تو اس کا امتیازی وصف بھی آپ کو یہی نظر آئے گا کہ چاہے مذہب کا میدان ہو یا سیاست کا، علم کی دنیا ہو یا ادب، صحافت کی بساط ہو یا خطابت کی، مولانا نے حق وصداقت سے کبھی انحراف نہیں کیا اور اس کی خاطر ہر طرح کی کٹھنائیاں سہنے پر ہمیشہ آمادہ رہے اسی طرح کے ایک اور بزرگ شیخ داؤد تھے جنہیں سید محمد جونپوری سے عقیدت تھی اور جونپوری نے مہدویت کا دعویٰ کیا تھا۔ اس بنا پر شیخ داؤد کو مصائب وآلام کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں مولانا کی شخصیت کا ایک اور پہلو ابھر کر

سامنے آتا ہے اور وہ ہے افراط و تفریط سے انکار اور عدل و توازن پر سباط۔
مولانا کا کہنا ہے کہ شیخ داؤد سید محمد جونپوری کی بزرگی کے قائل ضرور تھے لیکن
مہدویہ عقائد کا بطلان کرتے تھے اور خود مولانا کا رویہ بھی یہی محسوس ہوتا ہے۔
حق و صداقت کی مانند عدل و توازن بھی مولانا آزاد کے کردار کا ہمیشہ روشن پہلو
رہا ہے اور اس کے مظاہر ہمیں ان کی زندگی کے ہر گوشے میں ملتے ہیں۔،، ۱۸

''تذکرہ'' میں علماء کی تقسیم بندی:۔

مولانا آزاد نے اپنے مذکورہ تصنیف میں اپنے مورث اعلی حضرت شیخ جمال الدین کو مرکزی حیثیت دیتے ہوئے جن شخصیتوں کو اپنے رشحاتِ قلم کا ہدف بنایا ہے ان کا تعلق علماء کے طبقے سے تھا اور جو دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ مولانا نے ان کے لئے دو الگ الگ اصطلاحیں وضع کیں (۱) علماء حق (۲) علماء سو۔ ان دونوں گروہوں کی باہمی آویزش کو مولانا نے خوب آشکارا کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

> ''اس دور میں بھی افراط و تفریط کی دو جماعتیں پیدا ہو گئیں پہلی جماعت علمائے دنیا پرست اور متعصبین جاہلین کی تھی جو اپنی ہوس پرستیوں، تعصب اور جہالت سے اصل مذہب کو بدنام کر رہے تھے۔ دوسری جماعت ان کے مدمقابل مدعیان تحقیق جدید و اجتہاد کی تھی۔ جنہوں نے حکمت و دانشمندی اور مذہب عقلی و طریق حکیمانہ کے نام سے الحاد و بے دینی اور اباحت و بے قیدی کی گرم بازاری کر رکھی تھی۔،، ۱۹

مولانا نے علماء حق کے زمرے میں اُن ائمہ مجتہدین کی بزرگی اور علوئے مرتبت کی خوب تعریف و تحسین کی ہے جنہوں نے قرآن و سنت کی عظمت لوگوں کے دلوں میں بٹھایا۔ حکمران وقت کے آگے کبھی نہیں جھکے۔ مال و جاہ کے مقابلے میں سرفروشی، جاں سپاری، حق و صداقت، بے نیازی و سرگرانی کو فوقیت دی جس کے نتیجے میں حکمرانِ وقت کی اذیتوں کو برداشت کیا لیکن مصائب

وآلام میں بھی خیر واستقامت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ان عظیم شخصیتوں میں شیخ نیازی، شیخ علائی، شیخ جمال الدین جیسی عظیم المرتبت شخصیتیں بھی ہیں جنہوں نے کلمۂ حق کی حمایت کی اور زمانہ ساز علماء مولانا عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی کی فاسقانہ اور تباہ کن حکمت عملی کی مخالفت کی اوران کی حیلہ سازیوں کا پردہ چاک کیا۔ان کے علاوہ جن ائمہ مجتہدین علماء حق کا تذکرہ اس کتاب میں ملتا ہے ان میں حضرت امام حسینؓ، سعید ابن میتب، حضرت امام مالکؒ، حضرت احمد بن حنبلؒ، ابن تیمیہؒ، شیخ احمد سرہندیؒ، شاہ ولی اللہؒ وغیرہ جیسے داعیان حق کے نام شامل ہیں جنہوں نے ظالم اور جابر حکمرانوں کے ظلم واستبداد اور ناانصافیوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔مولانا خود حق وصداقت کے علمبردار تھے اور ان کی پوری زندگی تصدیق واثبات صداقت کی عملی تفسیر ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں شروع سے آخر تک عمل وعزیمت کا پیغام بھی ہے اور دعوت واصلاح بھی۔عدل وتوازن مولانا کی شخصیت کا روشن پہلو رہا ہے لہذا اس کی بھی آئینہ داری اس کتاب میں نمایاں ہے۔

سید محمد جونپوری:۔

میر سید کے بیٹے میر سید محمد جونپوری کی پیدائش ۴۴-۱۴۴۳ میں ہوئی۔وہ پڑھنے میں کافی تیز تھے چنانچہ بارہ سال میں ہیفارغ التحصیل ہوگئے۔مناظرے کے فن میں اس حد تک طاق تھے کہ ان کے معاصرین انہیں ''اسدالعلماء'' کے لقب سے مخاطب کرتے۔۹۰۵ھ میں انہوں نے ''مہدی'' اور ''امام عہد'' کا اعلان کیا جس کی مخالفت اس عہد کے علماء نے جم کر کی۔نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف مقامات پر دربدری کی زندگی گذارتے رہے۔بنگال، مالوہ، گجرات، دکن میں جہاں جہاں گئے، علماء کی طرف سے ان کا تعاقب کیا جاتا رہا۔آخر کار وہ حج کے لئے روانہ ہوگئے واپسی پر احمد آباد میں سکونت پذیر ہوگئے لیکن جب سلطان محمود بیگڑہ کو علماء نے ان کے خلاف ورغلایا تو اس نے اخراج کا حکم دے دیا۔لہذا انہوں نے سندھ کا سفر کیا اور یہاں بھی معاملہ اسی طرح پیش آیا۔سندھ کے حاکم نے انہیں قتل کرنے کا حکم صادر کیا لہذا وہاں سے بچتے بچاتے قندھار پہنچے اور پھر وہاں سے خراسان کے شہر فراہ میں مقیم ہوگئے۔یہیں ۲۳ اپریل ۱۵۰۵ کو وفات پائی اور فراہ میں ہی

تجہیز و تکفین ہوئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد سید محمد جونپوری کی داستان حیات سے متاثر نظر آتے ہیں۔مولانا کے مورث اعلیٰ شیخ جمال الدین کو اس وجہ سے بھی پریشان کیا گیا کہ انہوں نے سید محمد جونپوری کی ولایت کو حق تسلیم کیا تھا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ شیخ نے سید کے مہدی موعود ہونے کے اعتقاد کو باطل قرار دیا تھا۔مولانا آزاد کا خیال ہے کہ سید محمد جونپوری کے ذریعہ خود کو مہدی ہونے کے دعوے کو کسی طرح غیر معمولی قرار نہیں دیا جاسکتا۔لہٰذا ان کی دفاع میں مولانا آزاد نے کئی صفحات سیاہ کے ہیں اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مہدی کے معنی ہیں ہدایت یافتہ۔اور ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے کسی روحانی تجربے کا اظہار یہ کہہ کر کہ وہ مہدی ہیں اور ان کے عقیدت مندوں نے اُن کے ''مہدی آخرالزماں'' ہونے کا اعلان کردیا ہو۔مولانا آزاد نے سید صاحب کی دفاع میں ان علماء پر سخت لعن طعن کیا ہے جنہون نے سید محمد جونپوری کی تضلیل اور تکفیر کا فتویٰ دیا تھا۔اس سلسلے میں ان اہل اللہ اور علمائے حق کی تحریریں بھی نقل کی ہیں جو سید محمد جونپوری سے حسن ظن رکھتے تھے۔اس سلسلے میں اس وقت کے ایک بڑے عالم شیخ وجیہہ الدین کی اس حق پرستی کو بھی اپنی باتوں کو تقویت بخشنے کے لئے اجاگر کرتے ہیں۔دیکھئے یہ اقتباس:۔

> ''شیخ وجیہہ الدین گجراتی جو اس وقت کے بڑے عالم تھے اور جن کا ترجمہ اخبار الاخیار اور مآثر الکرام وغیرہ میں موجود ہے، اُن کے سامنے جب سید موصوف اور اُن کے بعض اتباع کی تکفیر کا فتویٰ پیش کیا گیا تو دستخط کرنے سے انکار کردیا اور کہا کہ جو جماعت دنیا کو چھوڑ کر وقفِ حق پرستی ہے، میرا قلم اس کی مخالفت میں نہیں اُٹھ سکتا۔'' ۲۰

مولانا آزاد شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ کی اس تحریر پر بھی چراغ پا نظر آتے ہیں جس میں شاہ صاحب نے سید محمد جونپوری کے سلسلے میں ریمارکس دیے ہیں دیکھئے یہ تراشہ:۔

''دراعتقاد سید محمد جونپوری ہر کمالیکہ محمد رسول اللہ صلعم داشت ورسیدہ سید محمد رانیز

بود، فرق ہمیں است کہ آنجا باصالت بود و ایں جا بہ تبعیت ، وتبعیتِ رسول بجائے رسیدہ کہ ہمچو او شد۔''''۲۱

شاہ صاحب کی مذکورہ تحریر پر مولانا آزاد کا کیا ردِ عمل ہوا، دیکھئے یہ اقتباس:۔

''شاہ صاحب کی یہ عبارت دیکھ کر مجھ کو خیال ہوا کہ ہمارے زمانے میں مرزا صاحب قادیانی کے معتقدین میں سے ایک بڑا گروہ بھی مرزا صاحب کی نسبت بعینہٖ یہی اعتقاد رکھتا ہے، اور اسی اصالت وتبعیت کے فرق پر اپنے تمام غلو واغراق کی بنیاد رکھی ہے۔

لیکن شاہ صاحب نے یہ نہیں لکھا ہے کہ سید موصوف نے یہ بات خود کہی یا اُن کے مریدین ومعتقدین کا استنباط اور پیر پرستانہ منقبت سرائی ہے۔ خود سید موصوف نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ اُمّ العقائد جو ان کی جانب منسوب ہے، وہ بھی اُن کے مریدوں کی لکھی ہوئی ہے۔ صاحب ہدیۂ مہدویہ نے اس کی عبارتیں نقل کی ہیں اور ان میں بلاشبہ اس طرح کی باتیں پائی جاتی ہیں، لیکن قطع نظر فسحتِ میدانِ تاویل کے ان کا انتساب خود سید محمد کی جانب مشکوک ومحلِ نظر ہے۔''۲۲

میرے خیال سے سید محمد جونپوری کی حیثیت مولانا آزاد کی نظر میں ایک روحانی پیشوا کی تھی اور ان کی روح میں انہیں ایک مجاہد کا سعی وعمل جلوہ گر تھی۔ انہوں نے اس تاسف کا اظہار کیا ہے کہ مخالفین نے سید صاحب کی تعلیمات ان کی اخلاقی اور مذہبی حیثیت کو دبانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ مہدیت کے دعویٰ کی مخالفت تو محض ظاہری تھی۔ اس کے پس پردہ سید محمد کے تجدیدی رجحان، دعوت کلمۃ الحق اور اسوۂ حسنہ حضرت رسول اکرم صلعم کی دعوت کو دبانا تھا۔

شیخ عبداللہ نیازی:۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے علمائے حق کی صف میں اپنے زمانے کے ایک مشہور پیر طریقت

شیخ عبداللہ نیازی کو بھی شامل کیا ہے جن کا شمار شیخ سلیم چشتی کے سر برآوردہ خلفاء میں ہوتا تھا لیکن بعد میں مہدوی مسلک اختیار کر کے مشیخیت اور زہد فروشی کا تمام کاروبار تاراج کر کے درویشی و نامرادی کی وضع اختیار کر لی تھی۔ ان کے روز و شب کے مشاغل کیا تھے؟ اس سلسلے میں مولانا آزاد یوں رقم طراز ہیں:۔

''بیانیہ میں شہر سے باہر ایک ویران باغ تھا۔ وہیں مٹی کا جھونپڑا بنالیا اور مقیم ہو گئے اپنے ہاتھ سے پانی بھرتے، مٹکے سر پر اٹھا کر لے جاتے، پیاسوں کو پلاتے اور نمازیوں کو وضو کراتے، بوڑھے آدمیوں کو دیکھتے کہ بھاری بوجھ اٹھائے جا رہے ہیں۔ تو ان سے چھین کر خود اٹھا لیتے اور کوسوں دوڑتے ہوئے ساتھ چلے جاتے:

باسبک روحاں کن آمیزش، کہ ماندی چوں زرا
بارِ غم بر دوشِ دل منزل بمنزل مئے بزند

نماز کا وقت آتا، تو لکڑ ہاروں اور سقوں کو جمع کرتے اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے کسی پیشہ ور کو دیکھتے کہ عذر معاش سے نماز میں شریک نہیں ہوتا، تو اپنی کمائی اس کو دے دیتے اور منت وزاری کے ساتھ کہتے کہ جماعت میں شریک ہو کر نماز پڑھ لو۔ وہ پڑھ لیتا، تو ایسے خوش ہوتے گویا دنیا جہان کی پادشاہت اس نے دے دی۔ روز بروز یہ حالت بڑھتی گئی۔ یہاں تک کے عشق خالق اور خدمت خلق کے سوا اور کسی بات سے واسطہ نہ رہا

دو عالم از اثر شعلۂ جمالش سوخت
بجز متاع محبت کہ در پناہِ من ست ۔ ۲۳

شیخ علائی:۔ ان کا تعلق صوبۂ بہار کے کسی خانوادے سے تھا۔ علم و فضل کے اعتبار سے بہت اعلی مقام و مرتبہ رکھتے تھے۔ مشیخت اور صوفیت کے اعتبار سے بھی ان کا بہت شہرہ تھا۔ مدتوں تک

طرح طرح کی سخت ریاضتوں میں مصروف رہے عوام وخواص میں ان کے مجاہدات کا ہر طرف چرچا رہا۔ان کے سلسلے میں مولانا آزاد یوں رقم طراز ہیں:۔

"....مدتوں طرح طرح کی سخت ریاضتیں کی تھیں عوام وخواص میں اُن کے مجاہدات کی دھوم تھی۔ بایں ہمہ نفس پرستی کا یہ حال تھا کہ فقیری کے سجادے پر فرعونیت کا تاج پہن کر بیٹھے تھے اور جس عالم وصوفی کی طرف لوگوں کو ذرا بھی مائل پاتے تھے، فوراً اپنے مریدوں کی فوج لے کر چڑھ دوڑتے تھے۔ کبھی بحث ومناظرہ کے زور سے، کبھی سوءِ اعتقاد کے الزام سے، کبھی اور کوئی حیلہ وبہانہ پیدا کر کے (اور اس گروہ کے پاس مکروحیل کی کیا کمی ہے!) اس طرح ذلیل ورسوا کر دیتے کہ غریب شہر چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا۔ ایک دنیادار فاسق اور ایک دنیا پرست عالم میں یہی فرق ہے کہ پہلا اپنی ہوا پرستیوں کو اعتراف فسق کے ساتھ انجام دیتا ہے اور دوسرا دینداری اور احتساب شرعی کی ظاہری فریبی سے۔"[۲۴]

شیخ علائی کا خاندان بھی بیانہ میں سکونت پذیر تھا۔ جب اُن کی ملاقات شیخ نیازی سے ہوئی تو ایک ہی نظر میں ایسا گھائل ہوئے کہ اُنہیں کی طرح سجادۂ مشیخت ومسندِ علم کو اُن کے تمام ساز وسامان غرور پندار کے تاراج کر کے اُن کے ساتھ ہو گئے اور بیانہ سے باہر اُسی ویران باغ میں رہنے لگے۔ زن وفرزند، خویش وبیگانہ، خانہ وطن کسی چیز سے لگاؤ نہ رہا۔ دن بھر محنت مزدوری کر کے جو کچھ ملتا اُس کا دسواں حصہ راہِ خدا میں خرچ کرتے اور جو بچتا شام کو لے کر لوٹتے اور ایک خاندان کے بھائیوں کی طرح مل جل کر کھا لیتے۔ اس سلسلے میں مولانا آزاد نے ان کے روزمرہ کے مشاغل کے بارے میں یوں لکھا ہے:۔

"..... کچھ لوگ صبح ہوتے ہی شہر کی راہ لیتے۔ بیماروں کی تیمارداری کرتے کمزوروں اور معذوروں کی روٹی پکا دیتے، بیوہ عورتوں کا سودا سلف بازار سے لادیتے، دو شخصوں کو آپس میں لڑتے دیکھتے، تو منتیں کر کے صلح صفائی کرا دیتے؛

نہ مانتے، تو کہتے ہم کو مار ڈالو، مگر آپس میں میل ملاپ کرلو۔ استغنا وقناعت کا
یہ حال تھا کہ کئی کئی دن گزر جاتے اور کچھ میسر نہ آتا، لیکن دلوں کی بے فکری اور
چہروں کی خوش حالی دیکھ کر گمان ہوتا کہ ابھی شکم سیر ہو کر اٹھے ہیں۔ یحسبهم
الجاهل اغنياء من التعفف. بھوک کا بہت غلبہ ہوتا تو نماز شروع کر دیتے،
اور سلام پھیر کر اٹھتے، تو شہنشاہوں کی بے نیازی چہروں سے ٹپکتی۔ ساتھ ہی
امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے جوش کا یہ حال تھا کہ معاصی و منکرات کے
دیکھنے کی تاب نہیں رکھتے تھے۔ ہر فرد ہمیشہ مسلح رہتا، اور جب کسی فعل منکر کو
دیکھتا، تو فلیغیرہ بیدہ پر عمل کر کے حکماً روک دیتا: فی اللیل رھبان و بالنھار فرسان
؛ اس پر صبر وثبات کا حال یہ تھا کہ ملامتیں سنتے، گالیاں کھاتے، فاقے کرتے:
زخمی ہوتے، مگر اپنے کام سے باز نہ آتے اور کہتے کہ گالیوں میں ہمیں وہ
مزا ملتا ہے، جو تم کو دعاؤں میں نہیں ملتا۔،، ۲۵

تھوڑے ہی دنوں میں ان حضرات کے اخلاق وخصائل سے متاثر ہو کر گجرات، مالوہ اور
دکن کے ہزاروں خاندان اس گروہ میں شامل ہو گئے۔ ہر طرف اس جماعت کا چرچا ہونے لگا۔
لوگوں میں دینداری اور پرہیزگاری کا جوش اور جذبات کا ایک سمندر ہچکولے مار رہا تھا۔ لیکن مولانا
آزاد تاسف کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ایک ایسے گروہ کو بھلا علمائے دنیا اور فقہائے سوء کب چین سے بیٹھنے دے
سکتے تھے۔ چوروں اور قاتلوں کو ان لوگوں سے امن مل سکتا تھا مگر مصلحین
امت اور عشاق حق کے لئے امن وانصاف کہاں! ۲٦

خونے نکردہ ایم و کسے را نہ کشتہ ایم
جرم ہمیں کہ عاشق روئے تو گشتہ ایم

۹۵٦ ہجری میں سلیم شاہ آگرہ میں مسند نشیں ہوا۔ اس پر مخدوم الملک عبد اللہ سلطانپوری

کا بے حد اثر تھا۔ اُس نے شیخ نیازی اور شیخ علائی اور اُن کی جماعت کے سلسلے میں کافی جارحانہ رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ عوام کو اس سلسلے میں گمراہ کرنا شروع کیا کہ یہ لوگ گمراہ اور بدعقیدہ ہیں اور سلیم شاہ کو ورغلاتے ہوئے اس خطرے کا احساس دلایا کہ جب سید محمد مہدی ہو گئے تو تمہاری حکومت ختم ہو جائے گی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ مہدوی نہ تھے۔ مخدوم الملک کے ورغلانے پر سلیم شاہ نے فرمان جاری کر کے شیخ علائی کو آگرہ میں طلب کیا کہ مشاہیر علمائے عہد سے اپنے عقائد کے بارے میں بحث کریں۔ شیخ رفیع الدین محدث اور شیخ ابوالفتح تھانیسری بھی بحث ومباحثہ کے لئے طلب کئے گئے۔ شیخ علائی اپنے ساتھیوں کے ساتھ دربار میں پہنچے تو اُن کے ساتھ پھٹے پرانے کپڑوں و نامراد وضع صورت میں درویشوں کی ایک شکستہ حال جماعت بھی تھی۔ شیخ علائی سلام کر کے ایک گوشے میں بیٹھ گئے اور تمام دربار پر حقارت و بے پروائی سے نظر ڈالی۔ سلیم شاہ پر اُن کی خودداری بہت شاق گذری۔ بحث ومباحثہ کا سلسلہ شروع ہوا۔ شیخ علائی نے قرآن حکیم کی چند آیات تلاوت کرنے کے بعد تفسیر بیان کرتے ہوئے وعظ شروع کیا۔ اپنے بیان میں انہوں نے دنیا کی مذمت، آخرت کے حالات، علماء کی اہانت اور امراء وسلاطین کے فرائض پر بصیرت افروز تقریر کی۔ بقول مولانا آزاد:۔

''ایسا پرتاثیر ودردانگیز بیان تھا کہ اُدھر شیخ کی زبان سے الفاظ نکل رہے تھے، اُدھر تمام مجمع کی سنگ دلی موم کی طرح پگھل رہی تھی! خود سلیم شاہ اور اس کے امراء کا یہ حال ہوا کہ باوجود کمال قسی القلبی وحق فراموشی کے ضبط نہ کر سکے اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے:

سرشکِ گرم کی حدّت کو پوچھو
مرے دامن سے، اپنی آستیں سے

یہ حال دیکھ کر سلیم شاہ کا خیال پلٹ گیا اور بے اختیار ہو کر شیخ کی نہایت تعظیم وتکریم بجالایا۔ پوچھا کہ باوجود ان کمالات وفضائل کے کیا سبب ہے کہ لوگ

تمہارے مخالف ہیں؟ بھلا شیخ علائی اس کا کیا جواب دیتے!

دل را کہ تو مقیّد زندانِ حسرت ست
بر عرضِ عشق ہیچ گناہے دگر نبود! ے۲۷

بحث کا سلسلہ کئی دنوں تک رہا۔ مباحثہ کا رنگ دیکھ کر سلیم شاہ کو یقین ہو گیا کہ تمام علماء بے وجہ ایک درویش حق پرست کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ لیکن معاملہ چونکہ مذہبی تھا اور پھر یہ کہ عوام کے جذبات کا بھی خیال رکھنا تھا جو مخدوم الملک کے زیر اثر تھے لہذا سلیم شاہ نے دکن چلے جانے کا حکم صادر کیا جس کے نتیجے میں شیخ کو دکن کی راہ اختیار کرنی پڑی۔ چند دنوں کے بعد پھر مخدوم الملک نے سلیم شاہ کو شیخ علائی کے خلاف ورغلانا شروع کیا اور اُسے شیخ کو قتل کرنے پر آمادہ کرنا چاہا۔ اس سلسلے میں مخدوم الملک نے طرح طرح کے اشتعال انگیز قصے سنائے۔ بالآخر شیخ علائی کو دوبارہ آگرہ طلب کیا گیا۔ اس مرتبہ شیخ کو شیخ بڈھ بہاری کے سپرد کیا گیا کہ جو فیصلہ آپ صادر فرمائیں گے شیخ علائی کے سلسلے میں اس پر عمل کیا جائے گا۔ مولانا آزاد نے بدایوں کی تصنیف ''منتخب التواریخ'' کے حوالے سے یہ بیان کیا ہے کہ پہلے تو شیخ بڈھ نے ایک حق پرستانہ تحریر لکھی لیکن اپنے لڑکوں کے سمجھانے پر اُس نے اُس تحریر کو چاک کر دیا اور دوسری تحریر لکھ بھیجی۔ ''مخدوم الملک امروز از علمائے محققین است۔ سخن سخنِ اُو فتویٰ فتویٰ اوست''

شیخ بڈھ کی اس منافقانہ اور فتنہ پرور تحریر کے سلسلے میں تاسف کا اظہار کرتے ہوئے مولانا آزاد یوں رقم طراز ہیں:۔

''کاش! شیخ بڈھ علم نہ پڑھتے، ارشاد قاضی کی شرح نہ لکھتے۔ جنگل میں لکڑیاں کاٹتے اور سر پر اٹھا کر بازاروں میں بیچتے، مگر حق گوئی سے زبان نہ روکتے تو ہزار درجہ اس مولویت و مشیخت اور شرح نویسی کی زندگی سے زیادہ اللہ کے نزدیک مقرب و محبوب ہوتے۔ ارشادِ قاضی کی شرح قیامت کے دن اُن کو نہیں بخشوا سکتی، مگر حق گوئی کا ایک سچا لمحہ عمر بھر کے گناہوں کو محو کر دے سکتا ہے!

عشق تو قائم نہ ہوا آپ سے

اور ہی کچھ پیشہ کیا چاہیے۔'' ۲۸

سلیم شاہ نہ چاہتے ہوئے بھی شیخ کو علمائے سو کے پنجوں سے چھڑانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ چاہتا تھا کہ اگر ایک عالم کا بھی سہارا مل جائے تو ایک حق پرست عالم کو بچایا جا سکتا ہے لیکن افسوس کہ سب نفس دنیا کے پجاری تھے۔ جب شیخ بڈھ نے مخدوم الملک کی تائید کی تو وہ بالکل مجبور ہو گیا۔ شیخ بڈھ نے شیخ علائی کو مخدوم الملک کے حوالے کر دیا۔ اُس وقت شیخ سخت بیمار تھے۔ گلے میں ایک بہت بڑا زخم تھا اور بہار تک سفر کرنے کی زحمت نے نیم جاں کر دیا تھا۔ مخدوم الملک کے حکم پر جلاد نے کوڑے لگانے شروع کئے۔ تیسرا ہی ضرب لگائی تھی کہ اس شہید حق کی روح قفس عنصری سے پرواز کر کے خالق حقیقی سے جا ملی۔ ملا عبدالقادر بدایوانی نے ''ذاکراللہ'' اور ''سقاھم ربھم شرابا'' سے تاریخ نکالی جو ۹۵۷ سال ہجری ہے۔ بدایونی کی روایت ہے کہ اُنکی نعش کو ہاتھی کے پاؤں سے باندھ کر گھسیٹا گیا اور اس کے ٹکڑوں کی تمام لشکر میں تشہیر کی گئی اور پھر حکم دیا گیا کہ دفن نہ کی جائے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں:۔

''سبحان اللہ کاروبار عالم کی بوالعجبی اور جہانِ ہزار نیرنگ کی بوقلمونی، یہ ہے خدمت انسانی کا وہ مزد و صلہ جو دنیا نے ہمیشہ اپنے غمگساروں کو دیا ہے۔ اور یہ عشقِ حق و شیفتگی صدق کا نتیجہ جو اس ظلم آبادِ ارضی میں ہمیشہ نیاز مندانِ حق کو ملتا ہے۔'' ۲۹

شیخ علائی کے بعد مولانا آزاد اُن کے پیر شیخ نیازی پر ہونے والے مظالم کا واقعہ بیان کرتے ہیں وہ بھی مخدوم الملک کی شرانگیزی کے شکار ہوئے۔ جب سلیم شاہ سرحدی افغانوں کی یورش کو کوچ کر پنجاب کی جانب آمادۂ سفر تھا اور شاہی لشکر بیانہ کے قریب پہنچا تو مخدوم الملک نے موقع غنیمت جانتے ہوئے سلیم شاہ کو ورغلانا شروع کیا کہ شیخ علائی کے پیر شیخ نیازی اسی جگہ بیانہ میں سکونت پذیر ہے اور آپ کے خلاف طرح طرح کا فتنہ برپا کرتا ہے۔ لہذا سلیم شاہ نے بیانہ کے

حاکم میاں بھوہ تو حانی کو حکم دیا کہ شیخ کو حاضر لشکر کرو۔ میاں بھوہ شیخ کا مرید تھا۔ اُس نے شیخ کو بہت سمجھایا کہ آپ یہاں سے راتوں رات نکل جائیں۔ میں کوئی بہانہ کر دوں گا لیکن شیخ نے انکار کر دیا۔ لہذا میاں بھوہ شیخ کو ہمراہ لے کر لشکر شاہی میں پہنچے۔ سلیم شاہ گھوڑے پر سوار کوچ کے لئے تیار کھڑا تھا۔ شیخ جب سامنے پہنچے تو اُنہوں نے گردن جھکائے بغیر سنتِ رسول کے مطابق سلام کیا۔ میاں بھوہ نے گردن جھکا کر سلام کرنے کو کہا تو وہ گرج کر بولے کہ جو سلام کہ سنت ہے اور صحابہ اللہ کے رسول کے سامنے کہا کرتے تھے۔ یہی ہے۔ اس کے سوا میں کوئی اور سلام نہیں جانتا۔ سلیم شاہ شیخ کے اس جواب سے غضب ناک ہو گیا اور اُس کے اشارے پر لشکریوں نے لاٹھیوں، کوڑوں۔ مکوں اور لاتوں سے پیٹنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ بے ہوش ہو گئے۔ جب تک ہوش رہا یہ آیت قرآنی ورد زبان تھی۔ ''ربنا اغفر لنا ذنوبنا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکفرین.'' سلیم شاہ نے جب شیخ کو یہ پڑھتے ہوئے دیکھا تو پوچھا کیا کہتا ہے؟ مخدوم الملک نے کہا ''شمارا و مارا کافری خواند'' اس پر اُس کو اور زیادہ طیش آیا اور جب تک موت کا یقین نہ آ گیا، برابر زد و کوب کا حکم دیتا رہا۔ مولانا لکھتے ہیں:۔

> '' افسوس! عشاق حق کے ساتھ ہمیشہ یہی ہوا اور اعدائے حق واصلاح کے ہاتھوں کبھی ان کو امن کی گھڑیاں نصیب نہ ہوئیں۔ یہی ہوتا رہا ہے اور شاید ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ دشمنانِ حق نے اگر ان کی جانوں کو سب سے بڑی چیز سمجھ کر لینا چاہا۔ تو انہوں نے بھی اپنی جان کو دنیا کی ساری چیزوں میں سب سے زیادہ ہیچ وادنیٰ سمجھا ولنا فیھم اسوۃ حسنہ.
>
> جانیست ہر آینہ بخواہد رفستن
>
> اندر غمِ عشقِ تو رَوَد، اولیٰ تر'' ۳۰ے

مخدوم الملک کا کیا حشر ہوا اور آس کے کرتوت کی اس کو کیا سزا ملی؟ مولانا نے جس انداز میں تصویر پیش کی ہے عبرت کا مقام ہے۔ لکھتے ہیں:۔

''سبحان اللہ! مکافات ومجازات عمل کا قانون الٰہی کس طرح اس دنیا ہی میں اپنا کام انجام دے رہا ہے اور آخرت کی منزل ابھی باقی ہے: لوکانو یعلمون۔ بالاخر ایک زمانہ آیا کہ یہی مخدوم الملک تھے اور یہی ہندوستان، مگر پیشوائی اور شیخ الاسلامی ایک طرف رہی، عزت وآبرو سے اپنا بڑھاپا بھی بسر نہ کر سکے، اور عہد اکبری کے نئے نئے مفتیوں کے ہاتھوں وہ وہ ذلتیں اور خواریاں نصیب ہوئیں کہ بقول ملائے بدایونی: یوم تبلی السرائر۔ کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ یا تو یہ حال تھا کہ ان کے قلمِ شیخ الاسلامی کی ایک گردش اہل اللہ کی زندگیوں کا فیصلہ کردیتی تھی، یا یہ یوم العذاب دیکھنا پڑا کہ حاجی ابراہیم سرہندیؒ اور شیخ ابوالفضل جیسے نوخیز واحداث بھری مجلس میں ان کے فسق وتقویٰ کا فیصلہ کرنے لگے اور عمر بھر کی بداعمالیوں کا ایک ایک کر کے حساب دینا پڑا۔ فنعوذ باللہ من الحور بعد الکور:

گرہ کیسی لگی تھی؟ کھل گئے کس راہ فتنے؟
نظر آتا ہے خالی آج گوشہ تیرے داماں کا!''[۳۱]

آگے چل کر مولانا نے ملا عبدالقادر بدایونی کے حوالے سے مخدوم الملک کے سیاہ کارناموں مکروفریب اور غیر شرعی اقدامات کا پردہ چاک کیا ہے۔ اُس کے دولت وتمول کا یہ حال تھا کہ گھر کے صندوقوں میں ہی نہیں بلکہ خاندانی قبروں میں بھی سونے چاندی کی اینٹیں مدفون کئے ہوا تھا۔ زکواۃ سے بچنے کے لئے بھی کوئی نہ کوئی حیلہ نکال لیتا۔ ہر سال کے آخر میں اپنا تمام خزانہ بیوی کے نام پر کر دیتا اور وہ ایک سال پورا ہونے سے پہلے اُن کے نام بخش دیتی۔ اس طرح حول کامل دونوں میں سے کسی پر نہ گذرتا جو زکواۃ کی ادائیگی کا شرط ہے۔ یہی نہیں بلکہ طرح طرح کے شرعی حیلے بنا کر اُن کی آڑ میں بندگانِ خدا کو لوٹنے اور کھسوٹنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ اُس کے کالے کرتوتوں کی قلعی تب کھلی جب عہدِ اکبری کا دور شروع ہوا اور اُس کی ہوا اُکھڑنے لگی

۔آگے چل کر مولانا نے احکام شرعیہ کی تعمیل سے بچنے کے لئے حیلہ سازی کی بھرپور مذمت کی ہے اور نہایت ہی تحقیقی طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ دوسری صدی ہجری کے اوائل ہی میں بعض فقہاء دنیاو عبید السلاطیب نے حیلہ تراشیاں شروع کر دی تھیں اور تیسری صدی میں اُمت کے صندوقیوں اور فریسیوں نے کتاب الحیل کو بھی منجملہ ابواب فقہ کے قرار دے دیا تھا۔ مولانا آزاد نے شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ، حضرت عبداللہ بن مبارک، شریک بن عبداللہ قاضی کوفہ، حفص بن غیاث، یزید بن ہارون، ایوب سختیانی وغیرہ کے فتاویٰ اور اقوال نقل کئے ہیں جن کی رو سے کسی نے حیلے پیدا کرنے کو بدعت سے موسوم کیا ہے تو کسی نے حیلے نکال کر احکام شرعیہ کی تعمیل سے بچنے کو خدا کو دھوکا دینے کے مترادف قرار دیا۔ یزید بن ہارون نے تو تاسف کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ حیلہ تراشوں نے یہودیوں کو بھی مات دے دیا وغیرہ اپنی باتوں کو تقویت بخشنے کے لئے حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی رائے طلاق و عین کے بارے میں، حضرت عمرؓ کا خطبے میں یہ اعلان بطور حیلہ کے حلالہ کرا کے مطلقہ سے رجعت کی تو اس کو زنائے محض کی حد جاری کیا جائے گا۔ اسی طرح مولانا نے مسند احمد کی ایک روایت نقل کیا ہے جس میں مقروض سے ہدیہ و تحائف کا لینا ناجائز قرار دیا گیا ہے کہ سود کے حیلہ بن جا سکتا ہے۔ اس فعل میں شریعت اسلامی کے احکام کی تعمیل سے بچنے کے لئے جو حیلے، حوالے اور بہانے نکالے جا رہے تھے مولانا نے تفصیلی طور پر اُن کا پردہ چاک کیا ہے اور اُن کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"....نتیجہ یہ نکلا کہ شریعت الٰہی جو عدل وصداقت کے قیام کے لئے۔ اسی کے نام سے مکر و فریب اور ظلم و غضب اور نہب و سلب کے تمام کاروبار جاری ہو گئے۔ اور دنیا کی تباہی کے لئے اس سے بدتر وقت اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ خدا کا پاک نام لے کر اُس دنیا میں برائی پھیلائی جائے! کتنی ہی زنا کاریاں ہیں جو حیلے نکال کر نکاحِ شرعی بنائی گئیں! کتنے ہی غصب و ظلم اور اکل اموال بالباطل کے رذائل ہیں جن کو ایک شرعی معاملہ بنا کر جائز کیا گیا! کتنے ہی عقودِ

فاسدہ ہیں جن کو اسی شیطانِ حیل نے جائز کرا کے بندگانِ الٰہی کے حقوق تلف
کرائے! کتنے ہی حج ہیں جو ساقط ہوئے! کتنی ہی زکاتیں ہیں جو کبھی ادا نہیں
کی گئیں! کتنے ہی شارب الخمر او زانی محصن ہیں جو حدود شرعیہ سے صاف
بچالئے گئے......"۔۳۲

مولانا نے اس تاسف کا بھی اظہار کیا ہے کہ متعدد نظائر وحوادث حیل وخادعت کے ہیں جنہیں بعض ائمہ واعلام سے منسوب کر دیا گیا ہے اور جس کو دیکھ کر طبیعت کو سخت تشویش وحیرانی ہوتی ہے۔ مثلاً قاضی ابو یوسف کے سلسلے کی نسبت سے یہ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے ہارون رشید کو ایک لونڈی سے متمتع کرنے کا حیلہ دیا تھا یا خود امام ابو یوسف کا حول والحول سے بچنے کے لئے اپنا تمام مال بیوی کے نام ہبہ کر دینا اور اُس پر طرّہ یہ کہ امام ابو حنیفہ کا داد دینا وغیرہ۔ ان واقعات کے بیان کے بعد مولانا یہ مغز اُبھارتے ہیں:۔

"اس میں شک نہیں کہ بظاہر ان واقعات کو پڑھ کر طبیعت کو سخت خلجان ہوتا ہے لیکن دقتِ نظر سے کام لیا جائے، تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اور اس طرح کی تمام منسوبات قطعاً ناقابلِ اعتماد بلکہ داخلِ اکاذیب وبہتان ہیں۔ حضرت قاضی ابو یوسف اور امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہما کا مقام اس سے کہیں ارفع واعلیٰ ہے کہ ایسے منکرات وشنائع کا ان کی نسبت وہم بھی کیا جا سکے۔ یہ سارے حیلے بعد کے فقہائے حیل وعلمائے دجل وفساد کے تراشے ہوئے ہیں اور یقیناً انہوں نے ہی اپنی بضاعتِ رویہ کے رواج دینے کے لئے ان کو ائمہ سلف وفقہائے امصار کے نام سے منسوب کر دیا۔ ایسی مکذوب ومصنوع نسبتیں ہمیشہ ہوئی ہیں اور ہر علم وفن میں اس کے بے حد وشمار نظائر موجود ہیں۔"۳۳۔

آگے چل کر علمائے سو کی بداعمالیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ملا عبدالنبی صدر اور مخدوم الملک کی آپسی چپقلش اور لڑائی جھگڑوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی آپسی ٹکراور رقابت نے ہی

دونوں کو پاش پاش کردیا۔ علمائے دنیا پرست کی بداعمالیوں اور آپسی رقابت کے سلسلے میں مولانا لکھتے ہیں:۔

''سانپ اور بچھو ایک سوراخ میں جمع ہو جائیں گے لیکن علمائے دنیا پرست کبھی ایک جا اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ کتوں کا مجمع ویسے تو خاموش رہتا ہے، لیکن ادھر قصائی نے ہڈی پھینکی اور اُدھر اُن کے پنجے تیز اور دانت زہر آلود ہو گئے۔ یہی حال ان سگان دنیا کا ہے ساری باتوں میں متفق ہو جا سکتے ہیں لیکن دنیا کی ہڈی جہاں سڑ رہی ہو وہاں پہنچ کر اپنے پنجوں اور دانتوں پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ ان کا سرمایۂ نازعلم حق نہیں ہے جو تفرقہ مٹاتا اور اتباع سبلِ متفرقہ کی جگہ ایک ہی صراط مستقیم پر چلاتا ہے، بلکہ یکسر علم جدل وخلاف ہے۔ نفس پرستی اُس کی کثافت کو خمیر دیتی، اور دنیا طلبی کی آگ اُس کی ناپاکی کے بخارات کو اور زیادہ تیز کرتی رہتی ہے۔ فساق وفجار خرابات میں بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کی تندرستی کا جام صحت پیتے ہیں، اور چور اور ڈاکو مل جُل کر رہزنی کرتے ہیں؛ مگر یہ گروہ خدا کی مسجد اور زہد وعبادت کے صومعہ وخانقاہ میں بیٹھ کر بھی متحد و یک دل نہیں ہو سکتا اور ہمیشہ ایک دوسرے کو درندوں کی طرح چیرتا پھاڑتا اور پنجہ مارتا رہتا ہے۔ میکدوں میں محبت کے ترانے اور پیار اور الفت کی باتیں سننے میں آجاتی ہیں، مگر عین محرابِ مسجد کے نیچے پیشوائی وامامت کے لئے ان میں سے ہر ہاتھ دوسرے کی گردن پر چڑھتا اور خونخواری کی ہر آنکھ دوسرے بھائی پر لگی ہوتی ہے۔،، ۳۴؎

علمائے سو کی بداعمالیوں کے سلسلے میں مولانا کی رائے کس قدر شدید تھی اس کا تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر ریاض الرحمان خاں شیروانی یوں رقم طراز ہیں:۔

''مولانا آزاد نے علمائے سو کی جن برائیوں کی نشان دہی کی ہے ان میں تقلید،

بدعت ، افراط وتفریط ، تاویل باطل ، غرور عقائد ونسیانِ عمل ، ترک امر بالمعروف، فتنۂ حیل واحتیال، قیاس غیر صالح، کلام بالرائے اور حب دنیا جیسی برائیوں کا خاص طور سے ذکر کیا ہے اور اُن کی بھر پور مذمت کی ہے۔ اس بارے میں مولانا آزاد کا رویہ اتنا شدید ہے کہ وہ ایک دنیا پرست عالم کو ایک دنیادار فاسق سے بھی برا سمجھتے ہیں کیونکہ ثانی الذکر کی برائی اپنے تک محدود رہتی ہے جب کہ اول الذکر کی برائی دوسرے لوگوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتی ہے اور اُس کی برائی میں اُس کا غرور نفس بھی شامل ہوجاتا ہے۔'' ۵۳؎

مولانا آزاد نے انہیں علمائے سو کے ظلم وتعصب ، پرخاش وعناد، دنیاداری ، ہوس پرستی، اقتدار پسندی، حکمرانِ وقت کی حاشیہ برداری کو خوب اُجاگر کیا ہے۔ اُس کے مقابلے میں علمائے حق کے عزم وثبات، علم وعمل ، بزرگی وتقدس، حق پرستی کی خاطر فقر وفاقہ ، قید وحبس، خدا پرستانہ اور حق شناسانہ کارناموں کو خوب آشکارا کیا ہے۔

بقول پروفیسر محمد مجیب:۔

''..... وہ (مولانا آزاد) اپنی تمام انشاء پردازی کی قوت کو ایسے لوگوں کی بزرگی اور علوء مرتبت بیان کرنے میں صرف کرتے ہیں جیسے شیخ علائی (و۔۱۵۵۰) شیخ نیازی، شیخ جمال الدین، جنہوں نے کلمہ حق کی حمایت کی اور زمانہ ساز علماء مثل مولانا عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی کی فاسقانہ اور تباہ کن حکمت عملی کی مخالفت کی۔

یہ دونوں علماء اس طبقہ کے تھے جس نے شریعت اسلامی میں غیر واقعی تاویلات ،غلط اجتہاد اور پاکیزہ اخلاق کے اصولوں سے عدم توجہی کو داخل کر دیا۔ مولانا آزاد ان ہی حالات کا اعادہ اور تکرار اکبر کے زمانہ میں دیکھتے ہیں جو اس سے پہلے زمانوں میں اللہ والوں کو برداشت کرنا پڑے۔ جیسے امام حسین علیہ

اسلام، شیخ سعید ابن مصعب ، امام مالک ، امام حنبل ، امام ابن تیمیہ وہ اپنے
زمانہ میں شک ، تذبذب اور بے دینی کی لعنت دیکھتے ہیں اور اس کو ایسے شغف
، سرجوشی اور کمال وثوق سے بیان کرتے ہیں کہ اس کی مثال اردو ادب میں نہیں
ہے۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اعلائے حق کرنے والے ہندوستان
میں اکیلے نہیں ہیں بلکہ ان شخصیتوں کے علاوہ جن کا ذکر آیا ہے۔ شیخ سلامی (
و ۱۵۴۷) شیخ داؤد (و ۱۵۷۴) شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ وغیرہ نے اس
سے پہلے حمایتِ حق کی۔"۳۶

مولانا آزاد شیخ جمال الدین اور شیخ داؤد کے حالات زندگی پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے اُن
کے متعلق جو رائے قائم کرتے ہیں اُس کا ماحصل یہ ہے:۔

"حقیقت یہ ہے کہ حضرت شیخ جمال الدین اور شیخ داؤد رحمہا اللہ کے علم وعمل اور
بزرگی وتقدس کے جو شواہد تاریخ میں موجود ہیں ، اگر ان میں سے ایک بھی
ہمارے سامنے نہ ہوتا اور صرف اتنا ہی معلوم ہوتا کہ انہوں نے مخدوم الملک کی
مخالفت اور شیخ نیازی وعلائی کی حمایت کی تھی اور میر محمد جون پوری کی توصیف
وتوثیق میں علانیہ ایک کتاب لکھی تھی ، تو ان کی بڑی سے بڑی بزرگی اور اعلی
سے اعلی عظمتِ حقانی وعزت جاودانی کے لئے صرف یہی ایک واقعہ بس کرتا
تھا۔"۳۷

علمائے حق کے بارے میں مولانا کی عقیدت ومحبت اور اُن کے ایثار وقربانی کا تجزیہ کرتے
ہوئے پروفیسر ریاض الرحمان خاں شیروانی یوں رقم طراز ہیں:۔

'علمائے سو کے مقابل علماء حق کے جن اوصاف حمیدہ کو مولانا آزاد نے اُجاگر کیا
ہے وہ توسط واقتصاد ، ثبات فی سبیل الحق، عزیمت دعوت ، مرتبہ
صدیقیت ، پیروی طریق سنت، حکمت بالغہ، تجدید واحیائے ملت، طمع وخوف

سے بے نیازی، جستجوئے حقیقت، وارثت کاملہ نبوت ہیں۔ اوران کے لئے
مولانا نے مجموعی طور پر صراط مستقیم کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ انہوں نے
دعوت اور عزیمت دعوت میں فرق اور عزیمت دعوت پر اصرار کیا ہے اور اس کا
سب سے اعلیٰ نمونہ امام حسین کو بتایا ہے۔ ان کے نزدیک طریق سنت کی پیروی
ساری روحانی بیماریوں کا بے خطا علاج ہے۔'' ۳۸؎

مقام عزیمت ودعوت:۔ علمائے حق و علمائے سوء کی بحث کے بعد مولانا مقام عزیمت ودعوت پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہیں جسے قرآن حکیم نے ''عزم الامور'' سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن کریم کی آیات کی روشنی میں عزیمت ودعوت کے مقام پیقائم رہنے والے طبقات صالحین، شھداء، صدیقیت کے مقام ومرتبے کو خوب آشکارا کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

''٠٠٠٠ یہی وہ طبقات ثلاثہ اعمالِ انسانیت کا آخری اور اعلیٰ طبقہ ہے جو صرف وصول الی الحق ہی پر قانع نہیں ہوجاتا بلکہ جادۂ حق میں سب سے آگے نکل جانا اور بڑھ جانا چاہتا ہے اور جس کا مرتبہ اصحابِ ''اقتصاد'' سے بھی مافوق وارفع ہے۔ اور یہی مقام ہے جو ایک دوسری تقسیم میں مرتبۂ ''صالحین'' سے مرتفع ہوکر مرتبۂ شہداء'' یعنی شاہدینِ حق تک پہنچتا اور پھر ''صدیقیت'' تک پہنچ کر انسانیتِ کبریٰ کے آخری نقطۂ علو وارتفاع، ومرکزِ دائرۂ نوع ومبدء کمال وارتقائے بشری یعنی مقامِ نبوت سے ملحق ہوجاتا ہے کہ کائناتِ ارضی اور نوع انسانی میں جماعتِ من انعم اللہ علیہم ان چار قسموں سے باہر نہیں: مِنَ النَّبِيِّيْنَ والصِّدِّيْقِيْنَ وَالصَّالِحِيْنَ وَ حَسُنَ أُولٰئِكَ رَفِيْقاً۔ اور پھر یہی وہ مرتبۂ اعلیٰ اور درجۂ کبریٰ مجملہ اقسامِ ثلاثہ السَّابِقُوْن السَّابِقُوْن'' کا ہے جو اصحابُ الْمَيْمَنَةِ سے بھی بلند تر ہے۔ اور سبقت واقدام اور اولیت وارفعیت صرف اُسی کے حصے میں آئی ہے۔'' ۳۹؎

پھراس طبقاتِ ثلاثہ یعنی صالحین، شاہدین اور صدیقیت کے فرق مراتب اور عزائم دعوت پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہیں۔اس سلسلے میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ایک حدیث نقل کرتے ہیں:۔

''تم میں سے جب کبھی کوئی شخص برائی کو دیکھے تو چاہیے کہ اپنے ہاتھ سے کام لے کر اُس کو دور کردے۔اگر اس کی طاقت نہ پائے تو زبان سے،اگر اُس کی بھی طاقت نہ پائے تو دل سے،اور یہ آخری درجہ ایمان کی بڑی ہی کمزوری کا درجہ ہے اور یہ آخری درجہ ضعیف الایمان کا ہوا۔اُسی طرح پہلا درجہ اقویٰ واشغل کمال مرتبۂ عزیمت ودعوت کا ہوا۔''[۳۹]

آگے چل کر اس حدیث مبارکہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''••••• ایسے لوگوں کے خلاف جس کسی نے قیام حق وسنت کی راہ میں اپنے ہاتھ سے کام لیا۔وہ مومن ہے؛ جو ایسا نہ کرسکا،مگر زبان سے کام لیا، وہ بھی مومن ہے؛ جس سے جہادِ لسانی بھی نہ ہوسکا،صرف دل کے اعتقاد اور نیت کے ثبات کو ان کے خلاف کام میں لایا، وہ بھی مومن ہے؛لیکن اس آخری درجہ کے بعد ایمان کا کوئی درجہ نہیں،حتیٰ کہ رائی برابر بھی ایمان نہیں ہوسکتا۔''تو اس حدیث میں بھی وہی تین درجے ہیں۔پہلا درجہ اصحابِ عزیمت کا، دوسرا اصحابِ رُخص کا،تیسرا ضعفائے طریق کا وذالک اضعف الایمان. اور اس آخری درجے پر ایمان کی سرحد ختم ہوجاتی ہے۔''[۴۰]

صدیقیت کے مقام ومرتبے کو ایک مثال دے کر اس طرح اُجاگر کرتے ہیں:۔

''صدیقیت کی مثال اُس نہایت قوی بصارت کی سی ہے جو سب سے پہلے دور کی چیز دیکھ لیتی اور باریک سے باریک ذرہ کو ڈھونڈ نکال لیتی ہے، حالانکہ دوسری کمزور آنکھیں اس وقت دیکھتی ہیں جب وہ چیز بالکل سامنے آجاتی ہے،

یا اُجالا بہت زیادہ ہو چکتا ہے۔ یا صدیقین کے قلب کو تزکیۂ فطرت و استعدادِ اثر پذیری کی وجہ سے ایک ایسا مصفا آئینہ تصور کرنا چاہئے جس میں جمالِ نبوت وحسنِ حقیقت سب سے پہلے پرتو افگن ہو جاتا ہے کیونکہ کمالِ جلا و صفا کی وجہ سے کوئی چیز انعکاس میں مانع نہیں ہوتی۔ و ما احسن ماینسب الی مجنون:

اتانی هوا ما قبل ان اعرف الهویٰ

فصادف قلباً خالیاً فتمکنا

آئینے اور بھی ہزاروں ہوتے ہیں اور بوجہ آئینہ ہونے کے اصلاً انعکاس کے لئے مستعد، لیکن کثافت و زنگ کی وجہ سے فوراً عکس قبول نہیں کر سکتے اور کچھ عرصے کی صفائی و تزکیہ کے محتاج ہوتے ہیں۔ پھر زنگ و کثافت کی بھی مختلف حالتیں اور مختلف مراتب ہیں۔ کوئی آئینہ جلد صاف ہو جاتا ہے، کوئی حال اور جس شکل میں نبی چھوڑ گیا ہے، اس کو بعینہٖ محفوظ رکھتے، اور اس میں ذرا بھی فرق آنے نہیں دی۔ بہت دیر میں اور کسی کا زنگ اس درجہ تک پہنچ چکا ہوتا ہے کہ صاف ہونے کی کوئی امید باقی نہیں رہتی، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت علی، خدیجۃ الکبریٰ، سلمان فارسی ابوذر رضی اللہ عنہم کے آئینہ مجلیٰ و مصفیٰ نے کس طرح اول نظر ہی میں عکس قبول کر لیا تھا؟ یہ صدیقیت تھی جو جمالِ نبوت دیکھتے ہی پکار اٹھی۔ واللہ ماهذا بوجه کذاب." ۴۲ ۔

مولانا علم سے زیادہ عمل پر زور دیتے ہیں اور ہر میدان عمل میں ایک درجہ عزیمت کو قرار دیتے ہیں لہذا وہ دعوت اور عزیمت دعوت میں فرق اور عزیمت دعوت پر اصرار کرتے ہوئے یہ باور کرتے ہیں کہ ہر عہد میں اللہ تعالیٰ کسی ایک بندے یا چند بندوں ہی کو مقام عزیمت دعوت سے نوازتا ہے اور وہ اپنے دور کے خزائن فیضان و برکات کی کنجی اسی کے قبضے میں دے دی جاتی ہے لیکن اس سے یہ مطلب نہیں لینا چاہئے کہ اس عہد میں بجز ایک زبان کے کلمۂ حق کسی دوسری زبان

پر جاری نہیں ہوتا یا اُس عہد میں اور کوئی دعوت وتبلیغ حق کے ساعی وجاد نہیں ہوتا۔

مولانا اس نکتے کی طرف بھی نشان دہی کرتے ہیں کہ اس اصل الاصول کو کسی حال میں بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ دعوت وقیام حق اور اصلاح وتربیت امم کا سر چشمہ ومرکز مقام نبوت اور ہر عہد ودور میں اس کا جس قدر بھی ظہور ہوتا ہے وہ سب اسی مقام سے متصل اور ملحق ہیں۔ اور تمام عوازم امور دعوت اسی سے ماخوذ اور اُسی کے اُسوہ سے متاسی۔ وہ ختم نبوت کے دل سے قائل ہیں اور اُس کے بغیر ایمان کو نامکمل قرار دیتے ہیں۔ طریق سنت کی پیروی کو ساری روحانی بیماریوں کا علاج گردانتے ہیں۔

مولانا نے تاریخ اسلام کے حوالے سے اس نکتے کی بھی نشان دہی کی ہے کہ ہر دور میں عامۂ علماء وصلحائے اُمت کی ایک بہت بڑی جماعت موجود تھی اور اُن کا فضل وکمال اور ورع تقویٰ بھی ہر طرح مسلّم وثابت ہے لیکن اس عہد کی عزیمت دعوت اور تجدید ملت کے مرتبۂ مخصوص میں اُن کا کوئی حصہ نہ ہوا اور نہ ہی اس راہ میں قدم بڑھانے کی جراُت ہی کر سکے۔ مولانا نے عزیمت و دعوت کا سب سے اعلیٰ نمونہ حضرت امام حسینؓ کا بتایا ہے جنہوں نے بدعات ومحدثاتِ بنوامیہ کے مقابلے میں سرفروشانہ اقدامِ عزیمت پیش کرتے ہوئے زمین کو اپنے خونِ شہادت سے لالہ زار بنا دیا۔ اُسی طرح عبدالملک بن مروان کے زمانے میں یہ سعادت سید التابعین حضرت سعید بن المسیب کے حصے میں آیا جنہوں نے اتباع سنت وقیام حق کی راہ میں سو دڑوں کی ضرب مردانہ وار برداشت کیے۔ منصور عباسی کے عہد میں ثبات حق اعتقاد کا یہ مقام عزیمت امام دارالہجرت حضرت مالک بن انسؓ کے حصے میں آیا۔ مولانا لکھتے ہیں:۔

> ''منصور عباسی کے عہد میں کون کہہ سکتا ہے کہ شاہانِ جور کے مقابلے میں ثباتِ حق اعتقاد کا جو مقام عزیمت امام دارالہجرت حضرت مالک بن انسؒ کو بضمن مسئلہ یمین وطلاقِ مکرہ ملا، وہ تو صرف انہی کے لئے تھا! یہ کیا چیز تھی کہ عین اس وقت جب کہ مشکیں اس زور سے کس دی گئی تھی کہ ہاتھ بازو سے اکھڑ گیا تھا

اور ستر کوڑوں کی ضربیں ان کے جسمِ اقدس پر پڑ رہی تھیں۔تو اُسی اونٹ کی پیٹھ
پر کھڑے ہو گئے جس پر تذلیل و تشہیر کے لئے سوار کیا گیا تھا۔اور پکار کر کہا۔
من عرفنی فقد عرفنی و من لم یعرفنی فانا مالک بن انس اقول
ان الطلاق المکرہ لیس بشیء !یعنی جو مجھ کو جانتا ہے سو جانتا ہے،اور
جو نہیں جانتا ہے تو جان لے کہ میں ہوں مالک، انس کا بیٹا،اور اُسی مسئلے کا
اعلان کرتا ہوں جس کے اعلان سے مجھ کو جبراً روکا جا رہا ہے کہ طلاق مکرہ کوئی
چیز نہیں! سبحان اللہ یہ وہی مقام عزیمت کبریٰ کی شاہی اور فرمانروائی تھی،جس
کے آگے دنیا کی پادشاہتیں بالِ مگس کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتیں۔" ۴۳۔

فتنہ اعتزال اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ:۔

مولانا آزاد نے عزیمت دعوت کے سلسلے میں بہت تفصیلی طور پر تیسری صدی کے اوائل میں اُبھرنے والے فتنہ اعتزال و تعمق فی الدین اور بدعت مضلہ تکلم بالفلسفہ و انحراف از اعتصام بالسنۃ کے فتنوں پر بحث کی ہے۔مولانا اس فتنہ کو فتنۂ ارتداد (بعہد حضرت ابوبکر) کے بعد دوسرا بڑا فتنہ گردانتے ہیں جن کی سرپرستی تین عظیم الشان فرماں رواؤں یعنی مامون رشید، معتصم باللہ اور واثق باللہ کی حاصل تھی۔ان کے دور اقتدار میں اس فتنے نے سر اُٹھایا۔مولانا اس تاسف کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ اس عہد میں بھی ایک سے ایک اساطینِ علم و فن اور اکابر فضل و کمال موجود تھے۔بغداد اس زمانے میں اہل سنت و حدیث کا مرکز بھی تھا لیکن شاہانِ جور اور شمشیر استبداد و قہر حکومت کے مقابلے میں ثباتِ حق و اعتقاد اور اتباع سنت کی راہ میں قدم بڑھانے کی جرأت نہ کر سکے۔یہ مقام و مرتبہ،عزیمت و دعوت و کمال مرتبۂ وراثتِ نبوت و قیام حق و ہدایت فی الارض و لامت کی سعادت صرف اور صرف سید المجد دین و امام المصلحین حضرت امام احمد بن حنبلؒ کو نصیب ہوئی ۔مولانا آگے چل کر لکھتے ہیں کہ آشوب و ابتلاء کا یہ ایسا دور تھا جس میں مامون و معتصم باللہ کے جبر و قہر سے بچنے کے لئے علماء حق کے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو اصحاب بدعت کے آگے سر جھکا

دے

اور مسئلہ خلق قرآن پر ایمان لا کر ہمیشہ کے لئے اس کی نظیر قائم کر دیں کہ شریعت میں صرف اُتنا ہی نہیں ہے جو رسول نے بتلایا ہے بلکہ اُس کے علاوہ بھی بہت کچھ کہا اور کیا جا سکتا ہے اور ہر ظن کو اس میں دخل ہے۔ یا پھر دوسرا راستہ یہ تھا کہ حق بات کہہ کر قید خانے میں رہنے اور ہر روز کوڑے سے پیٹے جانے اور تہہ خانوں میں بند ہو جانے کو قبول کر لیں۔ مولانا لکھتے ہیں:۔

''بہتوں کے قدم تو ابتدا ہی میں لڑکھڑا گئے۔ بعضوں نے ابتدا میں استقامت دکھائی لیکن پھر ضعف و رخصت کے گوشے میں پناہ گیر ہو گئے۔ عبداللہ بن عمر القواریری اور حسن بن حماد امامِ موصوف کے ساتھ ہی قید کئے گئے تھے، مگر شدائد ومحن کی تاب نہ لا سکے اور اقرار کر کے چھوٹ گئے۔ بعضوں نے روپوشی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی کہ کم سے کم اپنا دامن تو بچا لے جائیں۔ کوئی اس وقت کہتا تھا۔ یہ زمانہ درس و اشاعتِ علوم و سنت کا نہیں ہے یہ تو وہ زمانہ ہے بس اللہ کے آگے تضرع وزاری کرو ایسے دعائیں مانگو جیسے سمندر میں ڈوبتا ہوا شخص دعائیں مانگتا ہے کوئی کہتا تھا اپنی زبانون کی نگہبای کرو اپنے دل کے علاج لگ جاؤ، جو کچھ جانتے ہو اس پر عمل کئے جاؤ، اور جو برا ہو اس کو چھوڑ دو! کوئی کہتا یہ زمانہ خاموشی کا زمانہ ہے اور اپنے اپنے دروازوں کو بند کر کے بیٹھ رہنے کا جب کہ یہ تمام اصحابِ کار وطریق کا یہ حال ہو رہا تھا اور دین الخالص کا بقاء و قیام ایک عظیم الشان قربانی کا طلبگار تھا، تو غور کرو کہ صرف امامِ موصوف ہی تھے جن کو فاتح و سلطان عہد ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ انہوں نے نہ تو دعاتِ فتن و بدعت کے آگے سر جھکایا، نہ روپوشی و خاموشی و کنارہ کشی اختیار کی اور نہ صرف بند حجروں کے اندر دعاؤں اور مناجاتوں پر قناعت کر لی، بلکہ دینِ خالص کے قیام کی راہ میں اپنے نفس و وجود کو قربان کر دینے اور تمام خلفِ امت کے لئے

ثبات واستقامت علی السنۃ کی راہ کھول دینے کے لئے بہ حکم فاصبر کما صبرا ولوالعزم من الرسل. اٹھ کھڑے ہوئے۔''۴۴(الف)

نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کو قید کرلیا گیا۔قید خانے میں چلے گئے۔چار بوجھل بوجھل بیڑیا پاؤں میں ڈالی گئیں اور اسی عالم میں بغداد سے طرطوس جایا گیا۔بغیر کسی کی مدد سے اونٹ پر سوار ہونے اور اونٹ سے اُترنے کا حکم دیا گیا۔اُس کو بھی قبول کیا۔رمضان المبارک کے عشرہ اخیر میں بھوکے پیاسے جلتی دھوپ میں بٹھائے گئے۔اور اُس پیٹھ پر جو علوم ومعارفِ نبوت کی حامل تھی، لگاتار کوڑے اس طرح مارے گئے کہ ہر جلاد دو ضربیں پوری قوت سے لگا کر پیچھے ہٹ جاتا اور پھر نیا تازہ دم جلاد اُس کی جگہ لیتا۔اُس کو بھی خوشی خوشی برداشت کرلیا مگر اللہ کے عشق سے منہ نہ موڑا اور نہ ہی راہِ سنت سے منحرف ہوئے۔تازیانے کی ہر ضرب پر جو صدا زبان سے نکلتی تھی وہی تھی جس کے لئے یہ سب کچھ ہو رہا تھا یعنی القرآن کلام اللہ غیر مخلوق الله۔مولانا نے جس ولولے اور اضطراب سے اُس وقت کی تصویر الفاظ کے وسیلے سے کھینچی ہے وہ اُن کے دل مضطرب اور بے چین روح کا پتہ دیتی ہے۔دیکھئے یہ تراشہ:۔

> ''اللہ اللہ یہ کیسی مقام دعوتِ کبریٰ کی خسروی وسلطانی تھی اور وراثت ونیابتِ نبوت کی ہیبت وسطوت کہ خود المعتصم باللہ جس کی ہیبت ورعب سے قیصر روم لرزاں وترساں رہتا تھا۔سر پر کھڑا تھا، جلادوں کا مجمع چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔اور وہ بار بار کہہ رہا تھا.یا احمد !والله انی علیک لشفیق ،وانی لا شفق علیک کشفقتی علی هارون ابنی ، و والله لئن اجابنی لاطلقن عنک بیدی.ماتقول؟ یعنی واللہ میں تم پر اس سے بھی زیادہ شفقت رکھتا ہوں جس قدر اپنے بیٹے کے لئے شفیق ہوں۔اگر تم خلقِ قرآن کا اقرار کرلو تو قسم خدا کی ابھی اپنے ہاتھوں سے تمہاری بیڑیاں کھول دوں۔لیکن اُس پیکرِ حق،اُس مجسمہ سنت،اُس مؤید بالروح القدس،اس

صابراعظم کـمـاصبـر اولـو العزم من الرسل کی زبان صدق سے صرف

یہی جواب نکلتا تھا۔اعـطـونی شیئا من کتاب الله وسنة رسوله حتی

اقـول بـه اللہ کی کتاب میں سے کچھ دکھلا دو، یا اس کے رسول کا کوئی قول پیش

کردو، تو میں اقرار کرلوں، اس کے سوا میں اور کچھ نہیں جانتا!

چو غلام آفتا بم ہمہ ز آفتاب گویم

نہ شبم، نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم ۴۴(ب)

امام موصوف کو جب قید کر کے طرطوس روانہ کیا گیا تو ابوبکر الاحوال نے پوچھا کہ اگر تلوار کے نیچے کھڑے کردیئے گئے تو مان لوگے۔امام نے کہا نہیں۔مولانا نے ابراہیم بن مصعب کوتوال کا ایک قول نقل کیا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ ''میں نے کسی انسان کو بادشاہوں کے آگے احمد بن حنبل سے بڑھ کر بارعب نہ پایا ہم عمال حکومت اُن کی نظر میں مکھیوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے تھے اور یہ بالکل حق ہے۔ابن جوزی کی ایک روایت نقل کرتے ہوئے مولانا کہتے ہیں کہ جب امام موصوف رقہ میں قید تھے تو عطار کی ایک جماعت گئی اور اس قسم کی روایت ونقول سنانے لگی جن سے بخوف جان تقیہ کر لینے کی رخصت نکلتی ہے لیکن امام موصوف نے انکار کرتے ہی ایک حدیث کا حوالہ دیا۔

جس میں صحابہ کرام نے جب آنحضرت صلعم سے مظالم وشدائد کی شکایت کی تو آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ تم سے پہلے ایسے لوگ گذر چکے ہیں جن کے سروں پر آرہ چلایا جاتا تھا اور جسم لکڑی کی طرح چیر ڈالے جاتے تھے مگر یہ آزمائشیں بھی اُن کو حق سے نہیں پھرا سکتی تھیں۔حافظ ابن جوزی کے حوالے سے مولانا لکھتے ہیں کہ جب معتصم باللہ نے جلادوں کو ضرب تازیانہ کے لئے حکم دیا تو اس وقت امام موصوف نے پانی کے چند گھونٹ پی کر روزہ رکھ لیا تھا، سفر تازہ دم جلادوں نے پوری قوت سے کوڑے مارے۔یہاں تک کہ تمام پیٹھ زخموں سے چور ہوگئی اور تمام جسم خون سے لہولہان ہوگیا۔بیہوشی کی کیفیت طاری ہوگئی اور جب ہوش آیا تو لوگ پانی لے کر آئے کہ پی لو لیکن اُنہوں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ روزہ نہیں توڑ سکتا۔اسحاق بن ابراہیم کے مکان پر لے جایا گیا

۔جسم لہولہان تھا اسی حالت میں ظہر کی نماز کا وقت آ گیا۔ ابن ساعہ نے امامت کی اور انہوں نے نماز ادا کی۔ نماز کے بعد ابن ساعہ نے اس کی طرف اشارہ کیا تم نے نماز تو پڑھ لی لیکن کپڑے میں خون کے بہنے سے طہارت کہاں باقی رہی۔ امام موصوف نے جواب دیا کہ حضرت عمرؓ پر وار صبح کی نماز پڑھانے کے دوران ہی ہوا تھا۔ قاتل نے زخمی کیا مگر اُسی حالت میں انہوں نے نماز پوری انبساط کے ملے جلے تیور میں ادا کی، مولانا لکھتے ہیں:۔

''ابن ساعہ کے جواب میں حضرت امام نے حضرت عمر کی جو نظیر پیش کی تو یہ اُن کی تشفی کے لئے بس کرتی تھی مگر میں کہتا ہوں کہ جو خون اس وقت امام احمد بن حنبلؒ کے زخموں سے بہہ رہا تھا اگر وہ خون ناپاک تھا اور اس کے ساتھ نماز نہیں ہو سکتی، تو پھر دنیا میں اور کونسی چیز ایسی ہے جو انسان کو پاک کر سکتی ہے، اور کونسا پانی ہے جو طاہر و مطہر ہو سکتا ہے! اگر یہ ناپاک ہے، تو دنیا کی تمام پاکیاں اس ناپاکی پر قربان! اور دنیا کی ساری طہارتیں اس پر سے نچھاور! یہ کیا بات ہے کہ پاک سے اور مقدس سے مقدس انسان کی میت کیلئے بھی غسل ضروری ٹھہرا کہ اغسلوہ بماء و سدرو کفنوہ فی ثوبین مگر شہیدانِ حق کے لئے یہ بات ہوئی کہ ان کی پاکی شرمندہ آبِ غسل نہیں لم یصل علیھم ولم یغسلھم. بلکہ ان کے خون میں رنگے ہوئے کپڑوں کو بھی اُن سے الگ نہ کیجئے۔ یدفنو فی ثیابھم و دمائھم اور اسی لباس گلگوں و خلعتِ رنگیں میں وہاں جانے دیجئے جہاں اُن کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ اور جہاں خونِ عشق کے سرخ دھبوں سے بڑھ کر شاید اور کوئی نقش و نگارِ عمل مقبول و محبوب نہیں عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ فَرِ حِيْنَ بِمَا آتَاهُمُ الله!

خوں شہیداں راز آب اولیٰ تر ست
ایں گناہ از صد ثواب اولیٰ تر ست

اللہ اللہ! یہاں طہارتِ جسم ولباس کا کیا سوال ہے؟ امام احمد بن حنبل نے اپنی تمام عمر میں اگر پاک سے پاک اور سچی نماز پڑھی تھی، تو یقیناً وہ وہی ظہر کی نماز تھی۔ ان کی تمام عمر کی وہ نمازیں ایک طرف جو دجلہ کے پانی سے پاک کی گئیں تھیں۔ اور وہ چند گھڑیوں کی عبادت ایک طرف جس کو راہِ ثباتِ حق میں بہنے والے خون نے مقدس ومطہر کر دیا تھا! سبحان اللہ! جس کے عشق میں چار چار بوجھل بیڑیاں پانوں میں پہن لی تھیں۔ جس کی خاطر سارا جسم زخموں سے چور اور خون سے رنگین ہو رہا تھا، اسی کے آگے جبینِ نیاز جھکی ہوئی! اسی کے ذکر میں قلب ولسان لذت یابِ تسبیح وتحمید! اسی کے جلوۂ جمال میں چشمِ شوق وقفِ نظارہ ودید! اور اُسی کی یاد میں روحِ مضطر محو وسرشارِ عشق وخود فراموشی!'' ۴۵؎

آگے چل کر امام موصوف کے لڑکے عبداللہ کے حوالے سے ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ امام ہمیشہ ''خدا ابوالہیثم پر رحم کرے''، ''خدا ابوالہیثم کو بخش دے''۔ فرماتے رہتے ہیں۔ ایک دن عبداللہ نے پوچھا کہ ابوالہیثم کون ہے؟ امام نے فرمایا کہ ایک چور اور عیار شخص تھا، مجھے جب سپاہی دربار میں لے جا رہے تھے۔ تو وہ ملا اور اپنا تعارف پیش کرتے ہوئے بتایا کہ بارہا چوری کی سزا کاٹ چکا ہے۔ بڑی بڑی سزائیں جھیلیں۔ اٹھارہ ہزار کوڑوں کی ضرب سہہ چکا ہوں لیکن استقامت دیکھئے کہ چوری سے باز نہ آیا۔ شیطان کی اطاعت میں میں رہا ہوں، دنیا کی خاطر۔ اگر اللہ کی راہ میں اتنی استقامت بھی نہ دکھا سکو تو افسوس ہے اور دینِ حق کی خاطر چند کوڑے بھی نہ برداشت کر سکو تو افسوس ہے۔ امام موصوفؒ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے جی میں کہا کہ دنیا کی خاطر اگر ایک چور اور ڈاکو اتنا کر رہا ہے۔ اگر حق کی خاطر میں اتنا بھی نہ کر سکوں تو ہماری بندگی پر ہزار حیف ہماری خدا پرستی سے بت پرستی لاکھ درجہ بہتر۔

حافظ ابن جوزی نے محمد بن اسماعیل کے حوالے سے ایک قول نقل کیا ہے کہ احمد بن حنبل کو اسی کوڑے ایسے سخت مارے گئے کہ اگر ہاتھی کو بھی مارے جاتے تو چیخ اُٹھتا مگر اس کو وہ عزم نے اُف

تک نہ کی۔ جب تک ہوش میں رہا۔ ہر ضرب پر یا تو وہی جملہ زبان سے نکلتا رہا جس کے لئے یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ القرآن کلام اللہ غیر مخلوق اور یا یہ آیۃ کریم لن یصیبنا الا ما کتب اللہ علینا۔ امام موصوف نے ان گنت مصائب و آلام میں صبر و استقامت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ علماء سو کی حیلہ سازیوں کی قلعی کھول دی اور ظالم و جابر حکمرانوں کے ظلم و استبداد کو بے باکی سے چیلنج کیا اور تن تنہا قرآن کے غیر مخلوق ہونے کی صداقت پر ایمان کو وقت کے مسلم معاشرے میں اور زیادہ مضبوط و مستحکم بنا دیا۔ بقول مولانا آزاد:۔

"فی الحقیقت حضرت امام موصوف کی نسبت محمدی اور کمال مرتبہ تاسی باسوۂ نبوت کی یہی وہ شان وجلالت ہے جس نے ان کو تمام ائمہ و مجددین امت کی صفوفِ مراتب و کمال سے بلند کر کے ایک دوسرے ہی مقام پر پہنچا دیا ہے، حتی کہ تمام ائمہ اسلام میں یہ فضلِ مخصوص صرف اُنہی کے حصے میں آیا کہ ان کی محبت و پیروی اہلِ حق و سنت ہونے کی دلیل ٹھہری اور اُن سے انحراف بدعتی ہونے کی سب سے بڑی پہچان! اللہ تعالی نے ان کو فنافی السنۃ ہونے کا وہ مرتبہ عطا فرمایا کہ کمال استغراق و تفانی کی وجہ سے خود ان کی ذاتِ گرامی ہی یکسر سنت و اتباع سنت کا پیکر و مجسمہ بن گئی۔"[٦٣]

علامہ ابن تیمیہؒ:۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف "تذکرہ" میں عزیمت و دعوت کا ایک اہم سلسلہ حضرت شیخ الاسلام تقی الدین ابن تیمیہؒ کی عزیمت و روداد اصلاح و دعوت پر مختص ہے۔ امام ابن تیمیہ کا ایک مستقل تجدیدی کارنامہ جو اُن کو معاصرین میں امتیازی مقام عطا کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اُنہوں نے فکر اسلامی کا احیاء کیا۔ اُنہوں نے اس بات پر زور دیا کہ عقائد کا ماخذ وحی و نبوت اور کتاب و سنت کو بنایا جائے اور اُنہی کے نصوص کو اس بارے میں معیار کا درجہ دیا جائے۔ بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی:۔

"۰۰۰۰ اُنہوں نے (علامہ ابن تیمیہ) فکر اسلامی کو طاقت و تازگی بخشی جو فلسفہ و

علم کلام اور عجمی روح سے بہت کچھ مجروح و مضمحل ہوگئی تھی۔"[۷۲]

علامہ ابن تیمیہ مولانا آزاد کے ہیرو تھے اور اُنہیں روحانی رہنما گردانتے تھے۔ مولانا نے ساتویں اور آٹھویں صدی کی مردم خیزی اور مردم آفرینی کا ذکر کرتے ہوئے تفصیلی گفتگو کی ہے کہ یہ وہ عہد ہے جب عالم اسلام میں اصحاب کمال اور اکابر علماء و شیوخ کے وجود سے پوری اسلامی دنیا جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ بقول مولانا:۔

"•••••• بڑے بڑے حفاظ نقادِ علوم اور خواص واعاظم نظر و اجتہاد موجود تھے جن کے بعد اس درجہ کے لوگ تمام عالمِ اسلامی میں پیدا نہیں ہوئے۔ ابوالفتح ابن سید الناس اشبیلی، شمس الدین مقدسی، ابوالعلاء انصاری السبکی، قاضی ابن الزملکانی، سید ابوالمحاسن دمشقی، ابوعبداللہ حریری، ابوالعباس ابن عمر الواسطی، حافظ ابوالفدا ءعمادالدین، حافظ احمد بن قدامہ مقدسی، ابواسحاق السعدی، امام برہان الدین الفراری، حافظ صلاح الدین بعلبکی، شیخ صفی الدین البغدادی، حافظ ابن شامہ دمشقی، قاضی تقی الدین وتوقی، شیخ عمر بن الوردی، امام ابوالعباس بن حجی، حافظ جمال الدین عقیلی، حافظ برزالی الاشبیلی، تقی الدین السبکی، حافظ جمال الدین المزی، امام تقی الدین ابن دقیق العید، ابوحیان صاحب تفسیر، حافظ ابو عبداللہ الذہبی، اور ان کے علاوہ بے شمار ائمہ و اعلام عہد جن کے حالات حافظ ذہبی اور ابن قدامہ و عسقلانی کی مصنفات میں موجود ہیں۔ تو تم اِن لوگوں کی نسبت کیا سمجھتے ہو؟ کون ہے، جو ان بزرگوں کے فضل و کمال و ورع و تقویٰ اور اتباعِ حق و سداد سے انکار کر سکتا ہے؟ علی الخصوص حافظ مزی، برزالی، ابنِ دقیق العید، ور حافظ ذہبی تو اس پایہ کے بزرگ تھے، کہ ان میں سے ہر شخص علوم سنت کا خزانہ اور حفظ و نقد کا امیر المومنین تھا۔ علمائے حدیثِ متاخرین میں سے کسی مصنف کا بھی ہم اخلافِ امت و بے چارگانِ دورۂ آخر پر اس درجہ احسان نہیں

ہے جس قدر حافظ ابن حجر عسقلانی ہیں۔ یہی وہ دو حافظ و ناقدِ علوم حدیث ہیں جنہوں نے نہ صرف سلف کے ذخائر وخزائن خلف کے لئے محفوظ کر دیئے، بلکہ تمام مشکلات و معضلاتِ کار کو صاف کر کے اور ضبط اتقان، وتہذیب وترتیب وتلخیص وتشریح، ونقد رجال واسناد سے آراستہ و پیراستہ کر کے تمام آنے والی امت کے لئے اتباع سنت کی راہ بالکل سہل و آسان کر دی۔ علوم اسلامیہ پر پہلا دور تدوین کا گذرا ہے، اور دوسرا انضباط وتنقیح اور تہذیب وتنظیم کا۔ سو علم حدیث کے دورِ دوم میں ان دو بزرگوں کی خدمات سب پر فائق اور سب سے انفع واقع ہوئی ہیں۔ یہ اُنہی کی خدماتِ حسنہ کا نتیجہ ہے کہ علم تقدس اس قدر صاف اور سہل ہو گیا ہے کہ طالبین عمل بالسنۃ کے لئے کسی طرح کی عذر داری وبہانہ جوئی کی گنجائش باقی نہ رہی۔ امت کا کوئی فرد اب یہ نہیں کہہ سکتا کہ حدیث پر عمل کرنا بمقابلہ کتبِ جدل وخلاف وقال اقول وکذا عند زید وکذا عند فلان کے زیادہ مشکل ہے؛ بلکہ جس طالبِ صادق کا جی چاہے، آنکھیں بند کر لے اور اس صراطِ مستقیم پر بے غلو وغش و بے خوف وخطر دوڑتا چلا جائے۔

فهو طريقا مستقيما سهلا، مسلوكا، واسعا، موصلاً الى المقصود والمطلوب! ورضى الله عن الذهبى حيث يقول:

الفقه قال الله قال رسولى

ان صح، والاجماع فاجهدفيه

وحذر من نصب الخلاف جهالة

بين النبى وبين رأى فقيه!

پس غور کرو کہ ایسے اصحابِ کمال وائمہ علم تھے جو اس عہد میں موجود تھے۔ بایں ہمہ یہ حقیقت سورج کی طرح چمک رہی ہے اور ہر صاحبِ بصارت

پرورش کہ مقامِ عزیمتِ دعوت کا جو ایک مقامِ خاص ہے، وہ ان میں سے کسی
کے حصے میں بھی نہ آیا۔ وہ صرف شیخ الاسلام ابن تیمیہ ہی کے لئے تھا۔ سب
اپنے دوسرے دوسرے کاموں میں رہ گئے۔ لیکن انہوں نے وہ سب کام بھی
ان سے بہتر کئے جو وہ سب کر رہے تھے، اور پھر اُن سے بڑھ کر یہ کہ سب کو راہِ
عزیمتِ دعوت، وتجدید واحیاء ملت، ورفع اعلام سنت، واخمادِ شر وبدعت
وکشف وابرازِ معارفِ مستورۂ کتاب وسنت وغوامض وسرائر معارف وحکمتِ
نبوت، وانفجار ینابیع الحکمت من اللسان والجنان، وجہاد فی سبیل اللہ بالسیف
والقلم واللسان میں منزلوں اپنے پیچھے چھوڑ دیا اور علوم واعمالِ وہبیہ وسماویہ کی ان
بلندیوں پر تن تنہا جا کھڑے ہوئے جہاں اُن کے اقران ومعاصرین کے وہم و
تصور کو بھی بار نہیں۔'' ۴۸؎

اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ علمائے راسخین اور کتاب وسنت کے حاملین نے اس شرک صریح اور جاہلیت وشینہ کی مخالفت ضرور کی ہوگی لیکن یہ مخالفت صرف زبان اور قلم تک ہی محدود ہوگی۔ ایسے صورت حال کے خلاف علم جہاد بلند کرنے اور اپنے گرانقدر علمی مشاغل ومباحث کے باوجود اس فتنۂ کبریٰ کے مقابلے کے لئے میدان میں آنے والے تن تنہا مردِ آہن شخصیت حضرت علامہ ابن تیمیہؒ کی تھی۔ انہوں نے ایک طرف جہاں منگول حملہ آوروں کے خلاف مدافعت اور مزاحمت کی تنظیم کو استحکام بخشا تو دوسری طرف اپنے زمانے کے علماء کی اخلاقی خرابیوں اور مختلف صوفی سلسلوں کے پیروؤں کے غیر اعتدلانہ غیر متوازن اور غیر محتاط رویوں کی بیخ کنی کی۔ اُن کے اعمال ورسوم کو کتاب وسنت کے خلاف بتایا۔ اُنہیں تو ہدف ملامت بنایا ہی ساتھ ہی متکلمین وفلاسفۂ منطق کی جدلیات اور فلسفے کے مجرد تصورات کی سخت تردید اور تنقید بھی کی۔ الا للہ الدین الخالص کا آوازہ اس بلند آہنگی سے بلند کیا کہ ان کی آواز صحرا میں صبح کی اذان کی طرح گونجی اور عالم اسلام کے دشت وجبل اس سے گونج اُٹھے۔ بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی:۔

''...... درحقیقت اس فتنۂ عالم آشوب کے مقابلہ اور عقیدۂ توحید کی توضیح و تشریح اور احیاء و تجدید کے لئے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی جیسی طاقتور اور بلند شخصیت کی نیز ان مشرکانہ عقائد و رسوم کے تفصیلی جائزہ اور احتساب اور مدلل و پرزور تردید کی ضرورت تھی جو مسلم معاشرہ پر حاوی ہوتے جا رہے تھے۔ توحید کا مزاج ہی یہ ہے کہ وہ تاویل عوام کی رعایت کے ساتھ نہیں چل سکتی۔ اس کے لئے تو انبیاء علیہم السلام کی واشگاف تقریر اور فیصلہ کن اور غیر مبہم طرز خطابت کی ضرورت ہے جو بالکل ''فرقان'' کی شان رکھتا ہو۔ امام ابن تیمیہ نے اپنے زمانے میں نیابت الٰہی کا فرض انجام دیا اور فاصدر بما تومر واعرض عن المشرکین پر عمل کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان عقائد و رسوم میں جو جہالت غیر مسلموں کے اختلاط و صحبت اور فرق ضالہ اور اہل غرض سے پیدا ہوگئی تھی ایک عام تزلزل پیدا ہوگیا اسلام کا عقیدہ توحید جو انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد اور اُن کی دعوت کا نقطۂ مرکزی ہے ایک بار پھر نکھر کر اور منقح ہو کر سامنے آگیا......'' ۴۹

مولانا آزاد نے علامہ ابن تیمیہؒ کے معاصرین کا اُن کے تئیں نیک خیالات اور اُن کی علمی و دینی مرتبے و مقام کے اعتراف کا ذکر نہایت ہی مستند طور پر کیا ہے۔ ان میں ذہبی و رمزی، حافظ برزالی اور ابن جحی شیخ عمادالدین واسطی و ابن سید الناس، ابن نصر مقدسی اور ابن دقیع العبد ابن نصر اور ابو حیان وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

''اُن کے تمام معاصرین اس پر متفق ہیں کہ وہ نہ صرف جرح و تعدیل رجال کے امام تھے، بلکہ اس فن کے اماموں کے امام؛ ہزاروں انسانوں کی ثقاہت و عدم ثقاہت کا فیصلہ ان کے قبضۂ علم میں تھا۔ بااین ہمہ یہ مقامات اور ہیں، اور نسبتِ نبوت، و نیابت کاملۂ منصب رسالت، و عزیمتِ دعوت کبریٰ، و تشبہ

وتخلق بالانبیاء کا مقام دوسرا ہے، وہ تو اُس عہد میں صرف ابن تیمیہ ہی کے لئے
تھا۔ چنانچہ خود ان کو بھی وہی کہنا پڑا جو اس عہد کے تمام اصحاب حق نے کہا تھا
۔'' ۵۰

علامہ ابن تیمیہ مولانا آزاد کے ہیرو تھے۔ اُن پر ابن تیمیہ کی شخصیت، اُن کے جذبۂ جہاد، اور مجتہدانہ طرز فکر کا اثر کئی جہتوں سے پڑا ہے۔ اپنے انقلابی خیالات کا اثبات اور مسلم ذہن کو تقلید کی پابندیوں سے آزاد کرانے کا جواز اُنہیں علامہ ابن تیمیہؒ کے افکار وعقائد میں مل چکا تھا۔ مولانا شدید طور پر یہ محسوس کرر رہے تھے موجودہ دور میں مسلمانوں کے اندر جس فتنہ عقائد نے سر اُٹھایا ہے اُس کے سدّ باب کے لئے آج معارف ابن تیمیہ سے بڑھ کر اور کوئی چیز مطلوب ومقصود نہیں۔ اس کا بہترین محل وموقع امام ابن تیمیہ اوران کے اصحاب وتلامذہ کی سیرت وسوانح عمریہ میں مل سکتا ہے انہوں نے علامہ ابن تیمیہ کی شخصیت اور اُن کی سیرت پر ایک تفصیلی کتاب تصنیف لکھنے کا منصوبہ بنایا تھا جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:۔

''اگر تفسیر کے سلسلے میں ذرا بھی مہلت نکلی اور حضرت شاہ ولی اللہ کی سیرت کی تکمیل سے فراغت ہوئی تو انشاء اللہ سیرت ابن تیمیہ واصحابہ کی ترتیب پہمو جہ ہوں گا۔،، ۵۱

لہذا حضرت امام ابن تیمیہ کے سلسلے میں اختصار سے کام لیتے ہوئے سیرت نبویہ سے امام موصوف کے عشق وشغف کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے بتلادیا کہ علم وبصیرت کا اصلی سرچشمہ صرف حیات نبوت اور منہاج مقام رسالت ہے جس کو قرآن حکیم نے ''الحکمت'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:۔

''..... کیونکہ دنیا سے ''حکمت صادقہ'' کا اس حکمت سے الگ کوئی وجود ہی نہیں۔ ''حکمت'' یا تو خود منہاج وسنتِ نبویہ یا علم وعمل کی ہر وہ بات جو اس سے ماخوذ اور صرف اُسی پر مبنی ہو۔ یہی ''خیر کثیر'' مبدء جمیع خیرات وبرکات

ارض ونوع ہے اور صرف اسی نسخۂ شفا سے دل اور روح کی ساری بیماریاں دور ہوسکتی ہیں۔ خواہ شکوک وارتیاب کی بیماری ہو، خواہ اوہام وانکار کی، خواہ ادعائے ادریت کا ہیجان ہو خواہ حیرانی وسرگردانی لاادریت کا خمار۔'' ۵۲ے

آ گے چل کر حضرت علامہ ابن تیمیہ کی وصیت کہ سیرت طیبہ نبوت کا مطالعہ کرو، یہی نسخۂ شفا شک وریب کے سارے دکھوں کا ایک ہی علاج ہے مولانا اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''اور حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف اس عہد میں بلکہ جب تک دنیا باقی ہے، صاحب قرآن کی سیرت وحیات مقدس کے مطالعہ سے بڑھ کر نوع انسانی کے تمام امراض قلوب وعلل ارواح کا اور کوئی علاج نہیں۔ اسلام کا دائمی معجزہ اور ہمیشگی کی حجتہ اللہ البالغہ قرآن کے بعد اگر کوئی چیز ہے تو وہ صاحب قرآن کی سیرت ہے اور دراصل قرآن اور حیات نبوت معنا ایک ہی ہیں، قرآن متن ہے اور سیرت اُس کی شرح۔ قرآن علم ہے اور سیرت اُس کا عمل •••• دنیا اپنی ہدایت کے لئے اگر کسی انسان کے آگے جھک سکتی ہے تو اُس انسانیت کبریٰ وعبدیت اعلیٰ وبشریت واحدہ کے سوا اور کون انسان ہے جس پر آنکھوں سے دیکھنے والوں کی طرح ہمیشہ یقین کیا جا سکتا ہے اور جس پر ایمان لانے والوں کے لئے پچھلی امتیں اور نسلیں بھی پلوں کی طرح قطعی ویقینی روشنی رکھتی ہیں؟ دنیا میں جس قدر بھی ہدایت وتعلیم کی لوحیں تھیں سب کے لئے تغیر وتبدل ہوا حتی کہ آج بھی کوئی محفوظ نہیں لیکن اللہ اکبر مقام محمدی کی محفوظیت مصونیت کہ اس کی سیرت طیبہ اور حیات جبہ وقائمہ کی لوح محفوظ کا ایک نقطہ بھی محو نہ ہو سکا •••••• دائرہ حقیقت محمدیہ پر قدمی کی آخری حد ہے••••• روح وحیات کا آخری نقطہ وسرچشمہ قرار پائی، تو لاجرم سیر واقدام کی آخری منزل بھی وہی ٹھہری۔'' ۵۳ے

اس طویل اقتباس کے مطالعہ سے اس نکتے کا انکشاف ہوتا ہے کہ مولانا ابوالکلام کے نزدیک ہر نبی کی زندگی کے آغاز سے لے کر ختم تک اُس کا تمام عمل، قول فعل ہر بات بجائے خود ایک دلیل اور برہان حق ہے۔ اس سلسلے میں وہ انبیائے کرام کی حیاتِ مبارکہ سے مثالیں بھی پیش کرتے ہیں۔ مثلاً حضرت نوحؑ کا وجود بجائے خود ایک دلیل واثبات ہے۔ حضرت ابراہیم اپنی ذات کے اندر خود ایک حجت قائمہ اور آیت کاملہ میں اسی طرح حضرت موسیٰ کی زندگی میں برہانِ محکم دلیل وغیرہ ۔ اُسی طرح حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کو بطور ایک مستقل دلیل وشاہدِ ثابت کے پیش کیا گیا ہے۔ مولانا آزاد کی خواہش تھی کہ قرآن حکیم میں دائرہ استناد واخذ محدود رکھ کر ایک کتاب سیرت میں مرتب کی جائے۔ اس سلسلے میں مولانا اُس گفتگو کا بھی ذکر کرتے ہیں جس میں مولانا شبلی نعمانی سے درخواست کی تھی کہ:۔

> ''جس زمانے میں مولانا شبلی نعمانیؒ سے سیرت نبویہ کے بارے میں تذکرے رہتے تھے تو ایک مرتبہ مجھے اس کا خیال ہوا تھا۔ میں نے کہا آپ سیرت میں ایک خاص باب یا سیرت کا ایک خاص حصہ اس عنوان سے قرار دیجئے۔'' قرآن در سیرتِ محمدیہ''، اور اس میں صرف آیات قرآنیہ کو بہ ربط ترتیب جمع کر کے دکھلایئے کہ خود قرآن سے کہاں تک آپ کی شخصیت اور آپ کے وقائع وایام معلوم ہو سکے۔''۵۴
>
> مولانا شبلی نے یہ ذمہ داری مولانا آزاد کے ہی سپرد کر دی کہ یہ حصہ مرتب کر دو تاکہ سیرت کے ساتھ شامل کر دیا جائے۔ لہذا بقول اُن کے'' میں نے کچھ وقت اُس میں صرف کیا اور ایک مستقل سیرتِ نبویہ مجرد قرآن حکیم سے ماخوذ و مستنبط شروع کر دی۔''

حضرت علامہ ابن تیمیہ کی زندگی ہی میں اُن کے معارف کی شہرت اور رفعت ذکر پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے بعد مولانا موجودہ عہد کے فتنۂ شک والحاد اور منکرین وحی کے شک

واعتراض کا ذکر کرتے اس نکتے کی نشان دہی کرتے ہیں کہ منکرین وحی کا یہ اعتراض پیروانِ قرآن وسنت کے لئے نیا نہیں لیکن موجوہ فتنۂ الحاد کے مقابلے میں صرف اصحاب حدیث وسنت ہی کامیاب ہوسکتے ہیں۔ اس ضمن میں معقولات قدیمہ اور علومِ جدیدہ پر بھی گفتگو کرتے ہیں اس سلسلے میں مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"پس اگر آج نہاد علوم جدیدہ کی بنا پر شبہات وایردات کا ہجوم ہے تو علمِ کلام جدید! علم کلام جدید کا شور وغوغا نہیں مچانا چاہئے، بلکہ قرآن وسنت اور صرف قرآن وسنت کے علوم مہجورہ ومتروکہ کی بازگشت اور تجدید واحیاء کے لئے ماتم کرنا چاہئے۔" ۵۵؎

حضرت علامہ ابن تیمیہؒ پر تفصیلی مگر تشنہ گفتگو کا اختتام اس طرح کرتے ہیں

"۔۔۔امام ابن تیمیہؒ کے تذکرے میں بوجہ ضمنی مباحث کے بہت طول ہوگیا۔ بایں ہمہ جس قدر لکھا گیا اس سے کہیں وہ چند قابل ذکر اُمور چھوڑ دئے گئے۔ حافظ ذہبی کو بھی ایسی ہی صورت پیش آئی تھی۔ جن لفظوں پر اُنہوں نے ذکر ختم کیا تھا۔ میں بھی کروں گا۔ یعنی جو لوگ امام ابن تیمیہ کے مقامات ومراتیب کے جاننے والے ہیں۔ وہ تو مجھے الزام دیں گے کہ جس قدر مدح وتوصیف کرنی تھی نہ کی، اور جو بے خبر اور مخالف ہیں وہ میرے بیان کو غلوٗ ومبالغہ قرار دیں گے انتہیٰ۔ قلت"۔ ۵٦؎

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ:۔ مولانا آزاد حضرت علامہ ابن تیمیہ کے مقام دعوت وعزیمت کے سلسلے کو حضرت مجدد الف ثانی تک بڑھاتے ہوئے ان کے اصلی کارناموں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ شہنشاہ اکبر کے اختتام اور عہد جہانگیری کے اوائل میں گرچہ بہت سارے اکابر اور مشائخ موجود تھے لیکن جب مفاسد وقت کی اصلاح وتجدید کا معاملہ آیا تو تن تنہا حضرت مجدد الف ثانیؒ کی ذات گرامی کو توفیق الٰہی نے اس مرتبے کے لئے مخصوص کردیا تھا اور انبیائے

اولوالعزم کی نیابت وقائم مقامی یعنی مقام عزیمت ودعوت کا خلقت صرف اس کے جسم پر چست آیا۔ مقام دعوت وعزیمت کے سلسلے میں تھوڑی سی گفتگو حجتہ الاسلام شاہ ولی اللہؒ کے سلسلے میں ہوتی ہے۔ مولانا آزاد نے بہت اختصار کے ساتھ یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ مقام دعوت وعزیمت کی توفیق سبھوں کے نصیب میں نہیں ہوتی۔ شاہ ولی اللہ کا مقام ہر رنگ میں جامع وکامل ہے۔ لکھتے ہیں۔

''جن باتوں کے کہنے کی بڑوں بڑوں کو بند حجروں کے اندر بھی تاب نہ تھی وہ اب برسر بازار کی جارہی اور ہورہی تھیں اور خون شہادت کے چھینٹے حرف وحکایات کو نقوش وسواد بنا کر صفحۂ عالم پر ثبت کررہے تھے۔''۵۷

مقام عزیمت دعوت اور احیاء وتجدید امت کی تفصیلی داستان پیش کرنے کے بعد مولانا اپنی مذکورہ تحریر کا جواز اس طرح پیش کرتے ہیں:۔

مقام عزیمت دعوت ''اور احیاء وتجدید امت'' کی نسبت یہ جو کچھ بلا قصد زبان قلم پر آ گیا، تو اگرچہ اُس کی تفصیل کا یہ موقع نہ تھا، لیکن زیادہ تر یہ خیال باعث ہوا کہ شاید ان حالات وقائع کا مطالعہ اصحاب صلاح واستعداد کے لئے کچھ سود مند علم وعمل ہو، اور بحکم ''ان لم تبکو اتبا کوا'' اور

فتشبھو اان لم تکونو امثلھم

ان التشبہ باالکوام کرام

کسی کے قلب بصیرت ودیدۂ اعتبار کو ان مجدد دین ملت اور مصلحین حق کے اتباع وتشبہ کی توفیق ملے۔ شاید کوئی مرد کار اور صاحب عزم وقت کی پکار پر لبیک کہے اور زمانے کی طلب وجستجو کا سراغ بنے۔ آج اگر کام ہے تو یہی کام ہے؛ اور ڈھونڈھ ہے تو صرف اسی کی۔''۵۸

'' تذکرہ'' کے مطالعے سے اس نکتے کا انکشاف ہوتا ہے کہ مولانا اپنے عہد کے عام

مسلمانوں کے ذہنی و دینی اضمحلال سے نا آشنا نہ تھے لہٰذا اُنہوں نے یہ نسخہ تجویز کیا کہ اس مریضِ امت کا علاج اصلاح سے ممکن ہے ساتھ ہی خدا کے کلام اور حضور اکرم ﷺ کی سیرت مبارکہ کے ذکر سے ان کے سینے کو منور کیا جائے۔ ساتھ ہی اپنے اسلاف کے کارناموں، ایثار و قربانی عزیمت دعوت کی ایمان افروز واقعات بیان کر کے ان کے لہو کو گرم کیا جاسکتا ہے۔ مولانا کی زندگی کا اصل مقصد دعوت و اصلاح اور عمل و عزیمت کا پیغام ہے جس کا آغاز تو اُنہوں نے الہلال اور البلاغ کے اجراء کے کیا تھا۔ "تذکرہ" اسی سلسۃ الذھب کی ایک کڑی ہے۔ بقول ضیاء احمد بدایونی:۔

"کبھی امر بالمعروف کی تاکید کبھی علمائے حق کی حمایت اور کبھی علمائے سو کی مذمت کی صورت میں جلوہ گر ہوتی تھی ۔ یہی وہ بجلی تھی جس کی کون اُن کی تحریروں میں نظر آتی تھی اور یہی وہ نعرہ تھا جس کی گونج اُن کی تقریر میں سنائی دیتی تھی۔" ۵۹

استدراک:۔ مقام دعوتِ عزیمت کی تفصیلی بیان کے بعد مولانا "آمدم برسرِ مطلب" کے مصداق "استدراک" کے عنوان سے حضرت مولانا جمال الدینؒ کے متعلق ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں چند واقعات بھی قلمبند کئے گئے ہیں۔ اور پھر خود مولانا نے اپنا تذکرہ چھیڑ دیا ہے جس کا آغاز یوں کرتے ہیں:۔

"ان اوراق پریشاں کی تالیف کا باعث ایک دوستِ عزیز کا اصرار تھا۔ اب وہ مُصر ہیں کہ خود اپنے حالات بھی قلم بند کروں۔ اس تمام داستان سرائی کے اہتمام سے اُن کا اصلی مقصد یہی تھا۔ ہر چند معذرت کی مگر مسموع نہ ہوئی ۔ ناچار تعمیل فرمائش کے لئے مستعد ہونا پڑا۔ کئی سو صفحے روشن دلانِ سلف کے تذکرۂ آثار ومناقب سے نورانی ہو چکے ہیں۔ اب دو چار صفحے اپنی سیہ روئیوں اور سیہ بختیوں کے سوادِ تحریر سے بھی سیاہ کرتا ہوں۔

درمجلس وصالش خُمہا کشیدہ مرداں

چوں دورِ خسرو آمد، مے در سبو نماندہ

یہ غریب الدیار، عہد ونا آشنائے عصر و بیگانۂ خویش و نمک پروردۂ ریش، معمورۂ تمنا و خرابۂ حسرت کہ موسوم بہ احمد و مدعو بابی الکلام ہے ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستی عدم سے اس عدمِ ہستی نما میں وارد ہوا، اور تہمتِ حیات سے متہم۔ الناس نیام، اذا ماتوا فانتبھوا۔

شورے شود و از خوابِ عدم چشم کشودیم

دیدیم کہ باقی است شبِ فتنہ، غنودیم

والدِ محترم نے تاریخی نام "فیروز بخت" رکھا تھا، اور مصرعۂ ذیل سے ہجری سال کا استخراج کیا تھا:

"جواں بخت و جواں طالع، جواں باد" ۶۰

آگے چل کر اپنی نصف زندگی کے گذر جانے سے متعلق اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ان میں مولانا کے اسلوب کی انفرادیت شاعرانہ اشاریت اور ان کے رومانی وفور کا اندازہ ہوتا ہے۔ الفاظ بہتے دریا کی مانند صفحۂ قرطاس پر بکھرتے جارہے ہیں جذبات کا سیل رواں تھمنے کا نام نہیں لیتا۔ دیکھئے یہ تراشے:۔

"سبحان اللہ بخت کی فیروزی اور طالع کی ارجمندی! نیمۂ عمر لغزشوں اور ٹھوکروں کی پامالی و درماندگی میں بسر ہو چکی۔ نیمۂ عمر جو شاید باقی ہے، دم لینے اور ستانے میں ختم ہو رہی ہے۔ نہ منزل مقصود کا پتہ ہے، نہ شاہ راہِ منزل پر قدم، جب پاؤں میں تیزی اور ہمت میں جوانی تھی، تو رہ نوردی و منزل طلبی کا دروازہ نہ کھلا۔ اب پامالیوں اور افتادگیوں سے نہ قدم میں پامردی رہی، نہ ہمت میں کارفرمائی، تو طلب نے آنکھیں کھولیں اور غفلت نے کروٹ لی۔ راہ دور اور نشانِ منزل گم، کیسۂ زاد خالی اور سروسامانِ کار ناپید۔ وقت جاچکا، اور ہر

آن و ہر لحہ کروانِ مقصود سے دوری اور منزلِ مراد سے مہجوری بڑھتی گئی۔اب
قدم کی تیزی اور ہمت کی چستی واپس بھی مل جائے، پھر بھی وہ دولتِ وقت کب
واپس مل سکتی ہے، جو لٹ چکی، اور وہ قافلۂ امید کب پس ماندگانِ غفلت کی
خاطر لوٹ سکتا ہے جو جا چکا!''[۶۱]

اپنی شخصی زندگی کی روئداد جس شاعرانہ اشاریت کے ساتھ مولانا نے پیش کی ہے اُس کے
مطالعے سے اُن کے متعلق بعض مفید معلومات فراہم ہوتی ہیں لیکن قاری دل مسوس کر رہ جاتا ہے
کہ تشنگی رفع نہیں ہوتی کچھ اور وسعت چاہئے تھا اُن کے بیاں کے لئے دیکھئے اُن کی تحریر کے چند
تراشے:۔

'' جتنی زندگی گذر چکی ہے گردن موڑ کر دیکھتا ہوں تو ایک نمودِ غبار سے زیادہ
نہیں، اور جو کچھ سامنے ہے، وہ بھی جلوۂ سراب سے زیادہ نظر نہیں آتا۔قلمِ
درماندہ تذکرہ ونگارش سے عاجز، اور فکرِ گم گشتہ حیرانِ اظہار وتعبیر۔اپنی
سرگزشت وروئدادِ عمر لکھوں تو کیا لکھوں؟ایک نمود،غبار و جلوۂ سراب کی تاریخ
حیات قلم بند ہو تو کیوں کر ہو؟ دریا میں حباب تیرتے ہیں۔ہوا میں غبار اڑتا
ہے۔طوفان نے درخت گرادیے۔سیلاب نے عمارتیں بہادیں۔عنکبوت نے
اپنی پوری زندگی تعمیر میں بسر کردی۔مرغِ آشیاں پرست نے کونے کونے سے
چن کر تنکے جمع کیے۔خرمن و برق کا معاملہ۔آتش وخس کا افسانہ،ان سب کی
سرگزشتیں لکھی جاسکتی ہیں،تو لکھ لیجیے۔

میری پوری سوانح عمری بھی انہی میں مل جائے گی۔

نصف افسانۂ امید اور نصف ماتمِ یاس!''[۶۲]

عہد شباب کی کہانی خود اُن کو زبانی سنیے:۔

'' آنکھیں کھلیں تو عہد شباب کی صبح ہو چکی تھی، اور خوشیوں اور ولولوں کی شبنم

سے خارستانِ ہستی کا ایک ایک کانٹا پھولوں کی طرح شاداب تھا۔ اپنی طرف دیکھا، تو پہلو میں دل کی جگہ سیماب کو پایا۔ دنیا پر نظر ڈالی، تو معلوم ہوا کہ اس صبحِ فریب کے لئے نہ تو سوز و تپش کی دوپہر ہے، نہ ناامیدی و ناکامی کی شام۔ یہ سارا شہرستانِ امید اور نگار خانہ نظر فریب صرف ایک ہمارے ہی دیدہ و دل کی کام جوئیوں کے لئے بنا ہے، اور گویا گوشہ گوشہ اور ذرہ ذرہ ہماری ہوسنا کیوں کے لئے چشم براہ ہے۔ جس طرف کان لگایا، یہی صدا سنائی دی۔ معلوم نہیں اپنی ہی گنبدِ غفلت اور ہنگامۂ ہوس کی گونج تھی، یا نوگرفتارانِ طلسم شباب کی ہوش ربائیوں کے لئے خودسازِ ہستی کا نوائے فریب ہی یہی ہے:

شہر یست پر زخوباں، وز ہر طرف نگارے

یاراں صلائے عام ست گرمی کنید کارے!

غفلت و مدہوشی نے افسوں پھونکا، سرمستی و سرگرانی نے جام بھرے، جنونِ شباب نے ہاتھ پکڑا، اور ولولوں اور ہوسوں نے جو راہ دکھلائی، دل کی خود فروشیوں نے اُسی کو منزلِ مقصود سمجھا۔ ہوش و خرد کو گو پہلے حیرانی ہوئی، لیکن پھر اس نے بھی آگے بڑھ کر اشارہ کیا: راہ ہے تو یہی راہ ہے اور وقت ہے تو اسی کا:

ساقیا! مرنج از من، عالم جوانی ہاست!

جس طرف نظر اٹھائی، ایک صنم آبادِ الفت و پرستش نظر آیا، جس میں مندروں اور مورتیوں کے سوا

کچھ نہ تھا ہر مندر جبینِ نیاز کا طالب، ہر مورتی دل فروشی و جاں سپاری کے لئے وبالِ ہوش۔ ہر جلوہ برقِ تمکین و اختیار۔ ہر نگاہ بلائے صبر و قرار:

الفراق اے صبر و تمکین! الوداع اے عقل و دیں!

جس راہ میں قدم اٹھایا، زنجیروں اور مندوں نے استقبال کیا۔ جس گوشے میں

پناہ لی، وہی زندانِ ہوش وآگہی نکلا۔ ایک قید ہو، تو ذکر کیجئے۔ ایک زنجیر ہو، تو اس کی کڑیاں گنیئے۔ دل ایک تھا، مگر تیر ہزاروں ہاتھوں میں تھے۔ نظر ایک تھی، مگر جلووں سے تمام عالم معمور تھا ہر کشش نے اپنا تیر چلایا۔ ہر رہزن نے اپنی کمند پھینکی۔ ہر فسوں ساز نے اپنا افسونِ محبت پھونکا۔ ہر جلوۂ ہوش ربا نے صرف اپنے ہی دامِ الفت میں اسیر اور اپنی ہی فتراکِ اسیری کا نخچیر رکھنا چاہا:

وائے بر صید کہ یک باشد و صیادے چند!

یہ بات نہ تھی کہ امتیاز نے بالکل ساتھ چھوڑ دیا ہو اور دیدۂ اعتبار یک لخت کور ہو۔ برق نے بارہا چشمک کی، ستاروں نے بھی کبھی کبھی پردۂ شب کی اوٹ سے جھانکا، لیکن رات کی تاریکی اور طوفان کی تیرگی ایسی نہ تھی جو ان چنگاریوں سے روشن ہو جاتی۔ وہ برابر بڑھتی ہی گئی:

فرصت ز دست رفتہ و حسرت فشردہ پاے
کار از دوا گزشتہ و افسوس نہ کردہ کس

کبھی سرو کی بلند قامتی پر رشک آیا، تو سر بلندی و سرفرازی کے لئے دل خون ہوا۔ کبھی سبزۂ پامال کی خاکساری و افتادگی پر نظر پڑ گئی، تو اپنے پندار و خود پرستی پر شرم آئی۔ کبھی بادِ صبا کی روش پسند آئی، تو اقامت گزینی سے وحشت ہوئی؛ آوارگی و رہ نوردی کی دل میں ہوا سائی۔ کبھی آبِ رواں کی بے قیدی و بے تعینی اس طرح جی کو بھائی کہ پابندیوں اور گرفتاریوں پر آنکھوں نے آنسوؤں اور دل نے زخموں کے ساتھ ماتم کیا۔ پھولوں کو جب کبھی مسکراتے دیکھا، تو اپنی آنکھوں نے بھی رونے میں کمی نہ کی؛ اور درختوں کو جب کبھی جنبش ہوئی، شاخوں نے جھوم جھوم کر وجد کیا، تو اپنی سنگینی و بے حسی بھی ضرور یاد آ گئی۔ غرض کہ نہ تو اسباب میں کمی تھی اور نہ استعداد بالکل مفقود تھی۔ بجلیاں کوندتی رہیں۔

بادل گرجتے رہے۔ لیکن افسوس کہ نیند بھی بڑی ہی سخت تھی اور پشتِ غفلت کسی بڑے ہی سخت تازیانے کا انتظار کر رہی تھی۔

نہ پہنچی ضعف سے لب تک دعا ہی، ورنہ سدا

درِ قبول تو اس آرزو میں باز رہا!

بہتر یہ ہے کہ صاف صاف ہی کہہ دیا جائے:

ہاں! بانگِ بلندست ایں، پوشیدہ نمی گویم!

گمراہی عمل کی آخری حد فسق ہے اور گمراہی اعتقاد کی الحاد۔ سو فسق والحاد کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جس سے اپنا نامۂ اعمال خالی رہا ہو، اور فسق خود بھی ایک کامل قسم کا عملی الحاد ہے'' ۶۳

اس طویل اقتباس سے ایک نکتہ اُبھر کر سامنے آتا ہے کہ مولانا آزاد کنایوں اور استعاروں کے پردے میں اپنی ''در جوانی چناں کہ افتد بدانی'' کی روئداد بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اس کی اہمیت اس وجہ سے بھی مسلم ہو جاتی ہے کہ ابتدائے عمر کی ناکامی شوق نے مولانا کی آئندہ زندگی کی تشکیل ہیں۔ دیکھیے عشق مجازی کی تفصیل:۔

''ناگہاں جاذبۂ توفیق الٰہی پردۂ عشق مجازی میں نمودار ہوا، اور ہوس پرستی کی آوارگیوں نے خود بخود شاہراہ عشق و محبت تک پہنچا دیا۔ آگ لگتی ہے تو رفتہ رفتہ شعلے بھڑکتے ہیں۔ سیلاب آتا ہے، تو بتدریج پھیلتا ہے، یہ تو ایک بجلی تھی جو آناً فاناً نمودار ہوئی، چمکی اور دیکھا تو خاک کا ڈھیر تھا:

می گزشتم زغم آسودہ کی ناگہ زکمیں

عالم آشوب نگاہے سرِ راہم بگرفتم

اصل میں منزلیں تین ہی ہیں۔ ہوس، عشق، حقیقت:

حاصلِ عمرم سہ سخن بیش نیست

خام بدم، پختہ شدم، سوختم

اور یہاں عشق سے مرادعشقِ محدود و ناقص یعنی مجاز ہے، نہ کہ علی الاطلاق، کیونکہ اس اعتبار سے تو اول و آخر جو کچھ ہے، عشق ہی ہے، تمام کائناتِ ہستی میں بجز اس کے ہے اور کون؟ آسمانوں کا ستون ہے، تو یہی ہے، زمین کا مدار و محور قائم ہے، تو اسی کے دم سے، دنیا میں جس قدر ظاہر ہے، یہی ہے، جس قدر باطن ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ تمہاری نگاہِ وحدت نا آشنا نے ایک ہے حقیقت کو طرح طرح کے ناموں سے موسوم کر دیا ہو۔ کتنے ہی پردے ہیں، جو اسی کج نظری و کثرت بینی نے جمالِ حقیقت یگانہ و یک رنگ پر ڈال رکھے ہیں، ورنہ:

یک چراغ ست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں

ہر کجا می نگری، انجمنے ساختہ اند

بلا شبہہ یہ بھی لغزش تھی۔ لیکن اس لغزش کو کیا کہو گے، جو محبوب کے قدموں پر گرا دے؟ مقصود تو ساری باتوں سے اُس تک پہنچنا ہے۔ اگر لغزش و مستی ہی رہ نما بن جائے، تو پھر کیوں نہ ہزار استقامتیں اس پر قربان ہوں! لاکھوں ہشیاریاں اس پر نچھاور:

گر طمع خواہد زمن سلطانِ دیں

خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں! [۶۴]

ان سطور کے مطالعے سے مولانا کے محبت و عشق کے بہت سارے رازہائے سر بستہ کا انکشاف ہوتا ہے جس کے اظہار میں مولانا نے صداقت شعاری اور حقیقت بیانی کو اپنا شیوہ بنایا ہے۔ بیان میں شدت احساس بھی ہے اور وفور جذبات کا ایک سمندر ہچکولے مار رہا ہے۔ رومانی سر گذشت کا اظہار رموز و علائم اور اشاروں و کنایوں میں اس طرح ہے کہ پڑھنے والے کی تشنگی رفع

نہیں ہوتی۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ان شاعرانہ انداز بیان سے مولانا کی نجی زندگی اور شخصی احوال وکوائف سے کما حقہ واقفیت ہو جاتی ہے اور ان کے ذہنی سفر کے ارتقاء کا بھی اندازہ ہوتا ہے بقول پروفیسر ریاض الرحمٰن خان شیروانی:۔

''جس چیز کی سب سے زیادہ اہمیت محسوس ہوتی ہے وہ مولانا کے عشق مجازی کی نشان دہی ہے اگرچہ یہ نشان دہی محض کنایتاً کی گئی ہے۔ اس کی اہمیت اس نقطۂ نظر سے ہے کہ ابتدائے عمر کی ناکامیٔ شوق نے مولانا کی آئندہ زندگی کی تشکیل میں بہت اہم حصہ لیا ہے۔ عشق میں ناکامی کا ردعمل مختلف طبائع پر مختلف ہوتا ہے، کم تر درجے کے لوگ عشق میں ناکام ہو کر مایوسی، پژمردگی اور بےعملی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس بلند پایہ طبائع میں یہ ناکامی خوب سے خوب تر کی جستجو کا جذبہ اور غم دوراں کے درماں کی تلاش کا حوصلہ پیدا کرتی ہے۔ مولانا آزاد کی عالی ظرفی اور بلند حوصلگی شکوہ وشبہہ سے بالاتر ہے اور اسی لیے ان کی ناکامی عشق نے انہیں مایوسی اور بےعملی کی تاریکی میں کھو جانے کے بجائے جادۂ عمل پر گامزن ہونے اور انسانیت کے دکھوں کا مداوا تلاش کرنے پر آمادہ کیا۔ ۶۵''

اپنے عشق کی ناکامی پر مولانا آنسو نہیں بہاتے، آہ وزاری نہیں کرتے 'بلکہ ناکامی ہی کامیابی کی کنجی ہے' کے مصداق یہ تاثر دیتے ہیں کہ ابتدائے عمر کی ناکامیٔ شوق نے آئندہ زندگی کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کیے ہیں:۔ دیکھیے یہ تحریر:

''اگرچہ اس معاملہ کا خاتمہ بظاہر ناکامی و مایوسی پر ہوا، لیکن فی الحقیقت فتح ومراد کی ساری شادمانی اسی ناکامی میں پوشیدہ تھی۔ اسی ناکامی نے بالآخر کامیابی کی راہ کھولی۔ اسی مایوسی سے امید کا دروازہ کھلا۔ جو تاریکی اپنی سینہ بختیوں کی رات نظر آتی تھی، وہی صبح مقصود کے طلعت جہانتاب کا نقاب ثابت ہوئی۔ گو

قدم بت کدہ کی راہ پر تھے، مگر غبارِ مجاز دور ہوا، تو کعبۂ حقیقت سامنے
تھا: یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی و
یحی الارض بعد موتھا و کذالک تخرجون!

کفر آوردم و در عشق تو ایماں بردم

سارا کام پہلے سے ہو چکا تھا۔ چولہا مدتوں سے گرم تھا، ہوس بازی نے چنگاریوں کا کام دیا تھا، عشق نے شعلے بھڑکائے تھے، صرف اتنی بات باقی رہ گئی تھی کہ ایک دیگ اتار کر دوسری چڑھا دی جائے۔ یہ کام عشق کی امیدوں سے نہ ہو سکا، تو کیا مضائقہ! عشق کی مایوسیوں نے پورا کر دیا:

آں نافۂ مراد کہ مہ خواستم زغیب
در چینِ زلفِ آں بتِ مشکیں کلالہ بود ۲۶

واردات عشق و محبت کی روئداد بیان کرنے کے بعد مولانا اپنے مخصوص پیرایۂ اظہار میں اس کا اختتام یوں کرتے ہیں:۔

''ہاں، یہ ضرور ہے کہ اگر کسی کو اول روز سے اپنے زہد و پاکی کی خشک دامنی پر ناز ہو۔ تو ہم کو بھی اپنی اس رندی و ہوسناکی کی تر دامنی کا کوئی شکوہ نہیں، جس کو عین اکیس بائیس کی عمر میں (کہ جنونِ شباب کی سرمستیوں کا اصلی موسم ہوتا ہے) دونوں ہاتھوں سے اس طرح نچوڑا کہ ایک قطرہ بھی باقی نہ چھوڑا، کوئی صاف راہ پر ڈورتا گیا ہے، تو یہ اس کی خوش نصیبی سہی، لیکن ہم بھی اس کو بدنصیبی نہیں سمجھ سکتے کہ کتنی ہی دلدلوں پاؤں نکالے، کتنی ہی جھاڑیوں سے دامن سنبھالا، کتنی ہی زنجیریں توڑنی پڑیں، ولدلوں، امنگوں، امیدوں تمناؤں کے کتنے ہی دفتر خود اپنے ہاتھوں جلانے پڑے، جب کہیں جا کر اس کوچہ میں دم لے سکے، جہاں آج اپنے کو پا رہے ہیں:

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں

جسے غرور ہو، آئے، کرے شکار مجھے!

اور سچ پوچھیے، تو فیصلہ وہی ہے جو لسان الغیب نے کر دیا:

بیا کہ رونق ایں کارخانہ کم نشود

ز زہدِ ہمچو توئی، یا بفسقِ ہمچو منی!

باوجودیکہ اس معاملہ پر کامل نو برس گزر چکے ہیں، اور رفتہ رفتہ وہ حالت پیش آئی۔ لیکن الحمدللہ کہ جو درد پہلے داغ اور پھر زخم بن کر رہا تھا، اب ناسور بن کر نہاں خانۂ دل میں محفوظ ہے اور امید ہے کہ ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ ۷۶

کتاب کا آخری حصہ رانچی میں مولانا کی آمد اور یہاں کے احوال و کوائف پر مختص ہے جس کا تفصیلی تجزیہ ''مولانا آزاد اور رانچی'' عنوان کے تحت گذشتہ باب میں کیا جا چکا ہے۔

''تذکرہ'' کی صنفی نوعیت :۔ مولانا آزاد کی اس تصنیف کے سلسلے میں یہ موضوع بھی زیر بحث رہا ہے کہ اس کی صنفی نوعیت کیا ہے؟ عام لوگ اسے مولانا کی خودنوشت سوانح سے موسوم کرتے ہیں جب کہ پروفیسر ملک زادہ منظور نے مختلف دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مذکورہ تصنیف سوانح نگاری کی صنف کے معیار نقد پر پوری نہیں اُتر سکی۔ جہاں تک خودنوشت سوانح نگاری (Auto biography) کی صنفی حیثیت کا سوال ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دیگر اصنافِ ادب کی طرح ادب کی ایسی شاخ ہے جس میں مصنف کی اپنی زندگی کے خارجی حالات کے ساتھ ساتھ داخلی کوائف کا بیان ہوتا ہے۔ اس فن کے لئے سب سے بڑی شرط صداقت نگاری ہے۔ یعنی سوانح نگار اپنے متعلق جو بھی بات یا واقعہ کا ذکر کرے اس میں دیانت داری کو دخل ہو۔ پھر یہ کہ کسی بڑے انسان کی خودنوشت سوانح عمری میں اس سے وابستہ بہت سے افراد اور اشخاص بھی شریک ہوتے ہیں۔ لہٰذا سوانح نگار کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی سوانح عمری اس کی ذات تک محدود نہ رہے بلکہ وہ اپنی سرگذشت میں دوسروں کو بھی شامل کرے۔ اس کے علاوہ اپنی زندگی کے حوادث و علائق کے پس منظر میں ملک اور اپنے عہد کے تاریخی، معاشرتی، علمی، ادبی،

تہذیبی اور سیاسی حالات و ماحول کو بھی ملحوظ رکھے۔ اچھی سوانح حیات تہذیب کے ارتقا کے مطالعے میں دستاویز ثابت ہوتی ہے۔ خودنوشت کی حیثیت تاریخ کی تو نہیں ہوتی لیکن تاریخی واقعات وحقائق کا بیان اس سے وابستہ ضرور ہے۔ تاریخی واقعات کا بیان اس لئے بھی ضروری ہے کہ قاری کے دل و ذہن پر اس کے مطالعے سے جو کیفیات، تاثرات، احساسات وجذبات مرتب ہوتے ہیں ان کی روشنی میں سوانح نگار کے متعلق کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ مولانا آزاد اپنی تصنیف ''تذکرہ'' کے متعلق خودنوشت ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:۔

> '' بہرحال ایک دوست عزیز کے اصرار سے اپنے خاندانی حالات قلمبند کرتا ہوں۔ صرف قریبی حالات اور بعض نمایاں اور نتیجہ خیز واقعات کے تذکرے پر اکتفا کروں گا۔ مفصل حالات کے لئے والد مرحوم کا ایک مستقل رسالہ موجود ہے، اور مہلت ملی تو شاید اشاعت کی نوبت آئے۔
>
> پہلے والد مرحوم کے آبائی سلسلے کے کچھ حالات لکھتا ہوں۔ اس کے بعد اُن کے نانا مولانا منورالدین مرحوم کا حال لکھوں گا۔'' ٦٨؎

اس دعوے کے باوجود بھی مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ مولانا آزاد کی مذکورہ تصنیف سوانح نگاری کی کسوٹی پر پوری نہیں اُترتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کتاب کا مطالعہ قاری کے لئے خضر راہ ثابت ہوگا اس کتاب میں آپ بیتی کے تجربات و مشاہدات بھی ہیں، ذاتی سرگذشت اور احوال وکوائف بھی۔ اسلاف کے کارناموں کا بکھان بھی ہے اور دعوت وعزیمت کا پیغام بھی۔ مولانا آزاد کی تصنیف ''تذکرہ'' ہر اعتبار سے ایک علمی، ادبی ودینی معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے جس میں مختلف شخصیتوں کی زندگی کے نشیب وفراز کا انعکاس بھی ہے لیکن مولانا نے اس خودنوشت کا نہ تو کوئی موڈل تجویز کیا ہے اور نہ ہی مرکز ومحور۔ پوری کتاب Non Siquetional Order میں ہے۔ پھر یہ کہ مولانا ایک خودنوشت سوانح نگار سے زیادہ ایک مبلّغ کا رول ادا کرنے لگتے ہیں اور پوری توانائی اُسی میں صرف کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا اعتراف کتاب کی

اشاعت کے بعد ''اعتذار'' کے عنوان سے شامل مضمون میں انہوں نے خود کیا ہے۔ جو یکم اکتوبر ۱۹۱۹ء کو کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ دیکھئے یہ تراشہ:۔

''کتاب میں جا بجا مختلف علوم اور مختلف جماعتوں کا ذکر آ گیا ہے۔ ممکن ہے بعض مقامات کے نقد و تعصب میں زیادہ سختی و تلخی محسوس ہو۔ اب دیکھتا ہوں تو خود بھی ایسا محسوس کرتا ہوں۔ اس طرح کا نشیب و فراز ان تحریروں میں ضرور ہو جاتا ہے جو مختلف حالات و تاثرات میں لکھی جاتی ہیں۔ نظر ثانی کی ضرورت ایسی ہی باتوں کے لئے ہوتی ہے۔ مع ہذا اگر اِن مباحث میں کتاب کی اصلی حیثیت پیش نظر رہی تو یہ معاملہ موجب تشویش خاطر نہ ہوگا۔۔۔۔۔'' ۶۹

کتاب میں مصنف کی طول بیانی اور موضوع سے ہٹ کر گفتگو قاری کے ذہن پر گراں گذرتی ہے اور یہ مصنف کی شعوری کوششوں کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے لیکن مولانا اُس کا بھی جواز نکال لیتے ہیں:۔

''بحث و نظر حکماء کی حکمت ہے اور دعوت و تبلیغ انبیائے کرام کی حکمت۔۔۔۔ پس یہ امر پیش نظر رہے کہ کتاب میں جہاں کہیں اس قسم کے مطالب آ گئے ہیں مقصود اصلی ان سے اصلاح و دعوت ہے اور اس لئے ضروری ہے کہ مکروہات کے بیان میں یک گونہ تشدد اور محاسن کے تذکرہ میں ایک حد تک استغراق نمایاں ہو۔۔۔'' ۷۰

پروفیسر محمد مجیب نے مولانا آزاد کی تصنیف ''تذکرہ'' کے سلسلے میں جو مغز ابھارا ہے، اُس سے اتفاق کیا جا سکتا ہے۔ دیکھئے یہ تحریر:۔

''تذکرہ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ ابتداء میں جہاں مولانا آزاد اپنے خاندان کا مختصر ذکر کرتے ہیں اور اس استدلال پر ختم کرتے ہیں کہ خاندان سے آدمی بڑا نہیں بنتا اور آخر میں تمتہ میں وہ اپنی سوانح عمری لکھتے ہیں۔ فی الحقیقت

تذکرہ کو کما حقہ سمجھنا ممکن نہیں جب تک کہ اُس کو اختتام سے شروع نہیں کیا جائے۔ اس سے نہ صرف اُن کا انداز فکر واضح ہوگا بلکہ اُن کا زورِ بیان، روانی، اُن کی اشاریت، اُن کی اردو زبان کے زمین و آسمان کی خداوندی بھی۔ وہ صرف ادبی اکتساب ہی نہیں ہے بلکہ وہ رومانی قوت ہے اور اس تجلی کا نتیجہ ہے جو اس دنیا کی روشنی سے نہیں ہے۔ تذکرہ عمیق روحانی کیفیتِ مزاج کی تخلیق ہے اور اُسی کیفیت مزاج کے اثر میں پڑھا جانا چاہئے۔''[۱]

تذکرہ کے آخری باب میں مولانا نے اپنے متعلق جو باتیں کہی ہیں یقیناً اس کے مطالعے سے مولانا کے شخصی احوال وکوائف سے کما حقہ واقفیت ہو جاتی ہے۔ محبت وعشق کے اظہار میں بھی مولانا نے صداقت شعاری اور حقیقت بیانی کو اپنا شیوہ بنایا ہے۔ رومانی سرگذشت کے اظہار میں شدتِ احساس کا پرتو بھی اور وفورِ جذبات بحرِ بیکراں کی طرح ہچکولے مارتا دکھائی دے رہا ہے۔ اُردو کے صاحبِ طرز انشاء پرداز مہدی افادی کی اس تحریر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں:۔ مہدی افادی نے مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھے گئے ایک خط میں ''تذکرہ'' کے متعلق اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا ہے:۔

''تذکرہ ابوالکلام کی ایک جلد ہدیۃً ظاہری حیثیت سے لائق رشک ہے اور کیوں نہ ہو مسٹر احمد کی مشاطہ گری نے حسن کاغذی کو خوب نکھارا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کتاب کہاں تک اپنے موضوع کے حدود میں ہے۔ اب تک جس قدر دیکھ سکا ''اسماء الرجال'' کا خاکہ ہے خود رو ریمارکس ہیں جو بے ترتیب فصلوں میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ مگر خاتمہ جان دینے کے لائق ہیں۔''[۲]

اسلوب نگارش:۔ ''تذکرہ'' مولانا آزاد کے تبحر علمی کا شاہکار اور علم کا گوہر آبدار ہے۔ آزاد کی تصنیف ''تذکرہ'' محض ایک خودنوشت سوانح ہی نہیں بلکہ اسے ایک ایسا ادبی دستاویز کہنا چاہیے جس میں مذہب، فلسفہ، سیاست، تاریخ شخصیات کے علاوہ مختلف مسائل پر عالمانہ اظہار

خیال کیا گیا ہے۔ جس میں خطیبانہ انداز بھی ہے اور شوکت الفاظ کا بحرِ ذخار بھی اور توارد، تکرار، ادعائی طرزِ تخاطب کی فراوانی بھی۔ مولانا آزاد کی شخصیت کی رنگارنگی ''تذکرہ'' کے اسلوب میں مضمر ہے۔ اسلوب کے سلسلے میں یہ سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ اسلوب ہی شخصیت ہے بقول عابد علی عابد:۔

''اسلوب محض اظہارِ ذات کا سمبل (Symbol) نہیں۔ ابلاغ کی منزل کی سرشاری ہے۔ اسلوب کو محض شخصیت کا ظہار یا طرزِ نگارش یا انداز بیان کہنا مناسب نہیں۔ اسلوب سے مراد کسی لکھنے والے کی وہ طرزِ نگارش ہے جس کی بنا پر وہ دوسرے لکھنے والے سے ممیّز ہو جاتا ہے۔'' ۳۷

مولانا کی اسلوب نگارش کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ موضوع کے شایان شان اسلوب اپناتے ہے۔ فلسفیانہ موشگافیوں اور ادبی رموز کی گرہ کشائیوں کے سلسلے میں وہ سہل اور سادہ طرزِ تحریر کو ترجیح دیتے ہیں جب کہ مذہب، سیاست، تاریخ جیسی علمی گفتگو اور اس کے رموز وحقائق کے نکات کے بیان میں علمی وقار اور تمکنت کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے ان کا قلم مخصوص انداز میں جادو جگا دیتا ہے۔ ایسے موقع پر ان کی تحریر میں عربی کے اقتباسات اور عبارات کی فراوانی ملتی ہے۔ فارسی اشعار کا استعمال کرتے ہیں۔ علمی اصطلاحات کے علاوہ موزوں اور مناسب اشعار کا استعمال بھی اسلوب کی حسن کاری میں اضافہ کرتا ہے۔ ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ'' تذکرہ'' میں مولانا نے جو اسلوب اپنایا ہے، ان کے ادبی سفر کا Turning Point ہے جس میں شعری اور تخلیقی اظہار کی بالادستی ہے۔ مذکورہ تصنیف میں مولانا کی قوتِ اظہار و بیان کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:۔

''وہی دنیا جس کی میکدہ فراموشی نے غفلت کے جام لنڈھائے تھے اپنے ہر جلوہ سے آنکھوں کو، اپنے ہر نغمہ سے کانوں کو سرمستی و سرشاری کی پیہم دعوتیں دی تھیں۔ اب اس کا کونہ کونہ، چپہ چپہ ہشیاری و بنیش کا مرقع تھا۔ بصیرت و

معرفت کا درس تھا۔ ذرے ذرے کو گرم گفتار پایا، پتہ پتہ کو مکتوب و مسطور دیکھا، پھولوں نے زبان کھولی۔ پتھروں نے اٹھ اٹھ کر اشارے کئے۔ خاک پامال نے اڑ اڑ کر گہر افشانیاں کیں، آسمانوں کو بار ہا اترنا پڑا تا کہ سوالوں کا جواب دیں، زمین کو کتنی ہی مرتبہ اچھالنا پڑا کہ فضاء آسمانی کے تارے توڑ لائیں ،فرشتوں نے بازو تھامے کہ کہیں لغزش نہ ہو جائے، سورج چراغ لے کر آیا کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے، سب نے نقاب اتار دیئے، سارے پردے چھلنی ہو گئے، سب کی ابروؤں میں اشارے تھے، سب کی آنکھوں میں حکائتیں بھری تھیں ،سب کے ہاتھ بخشش و قبولیت کے لئے دراز تھے، بادل کو پکڑا تو سازِ ہستی کا طنبورہ نکلا، بجلی کو پاس بلایا تو لب ہائے راز کا تبسم آشکار انکلی، ہوا کے جھونکے مٹھیوں میں آ گئے مگر پھر بھی خالی رہیں، سمندر نے اپنی ساری موجیں خرچ کر دیں مگر پھر بھی ہمارے ہاتھ کا پیالہ نہ بھرا۔۔۔۔غرضیکہ ہمت خوابیدہ جاگ اٹھی اور دل رفتہ پھر نئی نئی طاقتوں اور نئے نئے سامانوں کے ساتھ واپس آ گیا۔ عالم آفاق و انفس میں جو کچھ ہے ان میں سے کوئی نہ تھا جس کے ابرو پر گرہ یا آنکھوں میں غمزہ ہو۔ سب کی زبانیں گویا، سب کے اشارے آشکارا، سب کی سطریں ابھری ہوئی تھیں، نہ کوئی لب بندر ہا نہ کوئی جلوہ مستور، نہ آنکھوں نے دیکھنے میں کمی کی، نہ کانوں نے سننے میں، چشم و گوش نے جو کچھ بہم پہنچایا دل کی وسعت نے سب کو سمیٹ لیا۔ اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے۔

سخن عشق بدل ورنہ ولب را مکشا

سرایں شیشہ فربند کہ بادی نہ خور ۴۷

ایک اقتباس اور ملاحظہ ہو جس کے مطالعے سے مولانا آزاد کے معجزۂ زبان و قلم کی سحر انگیزی کا اندازہ ہوتا ہے اور قاری انشا پردازی کی طلسماتی دنیا میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ اس پر وجدانی

کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔دیکھیے یہ تحریر:۔

"بڑے بڑوں کا عذر یہ ہوتا ہے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا اور سروساماں اور اسباب کارفرا ہم نہیں۔لیکن وقت کا عازم و فاتح اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وقت ساتھ نہیں دیتا تو میں اس کو ساتھ لوں گا۔اگر سروسامان نہیں تو اسے اپنے ہاتھ سے تیار کرلوں گا۔اگر زمین موافق نہیں تو آسمان کو اترنا چاہیئے اگر آدمی نہیں ملتے تو فرشتوں کو ساتھ دینا چاہیے۔اگر انسانوں کی زبانیں گونگی ہوگئی ہیں تو پتھروں کو چیخنا چاہیئے۔اگر ساتھ چلنے والے نہیں تو کیا مضائقہ درختوں کو دوڑنا چاہیئے اگر دشمن بے شار ہیں تو آسمان کی بجلیوں کی بھی کوئی گنتی نہیں اگر رکاوٹیں اور مشکلیں بہت ہیں تو پہاڑوں اور طوفانوں کو کیا ہو گیا ہے کہ راہ صاف نہیں کرتے وہ زمانہ کی مخلوق نہیں ہوتا کہ زمانہ اس سے اپنی چاکری کرائے وہ وقت کا خالق اور عہد کا پالنے والا ہوتا ہے وہ زمانوں کے حکموں پر نہیں چلتا بلکہ زمانہ آتا ہے تاکہ اس کی جنبش لب کا انتظار کرے وہ دنیا پر اس لئے نظر ڈالتا کہ کیا کیا ہے جس سے دامن بھر لوں وہ یہ دیکھنے کے لئے آتا ہے کہ کیا کیا نہیں ہے جس کو پورا کروں۔" ۵۷

طوالت کے خوف سے بہت زیادہ مثالیں نہیں دی جاسکتیں (مشت نمونہ از خروارے کے مصداق دو ہی تراشے پیش کیے گئے ہیں) مولانا آزاد کے اسلوب نگارش کے متعلق اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ مولانا کا اسلوب جس تشکیلی عناصر سے مرتب ہوا ہے اس کے خمیر میں عربی، فارسی شعر و ادب کے گہرا اثرات، قرآن پاک سے والہانہ شغف، مطالعے کی وسعت اور تبحر علمی، دانشورانہ بصیرت اور فکر انگیزی، ایمان اور راز عان کی کیفیت کے علاوہ بلند آہنگی، خطابت کا جوش وغیرہ سبھی شامل ہیں۔اردو کے بلند پایہ نقاد پروفیسر رشید احمد صدیقی نے مولانا آزاد کی انشاء پردازی کی تعریف کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے:۔

"یہ بے مثل اسلوب جس میں عجم کے حسن طبیعت اور عرب کے سوز دروں کے ساتھ شکوہ تر کمانی، ذہن ہندی اور نطق اعرابی بھی ملتا ہے مولانا پر ختم ہو گیا۔"۱۷

حواشی:۔

۱۔تذکرہ مشمولہ آئینہ ابوالکلام آزاد، محمد مجیب فاروق اگلی،

۲۔"تذکرہ"۔مالک رام۔پیش لفظ ص۷تا۸

۳۔ایضاً۔

۴۔ایضاً۔ص۔۳۳۷۔۳۳۸

۵۔مولانا آزاد فکر وفن ملک زادہ منظور ص۔183

۶۔یضاً۔

۷۔یضاً۔

۸۔یضاً۔

۹۔"صحیفۂ محبت" مرتبہ محمود الٰہی۔ص۳۶۷

۱۰۔تذکرہ۔ص۵

۱۲۔خط بنام سید سلیمان ندوی

۱۳۔تذکرہ۔ص

۱۴۔مکاتیب آزاد۔دبستان لاہور۔باراول ص۔۵۶۔۵۵)و(تذکرہ۔ص۱۵)

۱۵۔مولانا ابوالکلام آزاد فکر وفن۔ص۱۹۲

۱۶۔کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست۔ (تذکرہ۔ص۲۷۔۲۶

۱۷۔مولانا آزاد فکر وفن۔ص۱۹۱

۱۸۔میر کارواں۔ص۲۱۵

۱۹۔ مولانا آزاد فکر و فن۔ ص ۱۹۳

۲۰۔ تذکرہ۔ مولانا ابوالکلام آزاد ص ٦٠

۲۱۔ ایضاً۔ ص ۵۱

۲۲۔ ایضاً۔ ص۔ ۵۱

۲۳۔ ایضاً۔ ص۔ ٦۳

۲۴۔ ایضاً۔ ص۔ ٦۳ تا ٦۴

۲۵۔ ایضاً۔ ص۔

۲٦۔ ایضاً۔ ص۔ ٦۸

۲۷۔ ایضاً۔ ص۔ ۷۴

۲۸۔ ایضاً۔ ص۔ ص ۸۱

۲۹۔ ایضاً۔ ص۔ ۸۲

۳۰۔ ایضاً۔ ص۔ ۸۳

۳۱۔ ایضاً۔ ص۔ ۸۳۔۸۴

۳۲۔ ایضاً۔ ص۔ ۹۱

۳۳۔ ایضاً۔ ص۔ ۹۷

۳۴۔ ایضاً۔ ص۔۔ ۱۰۴۔۱۰۵

۳۵۔ "میر کارواں"۔ مولانا آزاد۔ ۲۱٦

۳٦۔ آئینہ مولانا آزاد۔ ۱۷۷۔۱۷۸

۳۷۔ تذکرہ۔ ۱۰٦

۳۸۔ میر کارواں۔ ۲۱۷

۳۹۔ تذکرہ۔ ۱۰۸۔۱۰۹

۴۰۔ایضاً۔ص۔۱۱۰

۴۱۔ایضاً۔ص۔۱۱۳

۴۲۔ایضاً۔ص۔۱۱۱۔۱۱۲

۴۳۔ایضاً۔ص۔۱۳۲۔۱۳۳

۴۴۔ایضاً۔ص۔۱۳۴۔۱۳۸۔۱۳۹

۴۵۔ایضاً۔ص۔۱۴۳۔۱۴۴

۴۶۔دعوت وعزیمت۔حصہ دوم۔۲۶۷

۴۷۔تذکرہ۔۱۵۸۔۱۶۸

۴۸۔ایضاً۔ص۔۱۶۰۔۱۶۱

۴۹۔ایضاً۔ص۔۱۸۰

۵۰۔ایضاً۔ص۔۱۸۱

۵۱۔ایضاً۔ص۔۱۹۷۔۳۱۰

۵۲۔ایضاً۔ص۔۲۰۴

۵۳۔ایضاً۔ص۔۲۲۷

۵۴۔ایضاً۔ص۔۲۶۳

۵۵۔ایضاً۔ص۔۲۷۴

۵۶۔ایضاً۔ص۔۳۰۹۔۳۱۰

۵۷۔ایضاً۔ص۔۳۱۰

۵۸۔ایضاً۔ص۔۳۱۲

۵۹۔ایضاً۔ص۔۳۱۴۔۳۱۶

۶۰۔تذکرہ مرتبہ مالک رام ص۔

۶۱۔ایضاً۔

۶۲۔ایضاً۔

۶۳۔ایضاً۔

۶۴۔ایضاً۔

۶۵۔ایضاً۔

۶۶۔امیر کارواں مولانا عبیدالرحمٰن شروانی

۶۷۔تذکرہ ۔

۶۸۔ایضاً۔

۶۹۔ایضاً۔

۷۰۔ایضاً۔

۷۱۔تذکرہ مشمولہ آئینۂ ابوالکلام آزاد
محمد مجیب فاروق اگلی

۷۲۔صحیفہ محبت۔مہدی افادی

۷۳۔اسلوبیات

۷۴۔تذکرہ

۷۵۔تذکرہ

☆☆☆

ترجمان القرآن

قرآنی بصیرت کا ترجمان

قدرت کا ایسا نظام رہا ہے کہ ہر دور میں اُمت کی اصلاح کے لئے انبیائے کرام کے بعد ایسے مصلحین، مجددین کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں پیدا کیا جنہوں نے اپنے علم وحکمت اور مصلحانہ صلاحیتوں سے محیر العقول خدمات انجام دیئے ہیں۔ اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد جن کی ذات گوناگوں اوصاف وکمالات کا مجموعہ تھی۔ ان کی شخصیت اس ہست پہل ہیرے کی مانند ہے جس کا ہر پہلو درخشاں، روشن اور نیر تاباں ہے۔ جن کے وقار تمکنت، علم وادب میں بلندی، سیاست میں فراست، دینی ودنیاوی امور میں تبحر اور دانشوری وقیادت میں سبقت کی وجہ سے دنیا انہیں 'امام الہند' کے نام سے جانتی ہے۔ ان کی تصنیفات مسلمان کے ذہنی سانچے کو درست کرنے اور ان کے اندر بصیرت اور عزیمت پیدا کرنے کے لئے خضر راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ نے جس میدان میں قلم کی جولانیاں دکھائیں۔ وہاں منفرد اور ممتاز رہے۔ یہ وہ شخصیت ہے جن کے قلب پر افادیت قرآنی کا القاء ہوتا تھا۔ ایک عالی نگاہ عالم دین اور دیدہ ور مفکر کی حیثیت سے قرآن عزیز کی حیرت انگیزی اور اعجاز بیانی پر غور کیا۔ شاہکار تصنیف ''ترجمان القرآن'' میں قرآنی آیات سے استدلال اور ان کی توضیح وتشریح کرتے ہوئے قرآن کے اعجاز کو خوب آشکارا کیا ہے۔ قرآن کے اسالیب، تعبیرات اور الفاظ کے موقع استعمال کی بلاغت واضح کی۔ لغوی، لسانی، تشریحات کے علاوہ ترجمہ کی نزاکتوں پر بھی

بھرپور روشنی ڈالی۔'ترجمان القرآن' پر اظہار خیال کرنے سے قبل ضروری سمجھتا ہوں کہ لفظ تفسیر کی تعریف، ماخذ پر بھی اجمالی غور کرتا چلوں۔

تفسیر کے لغوی معنی ہیں کھولنا، کسی چیز کو واضح کرنا، بیان کرنا اور تفصیل سے ذکر کرنا۔ یہ لفظ تین حروف (ف س ر) فسر سے مشتق ہے جس کے معنی اظہار و بیان ہیں۔ مشہور مفسر ابو حیان نے لفظ تفسیر کی تعریف کرتے ہوئے اسے کشف و اظہار کے مفہوم کا مترادف قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ

''سواری کا پالان اتار کر اس کی پیٹھ ننگی کرنے کو تفسیر کہتے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ کشف و اظہار کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس لئے کہ زین اتار دینے سے پیٹھ مکمل طور پر ننگی ہو جاتی ہے۔''[1]

امام جلال الدین سیوطی نے اپنی تصنیف ''الاتقان علوم القرآن'' میں تفسیر کی تعریف اس طرح کی ہے۔

''تفسیر ایسا علم ہے جس کی رو سے نبی کریم ﷺ پر نازل شدہ قرآن کے معانی سمجھے جاتے ہیں اور اس کے احکام و مسائل اور اسرار حکم سے بحث کی جاتی ہے.........''[2]

''تفسیر ایک ایسا علم ہے جس مین قرآنی آیت کے نزول، ان کے واقعات اور اسباب نزول نیز مکی و مدنی، محکم و متشابہ، ناسخ و منسوخ، مطلق و مقید، مجمل و مفصل، حلال و حرام، وعدہ وعید، امر و نہی، اور عبرت اور امثال وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔''[3]

مولانا محمد شفیع عثمانی نے معارف القرآن جلد اول کے مقدمہ میں لفظ تفسیر کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں۔

''عربی زبان میں تفسیر کے لفظی معنی ہیں کھولنا، اور اصطلاح میں علم تفسیر اس علم کو کہتے ہیں جس میں قرآن کریم کے معانی بیان کئے جائیں اور اس کے

کو پروان چڑھایا۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں سے کسی کی تشریح وتاویل سے کلی یا جزوی طور پر اختلاف بھی ہوتا رہا ہے۔ تابعین کے بعد تبع تابعین نے بھی اپنے علم، فہم، فراست، تدبر سے علم تفسیر کے ذخیرے میں قابل قدر اضافہ کر کے کارنامے انجام دیئے۔ جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا ہمارے علمائے اپنی اپنی فہم وفراست اور زمانے کے تقاضے کے مطابق اس علم میں اضافہ کرتے چلے گئے۔ عہد رسالت کے بعد دنیا کی کسی کتاب پر اتنے غور وفکر، تدبر وتفکر اور مطالعہ وتحقیق نہیں کی گئی جتنا کہ قرآن کریم کی گئی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی قرآنی فکر کے ارتقاء اور تشکیل کا سرچشمہ ان کے طویل وعظیم مطالعہ سے بھی وابستہ ہے اور خاندانی صفات وتوارث سے بھی۔ ان کی پیدائش مکہ معظمہ میں ہوئی۔ ان کی مادری زبان عربی تھی۔ ان کے والد مولانا خیرالدین کے نانا مولانا منورالدین حضرت شاہ عبدالعزیز کے تلمیذ رشید تھے۔ مولانا خیرالدین کی تعلیم وتربیت اپنے نانا مولانا منورالدین کی سرپرستی میں مکہ معظمہ میں ہوئی اور وہیں ان کی شادی شیخ محمد طاہر وتری مفتی مدینہ منورہ کی بھانجی سے ہوئی جن کے بطن سے مولانا آزاد پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مکہ معظمہ میں ہوئی۔ پانچ برس کی عمر میں مولانا آزاد کی تقریب بسم اللہ شیخ عبداللہ مراد خطیب حرم شریف کے ہاتھوں ہوئی۔ کلام پاک اپنی خالہ سے پڑھ کر ختم کیا جو بہت ہی خوش آواز تھیں۔ کلکتہ آنے پر ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد کے مبارک ہاتھوں سے پوری ہوئی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے متعدد اساتذہ کرام کے سامنے زانوے ادب تہہ کرتے ہوئے گھریلو ماحول میں درسی تعلیم ۱۹۰۴ میں مکمل کیا۔ کسی مدرسے میں باضابطہ تعلیم پا کر سند تو نہیں حاصل کی۔ لیکن جو تعلیم انہیں خاندانی ورثے میں ملیں ان میں وہ تمام نصاب شامل ہیں جو کسی مدرسے میں رہ کر پا سکتے تھے۔ بعد میں انہوں نے اپنی پسند کا مطالعہ شروع کیا جس میں قرآن کا مطالعہ سرفہرست ہے۔

''ترجمان القرآن'' کی اشاعت مولانا کی زندگی کا ایک اہم کارنامہ ہے اور ان کی مذہبی بصیرت ودانشوری کا سب سے بڑا شاہکار بھی۔ مولانا نے البلاغ کے پہلے شمارہ

(12 نومبر 1915ء) کے سرورق پر یہ اعلان شائع کیا تھا:۔

" ترجمان القرآن یعنی قرآن حکیم کا اردو ترجمہ اثر خامہ ایڈیٹر الہلال۔آسمانی صحائف و اسفار کے حقیقی حامل و مبلغ حضرات انبیاء کرام و رسل عظام ہیں پس ان کی تبلیغ وتعلیم اورنشر وتوزیع کا مقدس کام دراصل ایک پیغمبرانہ عمل ہے جس کی توفیق صرف ان ہی لوگوں کو مل سکتی ہے جنہیں حق تعالٰی انبیاء کرام کی معیت وتبعیت کا درجہ عطا فرماتا ہےاوران کا نور علم براہ راست مشکوۃ نبوت سے ماخوذ ہوتا ہے۔ وذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔"

ہندوستان کی گزشتہ قرون اخیرہ میں سب سے پہلے جس مقدس خاندان کو اس خدمت کی توفیق ملی وہ حضرت شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان تھا۔ان کے فرزند حجۃ الاسلام امام الاعلام، مجدد العصر حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ تھے جنہوں نے سب سے پہلے قرآنِ حکیم کے ترجمہ کی ضرورت الہام الٰہی سے محسوس کی اور فارسی میں اپنا عدیم النظیر ترجمہ مرتب کیا۔ان کے بعد حضرت شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہما کا ظہور ہوا اور اردو زبان میں ترجمۃ القرآن کی بنیاد استوار ہوئی۔شکر اللہ سعیہم رجعل الجنۃ مثواھم! اس واقعہ پر ٹھیک ایک صدی گزر چکی ہے لیکن یہ کہنا کسی طرح مبالغہ آمیز نہ سمجھا جائے گا کہ نشر وتبلیغ قرآن حکیم کی جو بنیاد اس خاندان بزرگوں نے رکھی تھی اس کی تکمیل کا شرف حق تعالٰی نے ایڈیٹر 'الہلال' کے لیے مخصوص کر دیا تھا جنہوں نے بعض داعیان حق وعلم کے اصرار سے اپنے انداز ممتاز و بلاغت وانشاء مخصوص وفہم حقائق ومعارف قرآنیہ وضروریات واحتیاجات وقت کو ملحوظ رکھ کر قرآن حکیم کا یہ اردو ترجمہ نہایت سلیس، عام فہم، معنی خیز، حقیقت فرما عبارت

میں مرتب کیا ہے اور بحمد اللہ کہ زیر طبع ہے۔

یہ ترجمہ کیسا ہے؟ ان لوگوں کے لیے جو "الہلال" کا مطالعہ کر چکے ہیں، اس کا جواب دینا بالکل غیر ضروری ہے۔ یہ ترجمہ حامل المتن ٹائپ کی جگہ لیتھو میں چھاپا جا رہا ہے تاکہ ارزاں ہو اور بچوں، عورتوں سب کے مطالعہ میں آسکے۔ قیمت فی جلد چھ روپیہ رکھی گئی ہے لیکن جو حضرات اس اعلان کو دیکھتے ہی قیمت بھیج دیں گے ان سے صرف ساڑھے چار روپے لیے جائیں گے۔"۵

مولانا "ترجمان القرآن" کے دیباچے میں اپنے تصنیفی پروگرام کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"البلاغ میں جب ترجمے اور تفسیر کا اعلان کیا گیا ہے تو ترجمہ پانچ پاروں تک پہنچ چکا تھا۔ تفسیر سورہ آل عمران تک مکمل ہو چکی تھی اور مقدمہ یادداشتوں کی شکل میں قلمبند تھا۔ اس خیال سے کہ تھوڑے وقت کے اندر زیادہ سے زیادہ کام انجام پا جائے میں نے تصنیف کے ساتھ چھپائی کا سلسلہ بھی جاری کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح سال بھر کے اندر ترجمہ مکمل بھی ہو جائے گا اور چھپ بھی جائے گا۔ نیز تفسیر کی بھی کم از کم پہلی جلد شائع ہو جائے گی۔ ہر سات دن کی مشغولیت میں نے یوں تقسیم کر رکھی تھی کہ تین دن البلاغ کی ترتیب میں صرف کرنا تھا، دو دن ترجمے میں اور دو دن تفسیر میں۔"۶

لیکن جب 23 مارچ 1916 کو حکومت بنگال نے ڈیفینس آف انڈیا آرڈیننس کے تحت مولانا آزاد کو بنگال چھوڑنے کا حکم صادر کیا تو 30 مارچ 1916ء کو مولانا رانچی کے لیے روانہ ہوئے۔ لکھتے ہیں:۔

"30 مارچ 1916ء کو جب میں کلکتے سے روانہ ہوا تو تفسیر کے چھ فارم

چھپ چکے تھے اور ترجمے کی کتابت شروع ہو رہی تھی۔ اب میں نے کوشش کی کہ میری عدم موجودگی میں پریس جاری رہے اور کم از کم تفسیر اور ترجمہ کا کام ہوتا رہے۔ چنانچہ جون 1916ء میں پریس کے دوبارہ اجراء کا انتظام ہو گیا اور میں مسودات کی ترتیب میں مشغول ہوا تا کہ پریس کے حوالے کر دوں۔''[۷]

مولانا آزاد نے ''ترجمان القرآن'' کی اشاعت کا بیڑہ اس لیے اٹھایا کہ ان کا مقصد مسلمانوں کی مذہبی اصلاح تھا اور وقت کا تقاضا بھی۔ انہیں اس کا احساس اور زبردست احساس تھا کہ مسلمانوں کی مذہبی اصلاح کے لیے قرآن کی تعلیم و اشاعت کا جیسا انتظام ہونا چاہیے، اس عہد میں اس کا فقدان ہے جو مذہبی اصلاح کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ لہٰذا انہوں نے ترجمان کی اشاعت کے توسط سے اپنے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی سعیِ مستحسن کی ہے۔ ''ترجمان القرآن'' کی پہلی جلد کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

''مذہبی اصلاح کے لیے سب سے پہلی چیز یہ تھی کہ وقت کی ضروریات کے مطابق قرآن کی تعلیم و اشاعت کا سروسامان ہو۔ لیکن بدقسمتی سے اس کا کوئی سامان موجود نہ تھا۔

قرآن کی تعلیم و اشاعت کے لیے حسب ذیل امور ضروری تھے:

۱۔ سب سے پہلے وہ مشکلات دور ہوں جو قرآن کے فہم و تدبر کی راہ میں پیدا ہو گئی ہیں اور جن کی وجہ سے اس کی تعلیم اپنی حقیقی شکل و نوعیت میں نمایاں نہیں ہو سکتی۔ جب تک یہ مشکلات دور نہیں ہوتیں قرآن کا ترجمہ کر دینا یا کسی نئی تفسیر کا لکھ دینا کچھ سودمند نہ تھا۔

۲۔ پھر ضروری تھا کہ ایک ایسی کتاب اردو میں تیار ہو جائے جس کی نسبت وثوق سے کہا جا سکے کہ اس کا پڑھ لینا قرآن کے مقاصد و مطالب سمجھ لینے اور

اسے اس کی حقیقی شکل ونوعیت میں دیکھ لینے کے لیے کافی ہے۔ وہ نہ تو اس قدر ضخیم ہو کہ ہر شخص اس کے مطالعے کے لیے وقت نہ نکال سکے، نہ اس قدر مختصر ہو کہ مطالب کی وضاحت تشنہ رہ جائے۔ اس کی نوعیت ترجمہ ہی کی ہو۔ لیکن ایسا ترجمہ کہ اپنی وضاحت میں کسی دوسری چیز کا محتاج نہ ہو۔

۳۔ بحیثیت مجموعی اس کی نوعیت ایسی ہو کہ قرآن کے درس ومطالعے کے لیے معیار تعلیم کا کام دے۔

۴۔ مطالب قرآنی کی عالم گیر اشاعت کے لیے اسے تمام زبانوں میں منتقل کیا جا سکے اور نقل وترجمہ کے لیے ایک بنیادی معیار قائم ہو جائے۔ بد قسمتی سے ایسی کوئی کتاب موجود نہ تھی۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ تھا کہ اصلاح کے جس گوشے میں بھی قدم اٹھایا جاتا راہ عمل یک قلم مسدود دکھائی دیتی۔

'اصلاح' کے لیے پہلا کام یہ تھا کہ مسلمانوں کو قرآن کے براہ راست مطالعہ وعمل کی دعوت دی جائے، لیکن یہ دعوت کچھ سودمند نہ تھی جب کہ قرآن کے فہم ومطالعے کا سامان مفقود تھا۔

اصلاح کے لیے ضروری تھا کہ مدارس میں مذہبی تعلیم کا صحیح طریقے پر اہتمام کیا جائے، لیکن مذہبی تعلیم میں اصل اصول قرآن ہے اور چونکہ قرآن کی تعلیم کا کوئی سامان نہ تھا، اس لیے مذہبی تعلیم کا بھی کوئی نظام قائم نہیں ہو سکتا تھا۔

اصلاح کا ایک نہایت اہم گوشہ مدارس عربیہ کی اصلاح ہے، لیکن اس گوشے میں بھی سب سے بڑی رکاوٹ یہی رہی کہ تفسیر کی کوئی موزوں کتاب موجود نہیں۔ ہم دنیا کو بھی قرآن کے مطالعے کی دعوت نہیں دے سکتے، کیونکہ اگر دنیا کی مختلف قومیں مطالعہ کرنا چاہیں تو ہمارے پاس کوئی کتاب موجود نہیں جو

ان زبانوں میں پیش کی جا سکے اور یہ کہا جا سکے کہ یہ موقع ہے جس میں قرآن
کی صورت دیکھ لی جا سکتی ہے۔''۸

8/جولائی 1916ء کو حکومت ہند نے اچانک مولانا کی نظر بندی کے احکام جاری کر دیے۔ ایک ہی وقت میں رانچی اور کلکتہ دونوں جگہ تلاشی لی گئی۔ دو مرتبہ رانچی اور تین مرتبہ کلکتہ میں یہ واقعہ پیش آیا۔ مولانا لکھتے ہیں:۔

''نظر بندی کے احکام جس وقت نافذ کیے گئے ہیں تو میرے قیام گاہ کی تلاشی بھی لی گئی تھی اور جس قدر کاغذات ملے تھے افسرانِ تفتیش نے اپنے قبضے میں کر لیے تھے۔ انہیں میں ترجمہ اور تفسیر کا مسودہ بھی تھا لیکن جب معائنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں کوئی چیز قابل اعتراض اور حکومت کے مفید مقصد کی نہیں ہے تو دو ہفتے کے بعد واپس دے گئے۔''۹

حکومت کو اس کی اطلاع بھی دے دی گئی لیکن حکوت ہند کو مقامی افسران کے فیصلے سے اتفاق نہ ہوا۔ ان کا خیال تھا کہ معائنے میں کمی رہ گئی ہے۔ اس زمانے میں حکومت ہند کے محکمہ تفتیش کا اعلیٰ افسر سر چارلس کلیولینڈ تھا۔ پہلے وہ کلکتہ آیا۔ وہاں دو ہفتے تک تفتیش کرتا رہا۔ پھر رانچی پہنچ کر تمام مکان کی تلاشی لی اور تمام کاغذات جو پچھلی دفعہ واپس کیے گئے تھے کے علاوہ مطبوعہ کتابیں بھی ضبط کر لی۔ ان کاغذات میں تفسیر و ترجمہ کے قرآن مجید کے آٹھ پاروں کے ترجمہ ہی کیے تھے اور تفسیر کا کام سورۃ النساء تک ہو چکا تھا۔ مولانا مسودات کی ضبطی سے دل برداشتہ ضرور ہوئے لیکن ہار ماننے والے کب تھے۔ مصائب سے نبرد آزما اور برسر پیکار ہونے کا ہنر انہیں خوب آتا تھا۔ وہ ہمت نہیں ہارے اور نویں پارے سے ترجمہ کا کام شروع کیا اور 1918ء تک اسے مکمل کر لیا۔

ترجمان القرآن کا انتساب:۔ رانچی میں ہی مولانا کے ساتھ اس شخص کا واقعہ پیش آیا جو سرحد پار سے مولانا سے قرآن سمجھنے کے لیے آیا تھا۔ مولانا پہلے سے اس شخص سے بالکل واقف نہیں تھے۔

یہ واقعہ 1918ء میں پیش آیا۔ مولانا نے اپنی کتاب "ترجمان القرآن" کا انتساب اسی شخص کے نام کیا ہے۔ ملاحظہ ہو متن

"غالباً دسمبر 1918ء کا واقعہ ہے کہ میں رانچی میں نظر بند تھا۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکلا تو مجھے محسوس ہوا کوئی شخص پیچھے آ رہا ہے۔ مڑ کر دیکھا تو ایک شخص کمبل اوڑھے کھڑا تھا:

آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟

ہاں جناب، میں بہت دور سے آیا ہوں۔

کہاں سے؟

سرحد پار سے۔

یہاں کب پہنچے؟

آج شام کو پہنچا، میں بہت غریب آدمی ہوں۔

قندھار سے پیدل چل کر کوئٹہ پہنچا۔ وہاں چند ہم وطن سوداگر مل گئے تھے، انہوں نے نوکر رکھ لیا اور آگرہ پہنچا دیا۔ آگرے سے یہاں تک پیدل چل کر آیا ہوں۔ افسوس تم نے اتنی مصیبت کیوں برداشت کی؟

اس لیے کہ آپ سے قرآن مجید کے بعض مقامات سمجھ لوں۔ میں نے 'الہلال' اور 'البلاغ' کا ایک ایک حرف پڑھا ہے۔

یہ شخص چند دنوں تک ٹھہرا اور یکایک واپس چلا گیا۔ وہ چلتے وقت اس لیے نہیں ملا کہ اسے اندیشہ تھا میں اسے واپسی کے مصارف کے لیے روپیہ دوں گا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بار مجھ پر ڈالے۔ اس نے یقیناً واپسی میں بھی مسافت کا بڑا حصہ پیدل طے کیا ہوگا۔"۹ (الف)

مولانا آزاد نے پوری کوشش کی کہ کسی طرح سے آٹھ پاروں کا ترجمہ گورنمنٹ سے

مل جائے۔ کاغذات کی واپسی کے لیے خط و کتابت بھی کی۔ جواب ملا کہ سردست واپس نہیں دیے جاسکتے ہیں۔ آخر مجبور ہو کر دوبارہ آٹھ پاروں کا ترجمہ کیا۔ لکھتے ہیں:۔

''چونکہ کتاب کی واپسی کی بظاہر کوئی قریبی امید نظر نہیں آتی تھی اور کچھ معلوم نہ تھا کہ آگے چل کر کیا صورت پیش آتے۔ اس لیے بھی مناسب معلوم ہوا کہ ازسرنو اُن پاروں کا ترجمہ کر کے کتاب مکمل کر لی جائے۔ کام آسان نہ تھا۔ ایک لکھی ہوئی چیز کو دوبارہ لکھنا طبیعت پر بہت شاق گذرتا ہے۔ تاہم میں نے چند ماہ کی محنت کے بعد حصہ بہ حصہ بھی ازسرنو مکمل کر لیا............اس خیال سے کہ مسودہ بہتر حالت میں مرتب ہو جائے اور اگر کسی دوسرے شخص کے حوالے کیا جائے تو تصحیح میں آسانی ہو۔ میں نے اردو ٹائپ رائٹر منگوا کر اسے ٹائپ کرانا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ دسمبر 1919ء میں نصف سے زیادہ حصہ ٹائپ ہو چکا تھا۔''[10]

1921ء میں ملک کے ہر خطے سے ترجمان القرآن کے لیے جب تقاضے شروع ہونے لگے تو مولانا کو اس کی اشاعت کے لیے آمادہ ہونا پڑا۔ لہٰذا ٹائپ کی چھپائی اس کے لیے موزوں نہ سمجھتے ہوئے اس کی کتابت شروع کی گئی۔ پہلے متن کی کتابت کرائی گئی جو نومبر 1921ء تک تکمیل کو پہنچی۔ پھر ترجمہ کی کتابت شروع ہوئی تھی کہ تحریک عدم تعاون کی سرگرمیاں عروج کو پہنچ گئیں۔ یکم جولائی اور 15 جولائی 1921ء کو مرزا پور میں عدم تعاون اور بائیکاٹ کے مضمون پر تقریر کرنے کے جرم میں 10 دسمبر 1921 کو بعض دوسرے بنگال کے ساتھیوں کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی دفعہ 124 الف۔ تعزیرات ہند کے تحت گرفتار کر لیا گیا لیکن یہ گرفتاری اس وقت ترجمان القرآن کی اشاعت میں رکاوٹ نہ بن سکی۔ اس لیے کہ مکمل مسودہ پریس میں تھا۔ مگر ایک نیا حادثہ یہ پیش آیا کہ جب حکومت کو مولانا آزاد کی گرفتاری کے بعد مقدمہ چلانے کے لیے کوئی مواد دستیاب نہیں ہوا تو اس کی تلاش میں مولانا آزاد کے گھر اور

پریس کی خانہ تلاشیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف بے شمار مسودات بلکہ کتابت کی ہوئی کاپیوں کا بھی تمام ذخیرہ دوسرے کاغذات کے ساتھ گڈمڈ کر کے پولس اپنے ساتھ لے گئی۔

تقریباً پندرہ ماہ بعد 26 جنوری 1922ء مولانا آزاد ان کاغذات کی واپسی کی کوشش کر سکے اور اس میں انہیں کامیابی ہوئی اور کاغذات واپس ملے لیکن وہ کسی کام کے نہ تھے، برباد ہو چکے تھے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''افسرانِ تفتیش نے جب ان کاغذات پر قبضہ کیا ہے تو یہ قلمی مسودات کے مختلف مجموعے تھے اور الگ الگ پٹھوں کے دفیتوں میں ترتیب دیے ہوئے تھے۔ ان میں مختلف مکمل و غیر مکمل تصنیفات کے علاوہ بڑا ذخیرہ یادداشتوں کا تھا، لیکن جب واپس ملے تو محض اوراق پریشاں کا ایک ڈھیر تھا اور نصف سے زیادہ اوراق یا تو ضائع ہو چکے تھے یا اطراف سے پھٹے ہوئے اور پارہ پارہ تھے۔''[۱۱]

مولانا آزاد کی تحریر سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں اس حادثہ سے کس قدر اذیت پہنچی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ میرے صبر و شکیب کے لیے زندگی کی سب سے بڑی آزمائش تھی لیکن میں نے کوشش کی کہ اس میں بھی پورا اتروں، یہ سب سے زیادہ تلخ گھونٹ تھا جو جامِ حوادث نے میرے لبوں کو لگایا، لیکن میں نے بغیر کسی شکایت کے پی لیا، البتہ اس سے انکار نہیں کرتا کہ اس کی تلخی آج تک گلوگیر ہے:

رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے۔''[۱۲]

ان حالات میں مولانا آزاد کو اس کا اندازہ ہو گیا تھا کہ سیاسی زندگی کی مصروفیات

کے ساتھ ادبی کاموں کا سلسلہ جاری نہیں رکھا جا سکتا اور اگر رکھا جائے تو اس کا کوئی اچھا نتیجہ نہیں نکل سکتا، اپنے اس خیال کا اظہار انہوں نے اس طرح کیا ہے:

''سیاسی زندگی کی شورشیں اور علمی زندگی کی جمعیتیں ایک زندگی میں جمع نہیں ہوسکتیں اور پنبہ و آتش میں آتشی محال ہے۔ میں نے چاہا دونوں کو بیک وقت جمع کروں۔ میں نامراد ایک طرف متاعِ فکر کے انبار لگاتا رہا، دوسری طرف برقِ خرمن سوز کو بھی دعوت دیتا رہا، نتیجہ معلوم تھا اور مجھے حق نہیں کہ حرفِ شکایت زباں پر لاؤں، عرفی نے میری زبانی کہہ دیا ہے:

زاں شکستم کہ بہ دُنبالِ دلِ خویش مدام
در نشیبِ شکنِ زلفِ پریشاں رفتم''[۱۳]

ترجمان القرآن کی پہلی جلد جو سورۃ الانعام تک محیط ہے۔ ۱۹۳۰ میں شائع ہوئی۔ اس کے دیباچے میں مولانا آزاد نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تصنیف کے محرکات کے سلسلے میں ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

'' کامل ستائیس برس سے قرآن میرے شب و روز کے فکر و نظر کا موضوع رہا ہے۔ اس کی ایک ایک سورہ، ایک ایک مقام، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں قطع کی ہیں اور مرحلوں پر مرحلے طے کئے ہیں تفسیر و کتب کا جتنا مطبوعہ و غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا بڑا حصہ میری نظر سے گذر چکا ہے اور علوم قرآن کے مباحث و مقالات کا کوئی گوشہ نہیں جس کی طرف سے حتی الوسع ذہن نے تغافل اور جستجو نے تساہل کیا ہو۔۔۔ اس تمام عرصے کی جستجو و طلب کے بعد قرآن کو جیسا کچھ اور جتنا کچھ سمجھ سکا ہوں میں نے اس کتاب کے صفحوں پر پھیلا دیئے۔''[۱۴]

مذکورہ بالا اقتباس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ کلام الٰہی کو غور و فکر، تفکر و تدبر سے

سمجھنا اور سمجھانا مولانا آزاد کے شب و روز کا معمول اور محبوب مشغلہ تھا۔ وہ اس کے بھی متمنی تھے کہ قرآن کی تعلیم کو عوام میں رائج کیا جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے وہ ''الہلال'' کے دور سے ہی 'ترجمان القرآن' کی تحریر کا ارادہ کر رہے تھے اور اس کا اعلان بھی ۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ کے رسالہ 'البلاغ' کے پہلے شمارے میں شائع کر دیا۔ دراصل مولانا کے سامنے تفسیر قرآن مجید کا ایک وسیع منصوبہ تھا اور بہ یک تین چیزیں پیش نظر تھیں جس کا اظہار انہوں نے دیباچہ میں اس طرح کیا ہے۔

> ''۱۹۱۵ میں جب میں نے اس کام کا ارادہ کیا تو بہ یک وقت تین چیزیں پیش نظر تھیں۔ ترجمہ، تفسیر اور مقدمہ تفسیر، میں نے خیال کیا تھا کہ یہ تین کتابیں قرآن کے فہم و مطالعہ کی تین مختلف ضرورتیں پوری کر دیں گی۔ عام تعلیم کیلئے ترجمہ، مطالعہ کے لئے تفسیر اہل علم و نظر کے لئے مقدمہ۔۔۔'' ۱۵

افسوس کہ سیاسی زندگی کی سورشیں اور زندگی کے دوسرے مطالبات کے سبب ان کے منصوبے دوسری اور تیسری کڑی کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا لیکن کڑی 'ترجمان القرآن' کی صورت میں اسی دیرینہ خواب کی تابندہ تعبیر ہے۔ 'ترجمان القرآن' قرآن مجید کی مکمل تفسیر پہلی نہیں بلکہ اسے توضیحی ترجمہ کا نام دیا جانا زیادہ مناسب ہے۔ اس کی وضاحت مولانا نے دیباچے میں کر دی ہے لیکن پھر بھی ماہرین کے درمیان بحث کا موضوع ہے کہ ترجمان القرآن کس نوعیت کی کتاب ہے۔ ترجمہ کی یا تفسیر کی بقول سید سلیمان ندوی وہ تفسیری ترجمہ ہے یا اسے ترجمانی قرآن کہا جا سکتا ہے۔ غلام رسول میر اسے ترجمہ و تفسیر کے درمیان کی کڑی تسلیم کرتے ہیں جبکہ ڈاکٹر ملک زادہ منظور اسے مفصل ترجمہ اور مجمل تفسیر قرار دیتے ہیں۔ پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی اسے 'توضیحی ترجمہ' مانتے ہیں اور میرے نزدیک یہی صحیح ہے اس لئے کہ بقول مولانا آزاد اس کتاب کا مقصد قرآن کی عالم گیر تعلیم و اشاعت ہے۔ کتاب کی اشاعت کے جواز میں وہ خود رقم طراز ہیں:۔

''وہ نہ تو اس قدر ضخیم ہو کہ ہر شخص اس کے مطالعے کے لئے وقت نہ نکال سکے اور نہ اس قدر مختصر ہو کہ مطالب کی وضاحت تشنہ رہ جائے۔ اس کی نوعیت ترجمہ ہی کی ہو لیکن ایسا ترجمہ کہ اپنی وضاحت میں کسی دوسری چیز کا محتاج نہ ہو۔''۱۶

جہاں تک سورہ فاتحہ کا معاملہ ہے وہ اس اصول سے مستثنیٰ ہے۔ مولانا نے اس سورہ کو قرآن مجید کا مقدمہ اور ام الکتاب کہا ہے۔ لہٰذا اس کی بہت لمبی تفسیر لکھ دی ہے جو بڑے سائز کی کتاب کے ۲۲۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ ایسا اس لئے کہا کہ کتاب کے مطالعہ سے پہلے مقدمہ اور سورہ فاتحہ کی تفسیر ذہن میں رہے۔ ترجمان القرآن کی جلد اول جو مقدمہ تفسیر کے علاوہ سورہ فاتحہ اور سورہ الانعام تک ترجمہ اور تشریح پر مشتمل ہے۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۳۱ کے بعد شائع ہوئی تو علمی حلقوں میں اس کا ملا جلا ردعمل ہوا۔ معروف عالم دین اور ماہر اسلامیات سید سلیمان ندوی نے اکتوبر ۱۹۳۲ کے معارف اعظم گڑھ میں ایک مدلل و مفصل تبصرہ لکھا۔

''مصنف ترجمان القرآن کی یہ دیدہ وری داد کے قابل ہے کہ انہوں نے وقت کی روح کو پہچانا اور اس فتنہ افرنگ کے عہد میں اس طرز وروش کی پیروی کی جس کو ابن تیمیہ اور ابن قیم نے فتنہ تاتار میں پسند کیا تھا اور جس طرح انہوں نے اس عہد کے مسلمانوں کی تباہی کا راز فلسفہ یونان کی دماغی پیروی کو قرار دیا۔ اسی طرح اس عہد کے مسلمانوں کی تباہی کا راز فلسفہ یونان کی دماغی پیروی کو قرار دیا۔ اسی طرح اس عہد کے مسلمانوں کی بربادی کا سبب ''ترجمان القرآن'' کے مصنف نے فلسفہ افرنگ و یونان کی ذہنی غلامی کو قرار دیا اور نسخہ علاج وہی تجویز کیا کہ کلام الہٰی کو رسول کی زبان و اصطلاح اور فطرت کی عقل و فلسفہ سے سمجھنا چاہئے''۔۱۷

ترجمان القرآن کی دوسری جلد پانچ حصوں کے بعد ۱۹۳۶ میں شائع ہوئی جو سورہ المومنوں تک

کے ترجمہ اور تفسیری نوٹ پر مبنی تھی۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ پروگرام کے مطابق تیسری جلد بھی دسمبر ۱۹۳۷ تک شائع ہو جاتے اور اس میں بقیہ تمام سورتیں شامل ہوں لیکن بد قسمتی سے شائع نہ ہو سکیں۔ مولانا کے انتقال کے بعد ان کے کاغذات میں ۲۴ ویں سورت سورۃ نور کی تشریحی ترجمہ بھی مل گیا جیسے ترجمان القرآن کے نئے ایڈیشن میں شامل کر دیا گیا۔ ترجمان القرآن کی پہلی دو جلدوں میں قرآن مجید کے تقریبا ساڑھے سترہ پاروں کی تشریح وترجمہ یا تفسیری ترجمہ شامل ہے۔ آزاد کی وفات کے بعد ساہتیہ اکاڈمی نئی دہلی کی جانب سے ترجمان القرآن کو جدید ترتیب کے ماتحت چار جلدوں میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اور اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ مولانا کے انتقال کے کچھ ہی دنوں کے بعد ان کے ایک عقیدت مند مرحوم غلام رسول مہر نے بقیہ پاروں کی ان آیات کی تشریح وترجمہ کو جمع کر کے مرتب کیا جو مولانا کی مختلف تحریروں میں بکھری پڑی تھیں اور ۱۹۲۶ میں 'باقیات ترجمان القرآن کے نام سے شائع کر دیا۔ کتاب میں سورہ نور سے سورہ اخلاص تک ۶۷ سورتوں کی مختلف آیتوں کے ترجمہ وتفسیر وتشریح پر مختص ہے۔ ۱۰ ااصفحات پر مشتمل اس کتاب میں ۱۸ صفحے کا دیباچہ اور ۶۰ صفحے کا مقدمہ بھی مولف نے قلم بند کیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک نکتے کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ ترجمان القرآن کی جلد اول کا دوسرا ایڈیشن جو ۱۹۴۵ میں شائع ہوا میں نقش اول پر کافی اضافے کئے گئے مثلاً سورہ فاتحہ میں جا بجائے مطالب کا اضافہ کیا گیا۔ تصور الہی کے مبحث میں مذاہب عالم کے اعتقادی تصوروں کا ذکر تفصیل سے کیا گیا۔ پہلے ایڈیشن میں صرف ابواب کی تقسیم کی گئی تھی۔ دوسرے ایڈیشن میں حاشیے کے عنوان میں اضافہ کیا گیا۔ ترجمے کے تشریحی نوٹوں میں بھی جا بجا اضافہ کئے گئے۔ اسی طرح پہلی جلد کے مقابلے میں دوسری جلد میں تفسیری مباحث وتفصیلات کو جگہ دی گئی مثلاً سورہ اعراف، سورہ توبہ، سورہ یونس، سورہ یوسف اور سورہ کہف میں تشریحی نوٹوں میں زیادہ تفصیل پیش کی گئی۔

'ترجمان القرآن' کی دونوں جلدوں کی مشمولات وتفصیلات کے بعد یہ ضروری

معلوم ہوتا ہے کہ اس پر روشنی ڈالی جائے کہ مذکورہ کتاب جو مولانا آزاد کی کم وبیش ۵۵ سالہ کا وشوں اورعرق ریزیوں کا ثمرہ ہے۔ اس کی اپنی انفرادیت یا امتیازات کیا ہیں؟ پھر یہ کہ انہوں نے اپنے پیش روؤں یا ہم عصروں سے اس معاملے میں کس حد تک اثرات قبول کئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ترجمان القرآن فکری، علمی، ادبی اور طرز نگارش کے اعتبار سے ایک منفرد تصنیف ہے۔ قرآن فہمی کو عام بنانے میں ترجمان القرآن کے اسلوب نے کلیدی رول ادا کیا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا نے متعدد مفسرین سلف سے استفادہ کرنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی گرچہ ان کا حوالہ وہ کم ہی دیتے ہیں۔ جن مفسرین سلف سے انہوں نے کسب فیض کیا ان میں ابن جریر طبری، زمخشری، واحدی، راغب اصفہانی ، ابن کثیر، ابن تیمیہ، ابن قیم، شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالقادر کے نام اہم ہیں۔ مولانا آزاد امام رازی کے سب سے بڑے ناقد ہونے کے باوجود بھی ان کا بھی اثر قبول کرتے ہیں۔ جہاں تک سرسید کا معاملہ ہے ہم کہہ سکتے ہیں مختلف ملکوں اور مختلف عہد میں لکھی جانے والی تفسیر پر اس عہد اور ماحول کی چھاپ ملتی ہے۔ مولانا آزاد نے خود بھی لکھا ہے۔

''ہر عہد کا مصنف اپنے عہد کی ذہنی آب وہوا کا پیداوارا ہوتا ہے۔''

لہذا ہر دور کے مفسر ومفکر نے اپنے معاصرانہ تقاضوں کے مطابق قرآن کریم کے حقائق ومبادی کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ سرسید نے تفسیر قرآن، انگریزی حکومت کے دور اقتدار میں لکھی لہذا کتاب کی ابتداء میں ہی اسے اس موقف کا اظہار کر دیا کہ ۱۸۵۷ کے بعد مسلمانوں کو جن آشوب وابتلاء سے گذرنا پڑ رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کو بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگ کیا جائے۔ لہذا انہوں نے عقلیت پرستی پر مبنی فکر کو پیش کیا اور سائنسی نقطہ نظر اختیار کرنے کو سب سے زیادہ اہمیت دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض مقامات پر سرسید کی تفسیر بے اعتدالی کا شکار ہوگئی۔ جہاں تک مولانا آزاد کا معاملہ ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرسید کی تفسیر میں جو عقل کی کارفرمائی ہے۔ اس سے انہوں نے اثر قبول نہیں کیا بلکہ قرآن کریم کے

پیغام آفاقیت کو سب سے زیادہ اجاگر کیا ہے۔ پھر یہ کہ مولانا آزاد کا عہد سرسید سے مختلف تھا۔ بقول پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی۔

''یہ وہ وقت تھا جب ملک کے حالات سے بنیادی تبدیلی رونما ہوچکی تھی۔ مسلمانان ہند کی مغربی افکار سے ہم آہنگی کا مسئلہ اتنا اہم نہیں رہا تھا جتنا انیسویں صدی کے نصف آخر میں تھا بلکہ برادران وطن کے دوش بدوش غیر ملکی تسلط سے نجات پانے کا مسئلہ زیادہ اہم ہوگیا تھا۔ اور مولانا آزاد بلاشبہ اس کے بہت بڑے داعی تھے۔ تاہم یہ سمجھنا کسی طرح درست نہ ہوگا کہ مولانا آزاد نے تفسیر قرآن کو اپنے سیاسی عقائد کی ترجمانی کا ذریعہ بنادیا تھی۔''۱۸

مولانا آزاد کے معاصر مفسروں میں ایک قابل ذکر نام مولانا حمیدالدین فراہی کا ہے۔ شبلی کا ذکر میں نے اس لئے نہیں لیا کہ شبلی نے ایسی کوئی تفسیر نہیں لکھی گر چہ سیرۃ النبی میں قرآنی فکر پر مبنی چند نکات ضرور زیر بحث ہیں۔ جہاں تک فراہی کا معاملہ ہے اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی کا یہ اقتباس نقل کرنا زیادہ مناسب ہوگا جس میں انہوں نے اپنے اور مولانا آزاد کے سلسلے میں یہ اعتراف کیا ہے۔

''مولانا شبلی کے اصرار سے کئی دفعہ مولانا فراہی ندوہ میں آکر رہے اور طلبہ کو کبھی فلسفہ جدیدہ اور کبھی قرآن کے سبق پڑھائے۔ میں بھی اس زمانے میں ندوۃ کا طالب علم تھا۔ مولانا کے ان درسوں سے مستفید ہوا۔ اس زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد مولانا شبلی مرحوم کے پاس ندوۃ میں مقیم تھے اور الندوہ کے مددگار ایڈیٹر تھے۔ وہ مولانا حمیدالدین صاحب کی ان صحبتوں سے مسفید ہوتے رہے اور قرآن پاک کے درس ونظر کے نئے راستوں کے نشان پانے لگے اور بالآخر الہلال کے صفحات میں اس جادہ پیمائی کے مختلف مناظر سب کی

نظروں کے سامنے آئے۔''۱۹

بہر حال مولانا آزاد قرآن فکر کے ارتقاء اور تشکیل میں مولانا اپنے پیش رواں اور معاصرین مفسرین و مفکرین سے شعوری یا غیر شعوری پر ضرور اثر پذیر ہوئے اور ان کے بہت سے خیالات و نظریات سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے ذہنی سفر کو طے کرتے ہیں۔ لیکن مطالعہ قرآن میں انہوں نے بیشتر قدیم مسلم مفکرین کا ابطال بھی کیا ہے۔ کہتے ہیں۔

''جب مفسرین نے دیکھا کہ وہ قرآنی تفکر کی بلندیوں کو نہیں چھو سکتے تو اسے انہوں نے اپنی ذہنی سطح پر اتارنے کی کوشش کی۔''

ترجمان القرآن کی اپنی انفرادیت:۔ ترجمان القرآن بلاشبہ ایک بہت ہی جامع و مبسوط تصنیف ہے جس میں قرآنی آیات کے معنی و مفہوم کی تفسیر و توضیح کی گئی ہے اور ان کے اسرار و حکم کو واشگاف کیا گیا ہے۔ خود کہتے ہیں۔

''اس کی ترتیب سے یہ مقصود ہے کہ مطالب قرآنی کے فہم و تدبر کے لئے ایک ایسی کتاب تیار ہو جائے جس میں کتب تفسیر کی سی تفصیلات تو نہ ہوں لیکن وہ سب کچھ ہو۔ جو قرآن کو ٹھیک سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔''

آیئے! اب ترجمہ، تفسیر اور اسلوب کے لحاظ سے ترجمان القرآن پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے۔ سب سے پہلے سورہ فاتحہ جیسے مولانا قرآن کا دیباچہ کیا ہے۔ ترجمہ اور تفسیر کا تجزیہ کیا جائے۔ میں یہاں صرف اردو متن نقل کر رہا ہوں۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے۔

ہر طرح کی ستائش اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام کائنات خلقت کا پروردگار ہے۔

جو رحمت والا ہے، مہربان ہے، جو اس دن کا مالک ہے جس دن کا موں کا بدلہ لوگوں کے حصے میں آئیگا۔ خدایا ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور صرف تو ہی ہے جس سے مدد مانگتے ہیں۔ خدایا ہم پر سیدھی راہ کھول

دے۔ وہ راہ جوان لوگوں کی راہ ہوئی جن پر تو نے انعام کیا۔ ان کی نہیں جو
پھٹکارے گئے اور نہ ان کی جو راہ سے بھٹک گئے۔" [۲۰]

ہمیں اعتراف کرنا پڑیگا کہ مولانا آزاد کے مذکورہ ترجمے سے قرآن فہمی کی ترسیل بہت آسان ہے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ترجمے میں رحمٰن اور رحیم کے قرآنی الفاظ کو جیوں کا تیوں چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ مذکورہ اسمائے الٰہی کی تفصیلی تفسیر سورہ کی دوسری آیت میں کرنی مقصود تھی۔ 'الحمد' کا ترجمہ ہر طرح کی ستائش کیا ہے۔ حمد سے سورہ کی ابتدا کیوں کی گئی اور اس کا ترجمہ 'ہر طرح کی ستائش کیوں کیا گیا اس پر تفسیر میں اسطرح روشنی ڈالی ہے۔

"اس لئے کہ معرفت الٰہی کی راہ میں انسان کا پہلا تاثر یہی ہے کہ یعنی جب
کبھی ایک صادق انسان اس راہ میں قدم اٹھائے گا تو سب سے پہلی حالت
اس کے فکر وجدان پر طاری ہوگی۔ وہ قدرتی طور پر وہی ہوگی جسے یہاں تحمید
وستائش سے تعبیر کیا گیا ہے۔ [۲۱]

مولانا آزاد کے ترجمے کی جدت اور انفرادیت پورے سورہ میں موجود ہے۔ رب العالمین کا ترجمہ مولانا آزاد نے "تمام کائنات حلقت کا پروردگار ہے" کیا ہے۔ اس سلسلے میں دوسرے مفسرین کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

۱۔ جو صاحب ہے سارے جہاں کا۔ شاہ عبدالقادر
۲۔ جو تمام جہاں کا پروردگار ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد
۳۔ جو تمام مخلوقات کا پروردگار ہے۔ مولانا فتح محمد جالندھری
۴۔ جو پالنے والا سارے جہاں کا۔ شیخ الہند
۵۔ جو مربی ہے ہر ہر عالم کے۔ مولانا اشرف علی تھانوی
۶۔ جو تمام کائنات کا رب ہے۔ مولان سید ابوالاعلیٰ مودودی

مذکورہ بالا تمام ترجموں سے مولانا آزاد کے ترجموں کا موازنہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ جو

اسلوب کی ندرت اور ترجمے کی جدت ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ چونکہ اس لفظ میں خدا کی عالمگیر ربوبیت کا اعتراف ہے۔ لہٰذا اس کی تفسیر بیان کرتے ہوئے مولانا رقم طراز ہیں۔

''رب العالمین'' ہونے کے معنی یہ ہوئے کہ جس طرح اس کی خالقیت نے کائنات ہستی اور اس کی ہر چیز پیدا کی ہے اسی طرح کی ربوبیت نے ہر مخلوق کی پرورش کا سروسامان بھی کر دیا ہے۔ اور یہ پرورش کا سامان ایک ایسے عجیب و غریب نظام کے ساتھ ہے کہ ہر وجود کو زندگی اور بقا کے لئے جو کچھ مطلوب ہے وہ سب کچھ مل رہا ہے اور اس طرح مل رہا ہے کہ ہر حالت کی رعایت ہے اور ہر ضرورت کا لحاظ ہے۔''۲۲

پورے سورہ کے تمام امور پر جتنی شرح وبسط اور تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولانا کے ذہنی وفکری توانائیوں اور فہم وتدبر کا آئینہ دار ہے۔ زور بیان اور تاثیر کلام ہر لفظ سے اجاگر ہے۔ 'رحمٰن' اور رحیم'' میں مماثلث افتراق کے نکتے کو اس طرح نمایاں کرتے ہیں۔

''پس ''الرحمٰن'' کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ذات جس میں رحمت ہے اور ''الرحیم'' کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ذات جس میں نہ صرف رحمت ہے بلکہ جس سے ہمیشہ رحمت کا ظہور ہوتا رہتا ہے اور ہر آن و ہر لمحہ تمام کائنات خلقت اس سے فیضاب ہو رہی ہے۔''۲۳

اگلی آیت کی تفسیر ملاحظہ ہو جس میں قرآن کے طریقہ استدلال کا تجزیہ سائنٹفک انداز میں کیا گیا ہے اور پڑھنے والے کا ذہن اس نکتے کی طرف مبذول کیا گیا ہے کہ قرآن حکیم اپنی ابتدائی سورت میں ہی انسانی ذہن کو تعقل وتفکر کی دعوت دیتا ہے۔

''ربوبیت اور رحمت کے بعد ملک یوم الدین کے وصف نے بھی یہ حقیقت آشکار را کر دی کہ اگر کائنات میں صفات رحمت و جمال کے ساتھ قہر وجلال بھی اپنی نمود رکھتی ہے تو یہ اس لئے نہیں کہ پروردگار عالم میں غضب وانتقام

ہے بلکہ اس لئے کہ وہ عادل ہے اور اس کی حکمت نے ہر چیز کے لئے اس کا
ایک خاصہ اور نتیجہ مقرر کر دیا ہے۔ عدل منافی رحمت نہیں بلکہ عین رحمت
ہے۔''۲۴

غور کیجئے تو مولانا آزاد کی اسلوب نگارش سے نہ صرف قرآن فہمی کے دروازے وا ہوتے ہیں بلکہ ہمیں اس کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے اور ان کے ذہن کی بلوغت کی داد دینی پڑتی ہے کہ معاشرتی نظام کی داشگی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ عدل کو مثبت طور پر دیکھا جائے اور اسے عین رحمت تصور کیا جائے تاکہ معاشرے کی اصلاح ہو سکے۔ اسی طرح 'ایاک نعبد' کی جو دلنشین اور بصیرت افروز تفسیر کی ہے۔ وہ اسلام کے نظام عبادت کو آشکارا کرتی ہے۔ دیکھئے یہ اقتباس:۔

''عبادت کے لئے نہیں کہا کہ 'نعبدک' بلکہ کہا 'ایاک نعبد' یعنی یہ نہیں کہا کہ تیری عبادت کرتے ہیں بلکہ حصر کے ساتھ کہا 'صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور پھر اسکے ساتھ 'ایاک نستعین' کہہ کر 'استعانت' کا بھی اسی حصر کے ساتھ ذکر کر دیا۔ اس اسلوب بیان نے توحید کے تمام مقاصد پورے کر دیئے اور شرک کی ساری راہیں بند ہو گئیں''۲۵

اسی طرح 'اھدنا الصراط المستقیم' کی تفسیر بیان کرتے ہیں اور ذیلی عنوانات کے تحت مختلف نکتے ابھارتے ہیں۔ مثلاً ہدایت تکوین وجود کے مراتب اربعہ، وحدت دین کی اصل عظیم اور قرآن حکیم، دین کی حقیقت اور قرآن کی تصریحات، تفریق بین الرسل وغیرہ کی بحث بہت تفصیلی طور پر چھیڑتے ہیں۔ خلاصۂ بحث کے عنوان کے تحت تفصیلات کا مغز کر دیا گیا ہے۔ پھر آخری آیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اس طرح سورہ فاتحہ کی تفسیر ۴۶۰ صفحات کا احاطہ کرتے ہوئے (ساہتیہ اکاڈمی کی شائع شدہ پہلی جلد) اختتام کو پہنچتی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے سورہ فاتحہ کی تفسیر کی تعریف ان الفاظ میں کیا ہے:

''اس میں سورہ فاتحہ کے ایک ایک لفظ کی ایسی دلنشیں تشریح اور بصیرت افروز

تفسیر ہے کہ اس سے سورہ کے ام الکتاب (اصل قرآن) ہونے کا مسئلہ مشاہدہ معلوم ہونے لگتا ہے اور اسلام کے تمام مہمات مسائل اور اصول دین پر ایک تبصرہ ہو جاتا ہے۔ خصوصاً قرآن پاک کے طرز استدال، خالق کائنات کی ربوبیت ورحمت کے آثار ودلائل اتنی تفصیل سے لکھے ہیں کہ مصنف کی وسعت علم ونظر کی داد بے اختیار دینی پڑتی ہے۔"٢٦

سورہ فاتحہ کی تفسیر سے اس نظریے کی وضاحت ہوتی ہے کہ مولانا آزاد کے نزدیک بندہ اور خالق کا رشتہ ذات الٰہی کی ان تین صفتوں میں مضمر ہے جو ربوبیت، رحم اور عدل کہلاتی ہے۔ ربوبیت خالق کی صفت ہے جس سے تخلیق عمل میں آتی ہے۔ ہر شے نشو ونما پاتی ہے اور قدرت کا منشاء پورا کرتی ہے۔ رحم وہ صفت ہے جو تخلیق کی جڑ ہے، عشق سے کائنات ظہور میں آئی۔ عشق ومحبت، رحم وکرم ہی نمود وزندگی کا سرچشمہ ہے۔ عشق ومحبت نہ ہوتو نہ وجود ہوگا، نہ نمود، نہ پرورش اور نہ نشو ونما۔ رب العالمین کی یاد رحم وکرم کی غرض سے ہی کی جاتی ہے۔ رحم وکرم ہی ہر شے میں ملاپ کا ذریعہ ہے۔ زندگی کا حاصل ہے اور قدرت کا تقاضہ ہے۔ عدل ذاتِ الٰہی کی تیسری صفت ہے جو کائنات میں توازن برقرار رکھتی ہے۔ عدل وانصاف نہ ہوتو سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا۔ سرسید کے نزدیک تخلیق آئین فطرت کے مطابق ہوتی ہے لیکن مولانا آزاد کے نزدیک ربوبیت تخلیق کا اصل سبب ہے

سورہ فاتحہ کی تعلیمی روح:۔ ترجمان القرآن کی پہلی جلد کے خاتمے پر مولانا آزاد نے ایک عنوان" سورہ فاتحہ کی تعلیمی روح" کے تحت مذہب کا صحیح تصور پیش کراتے ہوئے۔ یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ مذہب میں ہی انسانیت کے تمام دکھوں کا مداوا ممکن ہے۔ سائنسی ایجادات اور فروغ اور مادی ترقی انسان کے روحانی سکون کا ضامن نہیں بن سکتے۔ لہٰذا سب سے پہلے مذہب کے صحیح تصور کی تفہیم ضروری ہے۔ سورہ فاتحہ کی تفسیر کے اختتام پر مولانا مذہب کا ایک

آفاقی تصور پیش کرتے ہیں۔ وہ کسی طرح کی قومی، نسلی اور علاقائی حد بندی کی موافقت میں نہیں ۔دیکھیے یہ تحریر:۔

''سورہ فاتحہ کے مطالب پر بحثیت مجموعی نظر ڈالو اور دیکھو اس کی سات آیتوں کے اندر مذہبی عقائد و تصور کی جو روح مضمر ہے وہ کس طرح کی ذہنیت پیدا کرتی ہے۔ سورہ فاتحہ ایک دعا ہے۔ فرض کرو ایک انسان کے دل و زبان سے شب و روز یہی دعا نکلتی رہتی ہے، اس صورت میں اس کے فکر و اعتقاد کا کیا حال ہوگا؟

وہ خدا کی حمد و ثنا میں زمزمہ سنج ہے، لیکن اس خدا کی حمد میں نہیں جو نسلوں، قوموں اور مذہبی گروہ بندیوں کا خدا ہے، بلکہ رب العالمین کی حمد میں، جو تمام کائنات خلقت کا پروردگار ہے اور اس لیے تمام نوع انسانی کے لیے یکساں طور پر پروردگاری و رحمت رکھتا ہے۔ پھر وہ اسے اس کی صفتوں کے ساتھ پکارنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کی تمام صفتوں میں سے صرف رحمت اور عدالت ہی کی صفتیں اسے یاد آتی ہیں۔ گویا خدا کی ہستی کی نمود اس کے لیے سرتا سر رحمت و عدالت کی نمود ہے اور کچھ بھی اس کی نسبت جانتا ہے وہ رحمت و عدالت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ پھر وہ اپنا سر نیاز جھکاتا اور اس کی عبودیت کا اقرار کرتا ہے، وہ کہتا ہے: صرف تیری ہی ایک ذات ہے جس کے آگے بندگی و نیاز کا سر جھک سکتا ہے اور صرف تو ہی ہے جو ہماری ساری درماندگیوں اور احتیاجوں میں مددگاری کا سہارا ہے۔ وہ اپنی عبادت اور استعانت دونوں کو صرف ایک ہی ذات کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے اور اس طرح دنیا کی ساری قوتوں اور ہر طرح کی انسانی فرماں روائیوں سے بے پرواہ ہو جاتا ہے۔ اب کسی چوکھٹ پر اس کا سر جھک نہیں سکتا، اب کسی قوت سے وہ ہراساں نہیں ہو سکتا، اب کسی کے آگے اس کا دستِ طلب دراز نہیں ہو سکتا۔

پھر وہ خدا سے سیدھی راہ چلنے کی توفیق طلب کرتا ہے، یہی ایک دعا ہے جس سے زبان احتیاج آشنا ہوتی ہے، لیکن کون سی سیدھی راہ؟ کسی خاص نسل کی سیدھی راہ؟ کسی خاص قوم کی سیدھی راہ؟ کسی خاص مذہبی حلقے کی سیدھی راہ؟ نہیں، وہ راہ جو دنیا کے تمام مذہبی رہنماؤں اور

تمام راست باز انسانوں کی متفقہ راہ ہے، خواہ کسی عہد اور کسی قوم میں ہوئے ہوں۔ اسی طرح وہ محرومی اور گم راہی کی راہوں سے پناہ مانگتا ہے، لیکن یہاں بھی کسی خاص نسل وقوم یا کسی خاص مذہبی گروہ کا ذکر نہیں کرتا، بلکہ ان راہوں سے بچنا چاہتا ہے، جو دنیا کے تمام محروم اور گم راہ انسانوں کی راہیں رہ چکی ہیں۔ گویا جس بات کا طلب گار ہے وہ بھی نوع انسانی کی عالم گیر اچھائی ہے اور جس بات سے پناہ مانگتا ہے وہ بھی نوع انسانی کی عالم گیر برائی ہے۔ نسل، قوم، ملک یا مذہبی گروہ بندی کے تفرقہ و امتیاز کی کوئی پر چھائیں اس کے دل ودماغ پر نظر نہیں آتی۔

"غور کرو مذہبی تصور کی یہ نوعیت انسان کے ذہن وعواطف کے لیے کس طرح کا سانچا مہیا کرتی ہے؟ جس انسان کا دل دماغ ایسے سانچے میں ڈھل کر نکلے گا وہ کس قسم کا انسان ہوگا؟ کم از کم دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے ایک یہ کہ اس کی خدا پرستی خدا کی عالم گیر رحمت و جمال کے تصور کی خدا پرستی ہوگی، دوسری یہ کہ کسی معنی میں بھی نسل وقوم یا گروہ بندیوں کا انسان نہیں ہوگا، عالم گیر انسانیت کا انسان ہوگا۔ اور دعوت قرآنی کی اصلی روح یہی ہے۔" [۲۷]

مولانا آزاد کی تفسیر سورہ فاتحہ پر اختلافات کا سلسلہ بھی شروع ہوا، جن میں مولانا اسلم جیراجپوری، ان کے شاگرد رشید جناب غلام پرویز اور مولانا یوسف بنوری کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر دونوں کا تعلق اہل قرآن سے ہے۔ انہوں نے یہ سوال اٹھایا کہ مولانا کی تشریحات کے بعد یہ ضروری نہیں کہ ایمان کو کسی خاص شرط کے ساتھ مقید کیا جائے۔ یعنی اللہ تعالی کے ساتھ ملائکہ، کتب الٰہی، انبیاء کرام، آخرت پر اسی شکل میں ایمان لایا جائے، جس شکل میں قرآن نے پیش کیا اور نبی اکرم ﷺ نے کر کے دکھایا۔ یا پھر ان کا یہ اعتراض کہ مولانا آزاد کے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ حرام وحلال کھانے پینے کی پابندیوں میں قرآن کے فیصلوں کو ہی قل فیصلہ مانا جائے۔

ان تمام اعتراضات کے جواب مولانا ریاست علی ندوی نے مارچ ۳۳ء کے
معارف میں بہت تفصیل سے پیش کیا ہے۔ وضاحت کا یہاں موقع نہیں۔
اس کے لئے جن نکات پر اعتراض برائے اعتراض کئے گئے ہیں، ان میں یہ
کہ مولانا کی تفسیر میں اسلام کے نظام وعبادت کو اہمیت نہیں دی گئی۔ ان کے
نزدیک نجات کے لئے ایمان بالرسل ضروری نہیں۔

وہ عقیدۂ توحید کو ہی کافی سمجھتے تھے۔ یہ ایک گمراہ کن پروپگنڈہ تھا۔ سچائی تو یہ ہے کہ
مولانا نے ''ایاک نعبد'' کی تفسیر میں بہت ہی واضح انداز میں لکھا ہے:۔

'' اسلام نے اپنی تعلیم کا بنیادی کلمہ جو قرار دیا ہے وہ سب کو معلوم
ہے۔اشھد ان لاالٰہ الااللہ و اشھد ان محمد عبدہ و
رسولہ ''اس اقرار میں جس طرح خدا کی توحید کا اعتراف کیا گیا ہے، ٹھیک
اسی طرح پیغمبر اسلام کی بندگی اور درجہ رسالت کا بھی اعتراف ہے۔ غور کرنا
چاہیے کہ ایسا کیوں کیا گیا؟ صرف اس لیے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی
بندگی اور درجۂ رسالت کا اعتقاد اسلام کی اصل واساس بن جائے۔۔۔کوئی
شخص دائرہ اسلام میں داخل ہی نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ خدا کی توحید کے
ساتھ پیغمبر اسلام کی بندگی اوراور رسالت کا بھی اقرار نہ کرے۔'' ۲۸۔

اسی طرح '' ایاک نعبد'' کی تفسیر کے سلسلے میں مولانا پر یہ اعتراض علماء کے
ایک طبقے کی طرف سے یہ کیا گیا کہ سورہ فاتحہ کی تفسیر میں ایاک نعبد کی تفسیر سرے سے
غائب ہے۔ اس سلسلے میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے ماہنامہ ترجمان القرآن میں کئی قسطوں
میں اعتراضات کیے گئے اور خوب بڑی دیدہ ودلیری کے ساتھ یہ بات پھیلائی گئی کہ مولانا نے
سورہ فاتحہ کی تفسیر میں ایاک نعبد کو کسی سیاسی مصلحت کی بناء پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ اعتراض بددیانتی پر
مبنی ہے۔ سچائی تو یہ ہے کہ مولانا نے ''توحید فی الصفات'' ذیلی عنوان کے تحت ''ایاک نعبد'' کی

تفسیر بہت ہی مدبرانہ انداز میں بیان کی ہے۔دیکھیے یہ تحریر جس میں ایجاز وبلاغت اور اعجاز فصاحت اپنی معراج پر ہے۔

"...... لیکن قرآن نے توحید فی الفصاحت کا ایسا کامل نقشہ کھینچ دیا کہ اس طرح لغزشوں کے تمام دروازے بند ہوگئے۔اس نے صرف توحید ہی پرزور نہیں دیا بلکہ شرک کی راہیں بھی بند کر دیں اور یہی اس بات میں اس کی خصوصیت ہے۔

وہ کہتا ہے"ہر طرح کی عبادت اور نیاز کی مستحق صرف خدا ہی کی ذات ہے۔پس اگر تم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے سامنے سر جھکایا تو توحید الہٰی کا اعتقاد باقی نہ رہا" وہ کہتا ہے"یہ اسی کی ذات ہے جو انسانوں کی پکار سنتی اور ان کی دعائیں قبول کرتی ہے۔پس اگر تم نے اپنی دعاؤں اور طلب گاریوں میں کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کرلیا تو گویا تم نے اسے خدا کی خدائی میں شریک کرلیا" وہ کہتا ہے،دعا،استعانت،رکوع وسجود، عجز و نیاز،اعتماد وتوکل اور اس طرح کے تمام عبادت گذارانہ اور نیاز مندانہ اعمال،وہ اعمال ہیں جو خدا اور اس کے بندوں کا باہمی رشتہ قائم کرتے ہیں۔ پس اگر ان اعمال میں تم نے کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کرلیا،تو خدا کے رشتہ معبودیت کی یگانگی باقی نہ رہی۔

اسی طرح عظمتوں ، کبریائیوں ، کارسازیوں اور بے نیازیوں کا جو اعتقاد تمہارے اندر خدا کی ہستی کا تصور پیدا کرتا ہے۔وہ صرف خدا ہی کے لئے مخصوص ہونا چاہئے اگر تم نے ویسا ہی اعتقاد کسی دوسری ہستی کے لیے بھی پیدا کرلیا تو تم نے اسے خدا کا ند" یعنی شریک ٹھہرالیا اور توحید کا اعتقاد درہم برہم ہوگیا۔

یہی وجہ ہے کہ سورۂ فاتحہ میں ۔۔ایاک نعبد وایاک نستعین ۔۔کی تلقین کی گئی ۔اس میں اول تو عبادت کے ساتھ استعانت کا بھی ذکر کیا گیا، پھر دونوں جگہ مفعول کو مقدم کیا جو مفید اختصاص ہے۔یعنی ''صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں ۔'' اس کے علاوہ تمام قرآن میں اس کثرت کے ساتھ توحید فی الصفات اور رد اشتراک پر زور دیا گیا ہے کہ شاید ہی کوئی سورت بلکہ کوئی صفحہ اس سے خالی ہو۔''۲۹

اسی طرح مولانا ابراہیم سیالکوٹی نے اپنے رسالہ'' واضح البیان'' میں تفسیر سورہ فاتحہ سے اختلاف کا اظہار کیا جس کا جواب بہت وضاحت کے ساتھ مولانا نے اپنے خطوط اور بیانات میں دیئے:

''ایمان سے میرا مقصود یہ ہے کہ اللہ پر، اللہ کے رسول پر، یوم آخرت پر اور قرآن پر اور قرآن اور صاحب قرآن پر ایمان لانا اور عمل سے مقصود وہ اعمال ہیں جنہیں قرآن نے اعمال صالح قرار دیا ہے۔،،۳۰

ان کے کچھ سیاسی رقیبوں نے یہ پروپگنڈہ کیا کہ مولانا میں شریعت مطہرہ کی پابندی ویسی نہیں تھی جیسی مولانا کے لفظ سے ظاہر ہوتی ہے۔حالانکہ مولانا پر دین کا گہرا اثر تھا۔اس سلسلہ میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ناظم جمعیۃ علماء ہند کا بیان ہے:۔

''حضرت مرحوم کی زندگی میں ایک دن بھی ایسا نہیں گذرا کہ سکون شب و سعادت اولین کی وہ گھڑیاں جبکہ دنیا بستر راحت پر خواب نوشیں کرتے مزے لوٹتی ہے، رجوع وانابت الی اللہ، مراقبہ وعبادت میں نہ گذری ہوں۔ ان کا معمول تھا کہ رات کو بہت جلد (عموماً 9 بجے) سو جاتے تھے اور صبح گا ہی تین ساڑھے تین بجے روزانہ ہی بیدار ہوتے اور اول چار رکعت سے آٹھ رکعت خدا کے حضور میں سر بسجود جبین بہ نیاز رہنے کے بعد خود اپنے شوق چاء

سے فارغ ہوتے۔ پھر تفسیر قرآن حکیم یا آیات الٰہی کے کسی عنوان پر غور وفکر میں صبح کی نماز تک مشغول رہتے اور نماز فجر پڑھ کر اپنے دینوی مشاغل میں مصروف ہوجاتے۔" ۱۳۱

لوگوں کو مولانا کے "وحدتِ دین" کے نظریے کے معاملے میں بھی غلط فہمی ہوئی اور انہوں نے وحدتِ دین کو وحدتِ ادیان سے خلط ملط کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ مولانا نے اپنی تفسیر میں وحدتِ ادیان کے تصور کی ایک طرح سے نفی کی ہے۔ وحدتِ ادیان کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم پہلے یہ تسلیم کر لیں کہ دین بہت سارے ہیں اور اس کے بعد اس میں ایک نقطۂ اشتراک تلاش کریں، مولانا اس کے قائل نہیں ہیں۔ مولانا کے نزدیک وحدتِ دین کا مطلب اور موقف یہ ہیں:

۱۔ "وحی الٰہی کی وہ عالمگیر ہدایت جو اول دن سے دنیا میں موجود ہے اور بلاتفریق و امتیاز تمام نوع انسانی کے لئے ہے۔۔۔۔۔۔ وہ سب کے لئے ہے اور سب کو دی گئی ہے اور اس ایک ہدایت کے سوا اور جتنی ہدایتیں بھی انسانوں نے سمجھ رکھی ہے سب انسان بناوٹ کی راہیں ہیں۔ خدا کی ٹھہرائی ہوئی راہ صرف یہی ایک راہ ہے۔" ۱۳۲

۲۔ "فطرت الٰہی کی راہ کائنات ہستی کے ہر گوشے میں ایک ہی ہے۔ وہ نہ تو ایک سے زیادہ ہوتی ہے نہ باہم دگر مختلف۔ پس ضروری تھا کہ یہ ہدایت بھی اول دن سے ایک ہی ہوتی اور ایک ہی طرح پر تمام انسانوں کو مخاطب کرتی۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے: خدا کے جتنے پیغمبر پیدا ہوئے خواہ وہ کسی زمانے اور کسی گوشے میں ہوئے ہوں۔ سب کی راہ ایک ہی تھی اور سب خدا کے ایک ہی عالمگیر قانون سعادت کی تعلیم دینے والے تھے۔ یہ عالمگیر قانون سعادت کیا ہے؟ ایمان اور عمل صالح کا قانون ہے۔ یعنی ایک پروردگار عالم

کی پرستش کرنی اور نیک عملی کی زندگی بسر کرنی۔ اس کے علاوہ اور اس کے خلاف جو کچھ بھی دین کے نام سے کہا جاتا ہے۔ دین کی حقیقی تعلیم نہیں ہے۔ ''۴۲

۳۔ ''دنیا میں کوئی بانی مذہب ایسا نہیں ہوا ہے جس نے ایک ہی دین پر اکٹھے رہنے اور تفرقہ و اختلاف سے بچنے کی تعلیم نہ دی ہو۔ سب کی تعلیم یہی تھی کہ خدا کا دین بچھڑے ہوئے انسانوں کو جمع کر دینے کے لئے ہے۔ الگ الگ کر دینے کے لئے نہیں ہے۔ پس ایک پروردگار عالم کی بندگی و نیاز میں سب متحد ہو جاؤ۔''۴۳

۴۔ ''وہ (قرآن) کہتا ہے: مذاہب کی تعلیم دو قسم کی باتوں سے مرکب ہے۔ ایک قسم تو وہ ہے جو ان کی روح و حقیقت ہے۔ دوسری وہ ہے جن سے ان کی ظاہری شکل و صورت آراستہ کی گئی ہے۔ پہلی چیز اصل ہے۔ دوسری فرع ہے۔ پہلی چیز کو وہ ''دین'' سے تعبیر کرتا ہے۔ دسری کو ''شرع'' اور ''نسک'' سے اور اس کے لئے منہاج کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ''شرع'' اور ''منہاج'' کے معنی راہ کے ہیں اور نسک سے مقصود عبادت کا طور طریقہ ہے۔ پھر اصطلاح میں ''شرع'' قانون مذہب کو کہنے لگے اور نسک عبادت کو۔ وہ (قرآن) کہتا ہے، مذہب میں جس قدر بھی اختلاف ہے۔ ان کا اصلی اختلاف وہ دین کا اختلاف نہیں۔ محض 'شرع' 'منہاج' کا اختلاف ہے۔ یعنی اصل کا نہیں فرع کا ہے۔ حقیقت کا نہیں ہے۔ ظواہر کا ہے ۔ روح کا نہیں ہے۔ صورت کا ہے اور ضروری تھا کہ یہ اختلاف ظہور میں آتا۔''۴۴

مذکورہ بالا تحریروں سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ دین ہمیشہ سے ایک ہے اور

ایک رہے گا۔ اختلافات جونظر آتے ہیں، وہ دین کے نہیں بلکہ شریعتوں اور طریقوں کے ہیں۔ وحدت ادیان کی اصطلاح اگر کہیں انہوں نے استعمال کی ہے تو اسے مراد وحدت دین ہے نہ کہ تمام موحدانہ اور مشرکانہ مذاہب کی وحدت اس سلسلے میں ایک آیت قرآنی ''وما ارسلنا من قبلك من رسول الا نوحي اليه انه لا اله الا انا فاعبدون '' کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا آزاد یوں رقمطراز ہیں:۔

''یہ استدلال وحدت ادیان کی اصل عظیم کا استدلال ہے جس پر قرآن نے اپنی دعوت کی تمام بنیادیں استوار کی ہیں۔ وہ کہتا ہے یہ تعلیم حق ہے جو میرے ساتھیوں کے پاس ہے اور اسی طرح وہ تمام تعلیمیں بھی موجود ہیں جو مجھ سے پہلے دی جا چکی ہیں۔ تم کسی تعلیم سے بھی یہ بات ثابت کر دکھاؤ کہ سچائی کی بات وہ نہیں ہے۔ جو میں پیش کر رہا ہوں۔ پھر اگر بغیر کسی اختلاف کے دنیا کے ہر عہد اور ہر گوشے کی دینی تعلیم ایک ہی رہی ہے اور سب نے توحید وخدا پرستی ہی کی طرف بلایا ہے تو کیا یہ عالمگیر وحدت تعلیم اور باہم دگر تصدیق وتوثیق کی موجودگی کا ایک قطعی ثبوت نہیں ہے۔ چنانچہ ایت ۲۵ میں وضاحت کر دی کہ دعوت قرآن سے پہلے جتنی دعوتیں بھی دنیا میں آ چکی ہیں۔ ان سب کی پکار اس کے سوا کچھ نہیں رہی ہے کہ۔ لا الہ الا انا فاعبدون۔''[۳۵]

مذکورہ بالا تمام تراشے ہمارے اس خیال کو تقویت بخشتے ہیں کہ مولانا نے وحدت دین کی وکالت کی ہے نہ کہ وحدت ادیان کی۔ افسوس کہ بہت سارے لوگوں نے اس بحث کو متنازعہ بنا دیا اور یہ پروپیگنڈہ کر دیا کہ مولانا آزاد وحدت ادیان کے حامی بھی ہے اور مبلغ بھی۔

سورہ فاتحہ کے علاوہ 'ترجمان القران' کے دوسرے حصوں کے مطالعے سے جہاں قرآن کے معنی ومفاہیم کے سرچشموں تک رسائی حاصل ہوتی ہے، تو دوسری طرف مولانا کے تعمق فکر، طریقۂ استدلال، اسلوب کی حقیقت بھی اجاگر ہوتی ہے۔ 'ترجمان القرآن' کے مقدمے میں یہ

لحاظ نزول سورہ الحمد، کی اولیت کے ثبوت میں جو آزاد نے دلیلیں پیش کی ہیں وہ ان کے تدبر اور فہم قرآنی پر دال ہیں۔قرآن مجید کی تفسیر میں جمال فطرت کی عکاسی، موسیقی کے رموز کا بیان ان کی تحریروں کی جان اور ان کی تخیل کی معراج ہے۔ساتھ ہی جمالیاتی احساس کا پرتو بھی۔سورہ توبہ کی تفسیر میں اسلام کے اقتصادی نظام پر گفتگو، سورہ کہف میں ذوالقرنین کی شخصیت سے بحث ،سورہ یوسف میں انسانی سیرت و کردار کے مثبت و منفی کے پہلوؤں کو جس عالمانہ انداز میں بیان کیا ہے، اسے مولانا آزاد کے قلم کا اعجاز ہی کہنا چاہئے۔ایک چھوٹے سے مضمون میں پوری تفصیل کی گنجائش نہیں۔

تفسیر بالرائے:۔مولانا پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ تفسیر بالرائے اور قرآن کی ترجمانی میں وقت کے لحاظ سے اپنے سیاسی مقصد کو پیش نظر رکھا ہے۔اس طرح کا الزام این۔ہنڈرسن ڈگلس(IAN HENDERSON DOUGLAS) نے اپنی تصنیف Abul Kalam Azad An Inlellectual and Religious کے صفحہ 203 تا 222 میں ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے جو بغیر کسی دلیل کے ہے۔وہ لکھتا ہے کہ مولانا آزاد رازی کی تفسیر بالرائے کو پسند نہیں کرتے اور بوعلی سینا و فارابی کے فلسفیانہ طریق فکر سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔لہٰذا انہوں نے کوئی واضح بحث نہیں کی ہے۔سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ مولانا جیسے عالم دین سے فلسفہ طرازی کا توقع بالکل بے جا ہے مولانا نے اس سلسلے میں مسلمانوں کے اسلامی عقیدے کو بیان کیا ہے۔لہٰذا ڈگلس کا خرافاتی ذہن کہاں سے مطمئن ہوسکتا تھا۔مسلمانوں کے بھی ایک طبقہ نے یہ اعتراض کیا کہ مولانا نے تفسیر بالرائے کی جو ترجمانی کی ہے حدیث میں اس کی مذمت آئی ہے۔اس ضمن میں اتنی بات ضرور کہوں گا کہ مولانا نے قرآنی مطالب کو سمجھنے کے لیے جدید ہیئت اور جدید فلسفہ کا سہارا کبھی نہیں ڈھونڈا۔وہ قرآن کو قرآن سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔تفسیر بالرائے سے مولانا کی کیا مراد ہے خود انہیں کی زبانی سنیے تا کہ ان کے نقطۂ نظر کی تفہیم میں مدد مل سکے۔مولانا فرماتے ہیں:۔

''تفسیر بالرائے کا مطلب سمجھنے میں لوگوں کی لغزشیں ہوئی ہیں۔ تفسیر بالرائے کی ممانعت سے مقصود یہ نہ تھا کہ قرآن کے مطالب میں عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے، کیونکہ اگر یہ مطلب ہو تو پھر قرآن کا درس و مطالعہ ہی بے سود ہو جائے۔ حالانکہ خود قرآن کا حال یہ ہے کہ اول سے آخر تک تعقل و تفکر کی دعوت ہے اور ہر جگہ مطالبہ کرتا ہے کہ:۔

افلا یتدبرون القرآن ام علیٰ قلوب اقفالھا(۴۷:۲۴)

دراصل تفسیر بالرائے میں رائے لغوی معنی میں نہیں ہے بلکہ رائے مصطلحہ شارع ہے اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اس لیے نہ کی جائے کہ خود قرآن کیا کہتا ہے بلکہ اس لیے کی جائے کہ ہماری کوئی ٹھہرائی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے اور کس طرح قرآن کو کھینچ تان کر اس کے مطابق کر دیا جا سکتا ہے۔''

مولانا تفسیر میں قرآن کو قرآن سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن کو ہدایتوں کا سرچشمہ گردانتے ہیں اور اس کے معنی و مطالب کی تفہیم کے لیے اس کی گہرائی و گیرائی میں ڈوب کر گہر ہائے بیش بہا نکالتے ہیں۔ مولانا نے سلف کے عقائد و خیالات کو بھی ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ اور انہیں کی روشنی میں تفکر و تعقل کا راستہ اختیار کیا ہے۔ کود مولانا کا رشاد ے:۔

''پہلے اس کی تفسیر صحابہ و تابعین کی روایات مین دھونڈو۔ پھر بعد کے مفسرین کی طرف رخ کرو دونوں کا مقابلہ کرو۔ صاف نظر آ جائے گا کہ صحابہ و سلف کی تفسیر میں معاملہ بالکل واضح نہ تھا۔ بعد کی دقیقہ سنجیوں نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا اور الجھاؤ پیدا ہو گئے۔

چند آیات کا تقابلی مطالعہ:۔ آیئے مشت نمونہ از خروارے کے طور پر چند آیتوں کا تقابلی موازنہ ترجمہ و تفسیر کی شکل میں پیش کرتا چلوں جس سے مولانا ابوالکلام آزاد کے تفسیری

ترجمہ کو سمجھنے میں سہولت ہوگی اور ہم اندازہ کر سکیں گے کہ مولانا موصوف کا ترجمہ یقیناً اردو ادب میں قابل قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کتاب کو لٹریچر کی نگاہ سے پرکھیں یا مذہبی نقطہ نظر سے ایک کامیاب تصنیف کا درجہ اسے حاصل ہے۔ سورہ بقر کی یہ آیتیں ملاحظہ فرمائیں:

یا ایُھا النّاسُ اعبد و ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم لعلکم تتقون Oالذی جعل لکم الارض فراشاً و السمآء بنآءً و انزل من السّماء مآءً فاخرج به من الثمرات زر قا لکم ۔فلا تجعلو الله انداذ و انتم تعلمونO (سورہ البقر، آیت 21,22)۔

مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ یہ ہے:

''اے لوگو عبادت اختیار کرو اپنے پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی کہ تم سے پہلے گزر چکے ہیں، عجب نہیں کہ تم دوزخ سے بچ جاؤ۔ وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت اور برسایا آسمان سے پانی پھر پردۂ عدم، سے نکالا بذریعہ اس پانی سے پھلوں کی غذا کو تم لوگوں کے واسطے تو اب مت ٹھہراؤ اللہ پاک کے مقابل اور تم جانتے بوجھتے ہو (تشریحی کلمہ۔ یعنی اس بات کو جانتے ہو کہ ان تصرفات کا بجز خدا تعالیٰ کے کوئی کرنے والا نہیں۔ تو اس صورت میں کب زیبا ہے کہ خدا کے مقابلہ میں دوسروں کو معبود بناؤ)

ان آیات کا ترجمہ مولانا مودودی نے جو کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

''لوگو! بندگی کرو اپنے اس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں ان سب کا خالق ہے، تمہارے بچنے کی توقع (یعنی دنیا میں غلط بینی و غلط کاری سے اور آخرت کے عذاب سے) اسی صورت سے ہوں گی۔ وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کا فرش بچھایا، آسمان کی چھت بنائی اور پر سے

پانی برسایا اور اس کے ذریعہ سے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لیے رزق بہم پہنچایا۔ پس جب تم یہ جانتے ہو تو دوسروں کو اللہ کا مدمقابل نہ ٹھہراؤ (تشریحی جملہ یعنی جب تم خود بھی اس بات کے قائل ہو اور تمہیں معلوم ہے کہ یہ سارے کام اللہ کے ہیں) تو پھر تمہاری بندگی اسی کے لیے خاص ہونی چاہیے۔ دوسرا کون اس کا حق دار ہو سکتا ہے کہ تم اس کی بندگی بجالاؤ: دوسروں کو اللہ کا مدمقابل ٹھہرانے سے مراد یہ ہے کہ بندگی وعبادت کی مختلف اقسام میں سے کسی قسم کا رویہ خدا کے سوا دوسروں کے ساتھ برتا جائے''

اب مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی کا ترجمہ دیکھیں:

''اے لوگو اپنے رب کو پوجو جس نے تمہیں اور تم سے اگلوں کو پیدا کیا۔ یہ امید کرتے ہوئے کہ تمہیں پرہیزگاری ملے۔ (یہاں تفسیر یہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ عبادت کا فائدہ عابد کو ہی ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ اس کو عبادت یا اور کسی چیز سے نفع حاصل ہو۔) اور جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا (تشریحی جملہ۔ یہاں آیت میں نعمت ایجاد کا بیان فرمایا کہ تمہیں اور تمہارے آبا کو معدوم سے موجود کیا اور دوسری آیت میں اسباب معیشت وآسائش وآب وغذا کا بیان فرما کر ظاہر کر دیا کہ وہی ولی نعمت ہے تو غیر کی پرستش محض باطل ہے)۔ تو اس سے کچھ پھل نکالے تمہارے کھانے کو تو اللہ کے لیے جان بوجھ کر برابر والے نہ ٹھہراؤ۔

اور اب ملاحظہ فرمائیں مولانا آزاد کے ذریعہ کیا گیا ترجمہ:۔

''اے افراد نسل انسانی! اپنے پروردگار کی عبادت کرو (اس پروردگار کی) جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان سب کو بھی پیدا کیا جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں (اور

اس لئے پیدا کیا) تا کہ اس کی نافرمانی سے بچو۔ وہ پروردگار عالم جس نے
تمہارے لیے زمین فرش کی طرح بچھا دی اور آسمان کو چھت کی طرح بلند
کردیا۔ اور (پھر تم دیکھ رہے ہو کہ وہی ہے) جو آسمان سے پانی برساتا ہے
جس سے زمین شاداب ہو جاتی ہے اور طرح طرح پھل تمہاری غذا کے
لئے پیدا ہو جاتے ہیں۔ پس (جب خالقیت اسی کی خالقیت ہے اور ربوبیت
اسی کی ربوبیت ہے تو) ایسا نہ کرو کہ اس کے ساتھ کسی دوسری ہستی کو شریک اور
ہم پایہ بناؤ۔ اور تم جانتے ہو کہ اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔!''۳۵

اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا کے یہاں سہل ممتنع کا جو طرز ہے اس کی مدد سے تحریر کافی دلنشین ہو جاتی ہے۔ اور انہوں نے اپنی توضیحات کو اس قدر دلکش بنادیا ہے کہ پڑھنے والا لطف انداز بھی ہوتا ہے اور دعوت فکر سے متعارف بھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مولانا کا اسلوب بیان حکیمانہ ہونے کے ساتھ ساتھ خطیبانہ بھی ہے۔

فقہی آیات کی تفسیر میں مولانا کی انفرادیت:۔ فقہی موضوعات پر مولانا کی بصیرت اور ان کی ژرف نگاہی کی آئینہ داران کی تصنیف ''جامع الشواہد'' ہے جس پر تفصیلی تجزیہ میں نے'' جامع الشواہد'' کے باب میں کیا ہے۔ مولانا نے مختصر طور پر فقہی بحث ''تذکرہ'' میں چھیڑی ہے جس کے مطالعے سے مولانا کے وسعت مطالعہ اور فقہی بصیرت کا انکشاف ہوتا ہے اور اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عہد وسطی کے فقہاء کے طریق استدلال سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ یہاں یہ بات بھی کہنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ مولانا مسلک اور فقہی گروہ بندی کے سخت مخالف تھے۔ جزوی فقہی اختلافات سے وہ کلی طور پر احتراز کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں اجتہادی بصیرت کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ قرآن پاک کے ساتھ جیسی وابستگی مولانا رکھتے تھے اور ان کے یہاں جو فکری اور علمی پختگی، بالیدگی واقدار کا جو شعور پایا جاتا ہے وہ سب مولانا کی گہری قرآن فہمی کی مرہون منت ہے۔ انہوں نے اپنی قرآنی بصیرت کو فقہی جزئیات اور قانون کی باریکیوں

تک مقید نہیں کیا۔ اور نہ ہی کسی مخصوص فقہی مسلک کو اپنی شناخت بنائی بلکہ مجموعی اسلامی فقہ کی روشنی میں اپنی کوئی رائے قائم کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں فقہی ذخائر کو بھی ملحوظ خاطر رکھتے ہیں لیکن اپنی رائے کی بنیاد کو قرآن کی منشاء اور ملت کے حقیقی مسائل سے ہم آہنگ کرنے کے متمنی نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ 18 پاروں پر مختص ترجمان القرآن میں مولان نے فقہی بحث میں ائمۂ اربعہ کا ذکر نہیں کے برابر کیا ہے۔ صرف ایک جگہ امام شافعی کی منفرد راہ کا ذکر ہے اور ایک جگہ امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کی رائے کو اپنی تفسیر میں جگہ دی ہے۔ مولانا نے فقہی مباحث کے سلسلے میں مختلف موضوعات مثلاً طہارت، تیمم، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، عمرہ، تمتع، نکاح وطلاق، خلع، وراثت، شہادت، جانوروں کی حلت وحرمت، عدت مقطلقہ، جزیہ وغیرہ پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے لیکن ان کا موقف یہ رہا ہے کہ وہ ذخیرۂ فقہ سے اپنی رائے لیتے ہیں لیکن اپنی رائے میں منشائے قرآن اور ملت کے حقیقی مسائل کو زیادہ فوقیت دیتے ہیں۔ مثلاً ترجمان القرآن میں زکوٰۃ کی جہاں بحث آتی ہے اس میں آپ نے امارت کے مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

> ''تاتاریوں کے غلبہ کے بعد مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ زکوٰۃ کی رقم بطور خود خرچ کر لی جائے۔ مگر ساتھ ہی فقہا نے اس پر بھی زور دیا کہ جن ملکوں میں اسلامی حکوت قائم نہیں رہی ہے اور اعادۂ حالت فوراً ممکن نہیں، وہاں مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ کسی اہل مسلمان کو اپنا امیر مقرر کر لیں، تا کہ اسلامی زندگی کا نظام قائم رہے، معدوم نہ ہو جائے..... اگر اسلامی حکومت کے فقدان سے جمعہ ترک نہیں کر دیا گیا، جس کا قیام امام وسلطان کی موجودگی پر موقوف تھا تو زکوٰۃ کا نظام کیوں ترک کر دیا جائے؟ کس نے مسلمانوں کے ہاتھ اس بات سے باندھ دیے تھے کہ اپنے اسلامی معاملات کے لیے ایک امیر منتخب کر لیں یا ایک مرکزی بیت المال پر متفق ہو جائیں..... اسلام نے

اجتماعی زندگی کا ایک پورا نقشہ بنایا تھا جہاں اس کے چند خانے بگڑے سمجھ لو پورا نقشہ بگڑ گیا۔"۳۶

زکوٰۃ کے مصارف کے سلسلے میں قرآن کریم سورہ توبہ میں آٹھ مصارف کا ذکر کیا گیا ہے ان مصارف کو ایک ساتھ تقسیم کرنی ضروری ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں :۔

"ان مصارف کے بیان سے مقصود یہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقم ان سب میں وجوباً تقسیم کی جائے یا یہ کہ خرچ انہیں میں کہ جاسکتی ہے جس مصرف میں خرچ کرنا ضروری ہو۔ اسی کے بارے میں فقہاء نے اختلاف کیا ہے لیکن جمہور کا مذہب یہی ہے کہ تمام مصارف میں بہ یک وقت تقسیم کرنا ضروری نہیں ہے۔ جس وقت جیسی حالت اور ضروریات ہو اس کے مطابق خرچ کرنا چاہیے اور یہی مذہب قرآن وسنت کی تصریحات اور روح کے مطابق ہے۔ ائمۂ اربعہ میں صرف امام شافعی اس کے خلاف گئے ہیں۔"۳۷

قرآن کریم میں جن آٹھ لوگوں کو زکوٰۃ کے مصارف تقسیم کے لیے کہا گیا ہے اس فہرست میں مسکین اور فی سبیل اللہ بھی شامل ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا کا موقف دوسرے فقہا سے مختلف دکھائی دیتا ہے۔ عام طور پر لوگ مسکین کی صف میں ان لوگوں کو رکھتے ہیں جن کے پاس کچھ نہیں ہو لیکن مولانا نے سورہ کہف میں موسیٰ اور خضرؑ کے قصے میں مسکین کی کشتی کے ذکر سے یہ جواز پیدا کیا ہے کہ مسکین بالکل نادار نہیں ہوتا بلکہ تنگ دست ہوتا ہے اور عزلت میں زندگی گذارتا ہے۔ اسی طرح فی سبیل اللہ کے زمرے میں مولانا نے علم حاصل کرنے والے طلباء وطالبات اور ان کے مسائل کو بھی شامل کیا ہے کہ یہ فی سبیل اللہ کے دائرے میں دینی ادارے اور اس میں تعلیم حاصل کرنے والے لوگ بھی آجاتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مولانا آزاد ایک روشن خیال عالم اور ہندوستان میں کم وبیش مجتہدانہ حیثیت کے حامل اہل تھے۔ فی سبیل اللہ کی وضاحت کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:۔

''قرآن کی اصطلاح میں وہ تمام کام جو براہِ راست دین وملت کی حفاظت و تقویت کے لیے ہوں فی سبیل اللہ کے کام ہیں اور چونکہ حفظ وصیانت امت کا سب سے ضروری کام دفاع ہے اس لیے زیادہ اطلاق اس (دفاع) پر ہوا۔ پس اگر دفاع درپیش ہو تو اس میں خرچ کیا جائے گا۔ ورنہ دین وامت کے عام مصالح میں قرآن اور علوم دینیہ کی ترویج واشاعت میں، مدارس کے قیام اور اجراء میں دعاۃ ومبلغین کے قیام وترسیل میں اور ہدایت وارشاد کے تمام کاموں میں۔ ۳۸

فقہی مسئلے میں مولانا نہ تو کسی خاص مسلک کے پیرو تھے اور نہ ہی فقہی گروہ بندی کے علمبردار۔ وہ تمام ائمہ اسلام کے متعلق حسن ظن رکھتے ہیں۔ لیکن قرآن وسنت کو اپنا رہنما تسلیم کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا رویہ یہ تھا کہ قرآن وسنت کو اپنا رہنماء بنایا جائے فقہی اختلافات سے کلی طور پر اغماز اور پہلوتہی کی جائے۔ تمام ائمہ اسلام کے متعلق حسن ظن رکھا جائے دیکھئے ان کی تحریر:۔

''صحیح راہ، حق اور اعتدال کی یہ ہے کہ دو اصل ہیں اور دنوں کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ ہر حال میں کتاب وسنت ونصوص شرعیہ کو مقدم رکھنا چاہیے اور اسی پر حکم وعمل کرنا چاہئے۔ دوسری یہ کہ تمام ائمہ اسلام اور علماء حق سے حسن ظن اور محبت وارادت رکھنی چاہئے۔ اور ان کے مراتب وحقوق کی رعایت سے کبھی غافل نہ ہونا چاہئے۔ یہی دو اصل ہیں جن کے توازن اور تناسب کو باعتدال ملحوظ نہ رکھنے سے ساری مصیبتیں پیش آتی ہیں اور بدبختانہ لوگوں نے ہمیشہ انہی میں افراط وتفریط کی ہے۔ یا دونوں میں سے صرف کسی ایک ہی کے ہو رہے ہیں۔ ایک جماعت احکام ونصوص شرعیہ کے اتباع وتقدیم کا مطلب یہ سمجھتی ہے کہ جہاں کسی اہل علم وحال کا کوئی قول بظاہر

کسی حکم ونص کے خلاف نظریا بلا تامل تضلیل وتکفیر پر آمادہ ہو گئے اور جھٹ حکم لگا دیا کہ وہ منکر شریعت ہے۔ اگرچہ اس نے اپنی ساری زندگی شریعت کے علم وعمل میں بسر کر دی ہو۔ دوسری جماعت نے ائمہ واکابر دین کی پیروی اور محبت واعتقاد کے یہ معنی سمجھے کہ احکام ونصوص کو ان کا تابع ومحکوم بنا دیا اور چند غیر معصوم انسانوں کی خاطر کتاب وسنت کو ترک کر کے اتـــخـــذوا احبـارهـم و رهبانهم اربابامن دون الله کی سرحد کے قریب ہو گئے۔ ۳۹؎

مال ودولت کی تقسیم کا مسئلہ ہو یا عورتوں کے حقوق کا۔ نسخ بحث کا مسئلہ ہو یا ازدواجی تعلقات کا، مولانا اس طرح کے موضوع پر جب اٹھاتے ہیں تو اس کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑتے بلکہ ہر مسئلے پر تفصیلی طور پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ مثلاً عورتوں کے حقوق جیسے اہم مسئلے پر انہوں نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''ساتویں صدی مسیحی میں جب اسلام کا ظہور ہوا تو دنیا اس حقیقت سے یک قلم نا آشنا تھی کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے بھی کچھ حقوق ہو سکتے ہیں۔ منو کے قانون نے عورت کی ہستی صرف اس شکل میں رکھی تھی کہ وہ مرد کے لیے پیدائش اولاد کا ذریعہ ہے اور اس کی نجات اس پر موقوف ہوگی کہ مرد کی خدمت گذاری میں اپنی زندگی فنا کر دے۔ یہودی قانون عورت کو مرد کی جائداد تصور کرتا تھا اور خاندانی زندگی میں اس کی کوئی مستقل حیثیت نہ تھی۔ مسیحی کلیسا کا فیصلہ تھا کہ انسان ہونے کے لحاظ سے مرد اور عورت یکساں نہیں ہیں۔ انسان صرف مرد ہے اور عورت میں انسانی روح کی جگہ ایک دوسری روح بولتی ہے۔ رومی قانون نے بھی جو یورپ کے تمام قوانین عامہ کا ابتدائی سر چشمہ ہے عورت کی جگہ مرد سے بدرجہا نیچے دیکھی تھی۔ خاندانی زندگی میں

صرف باپ بھائی شوہر اور بیٹے کی حیثیتیں نمایاں ہوتی تھیں۔ ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے لیے کوئی جگہ نہ تھی جب کبھی انسان کا لفظ بولا جاتا تھا تو مخاطب مرد ہی کو سمجھا جاتا تھا عورت مرد کے سائے میں جگہ پا سکتی تھی مگر اس کے ساتھ کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔

یہودی اور مسیحی تصور نے ''پیدائشی گناہ'' کے عقیدے کا سارا بوجھ عورت کے سر ڈال دیا تھا۔ آدم کی لغزش کا باعث حوا ہوئی، اس لیے گناہ کا پہلا بیج عورت کے ہاتھوں پڑا اور وہی مرد کی گم راہی کے لیے شیطان کا آلہ کار بنی تھی۔ اب ہمیشہ عورت کی ہستی میں گناہ کی دعوت ابھرتی رہے گی۔

دماغی اور معاشرتی زندگی کے دائروں کی طرح مذہبی زندگی کے دائرے میں بھی عورت مرد کی ہم نہ ہو سکی، گویا انسانوں کی طرح خدا کا فیصلہ بھی اس کے خلاف گیا تھا۔

لیکن قرآن نے صرف عورتوں کے حقوق کا اعتقاد ہی پیدا نہیں کیا، بلکہ صاف صاف اعلان کر دیا کہ حقوق کے اعتبار سے دونوں کا درجہ ایک ہے۔ جس طرح مرد کے حقوق عورت پر ہوئے ٹھیک اسی طرح عورت کے حقوق بھی مرد پر ہوئے۔

ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف (البقرہ:228)

(اور حسن سلوک میں بیوی کے حقو بھی اسی طرح شوہروں پر ہوئے جس طرح شوہروں کے بیویوں پر ہوئے)۔ یعنی جس طرح عورتوں کو دینا ہے اسی طرح لینا بھی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مرد اپنے حق کا تو عورت سے مطالبہ کرے لیکن عورت کا حق بھلا دے۔ اگر عورت مرد کے حقوق کی مقروض ہے تو اسی طرح مرد بھی عورت کے حقوق کا معرض ہے۔

قرآن نے چار لفظ لھن مثل الذین علیھن کہہ کر انسان کی معاشرتی زندگی کے سب سے بڑے انقلاب کا اعلان کر دیا تھا۔ ان چار لفظوں نے عورت کو وہ سب کچھ دے دیا جو اس حق تھا مگر جو اسے کبھی نہیں ملا تھا۔ ان لفظوں نے اسے محرومی و شقاوت کی خاک سے اٹھایا اور عزت و مساوات کے تخت پر بٹھایا۔ پھر اس اسلوب بیان کی جامعیت اور مانعیت پر غور کرو زندگی کی و معاشرت کی وہ کون سی بات ہے جو ان چار لفظون میں نہیں آ گئی اور کون سا رخنہ ہے جو بند نہیں کر دیا گیا؟ البتہ آگے چل کر یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ باوجود حقوق کی برابری کے ایک خاص درجہ مرد کے لیے ماننا پڑتا ہے:

وللرجال علیھن درجہ (البقرہ: 228) البتہ عورتوں کے مقابلے میں مردوں کی ایک خاص درجہ ضرور حاصل ہوا ہے) اس خاص درجے سے مقصود کون سا درجہ ہے؟ اس کا جواب سورہ النساء (آیت: 34) میں ہمیں مل جاتا ہے:

الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علی بعض و بما انفقوا من اموالھم (مرد عورتوں کے لیے کارفرما ہوئے، اس لیے کہ اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی اور اس لیے کہ مرد اپنا مال جو ان کی محنت سے جمع ہوتا ہے، عورتوں پر خرچ کرتے ہیں) یعنی خاندانی زندگی کا نظام قائم نہیں رہ سکتا اگر کوئی اس کا ''قوام'' یعنی بندوبست کرنے والا نہ ہو۔ یہ ''قوام'' ہستی کس کی ہوئی؟ شوہر کی یا بیوی کی؟ قرآن کہتا ہے: خاندانی زندگی کا نظام اس طرح چل رہا ہے کہ ''قوام'' ہستی کی جگہ شوہر کی ہوئی۔ پس اتنا ہی امتیاز ہے جو مرد کو عوت کے مقابلے میں حاصل ہے۔ بشرطیکہ اس انتظامی ذمہ داری کو جو سرتا سر ایک بوجھ ہے، وجہ امتیاز تسلیم کر لیا جائے۔

یہ ظاہر ہے کہ اس امتیاز سے مرد کو کوئی پیدائشی امتیاز حاصل نہیں ہو جاتا، محض

خاندانی نظام کا ایک خاص ڈھنگ ہے جس نے یہ جگہ اسے دلا دی ہے۔ فرض کرو، متمدن انسانوں کا خاندانی نظام اس طرح چلنے لگتا کہ انتظام معیشت کی باگ مرد کی جگہ عورت کے ہاتھ آ جاتی تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں یہ امتیاز مرد کو نہیں ملتا عورت کے حصہ میں آ تا۔

جہاں تک معیشتی اور مالیاتی استقلال (آزادی) کا تعلق ہے قرآن نے اس صاف انکار کر دیا ہے کہ یہ استقلال صرف مردوں ہی کے حصہ میں آیا ہے۔ اس نے قطعی لفظوں میں اعلان کر دیا کہ مرد کی کمائی مرد کے لیے ہوگی، عورت کی کمائی عورت کے لیے۔ عورت بیٹی ہو کر باپ سے الگ، بہن ہو کر بھائی سے الگ، بیوی ہو کر شوہر سے الگ مستقلاً اپنی کمائی کا انتظام کر سکتی ہے اور اس کی مالک ہو سکتی ہے:

للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن (النساء:32) مردوں نے جو کچھ کمائی کی اس میں ان کا حصہ ہوا، عورتوں نے جو کچھ کمائی کی اس میں ان کا حصہ ہوا)۔ ان تمام تصریحات سے معلوم ہوا کہ جہاں تک جنسی درجے اور حقوق کا تعلق ہے قرآن کے نزدیک دونوں جنسیں برابر ہوئیں۔ البتہ لعیشت کی فراہمی کا کام نظام معاشرت نے مردوں کے در ڈال دیا ہے۔ اسی کو وہ ایک 'خاص درجہ' سے تعبیر کرتا ہے۔ اصلاً یہ ایک طرح کی باہمی تقسیم عمل ہے، مرد کماتا ہے، عورت خرچ لکرتی ہے۔ قرآن کے تمام مخاطبات عام ہیں۔ وہ جب کبھی یا ایھا الناس اور یا ایھا الذین آمنوا کہتا ہے تو یکساں طور پر دونوں جنسوں کو مخاطب کرتا ہے۔ اس نے مذہبی اعمال وطاعات یکساں طور پر دونوں کے حصہ میں آئے۔ انسان ان دونوں نصف ٹکڑوں کے ملنے سے انسان ہے۔ ایک نصف دوسرے نصف سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تو کمتر ہے، میں

بہتر ہوں۔

خطابات اور بیانات میں آج کل یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ جب کبھی معاشرت و جمعیت کے اعتبار سے لوگوں کا ذکر کیا جائے تو مرد اور عورت دونوں کو یاد کر لیا جائے۔ مثلاً کہیں گے" ہر مرد اور عوت کا یہ فرض ہے" یا" قوم ہر مرد اور عورت سے یہ امید رکھتی ہے" ہر ایسا بیان جو اس تصریح سے خالی ہو ناقص بیان سمجھا جاتا ہے، لیکن قرآن نے آج سے تیرہ سو برس پہلے یہی اسلوب بیان اختیار کیا تھا:

ان المسلمین و المسلمات و المومنین و المومنات والقانتین و القانتات ولصادقین والصادقات (الاحزاب: ۹)

والمومنون والمومنات بعضهم اولیاء بعض یا مرون بالمعروف و ینهون عن المنکر (التوبہ:71)

یورپ میں آج تک عورت اپنے ذاتی نام سے اپنی شخصیت نمایاں نہیں کر سکتی۔ جب تک شادی نہیں ہوئی مس ٹامسن ہے۔ جب شادی ہوگئی تو مسز جونس ہو گئی۔ یعنی خود اس کی شخصیت کوئی مستقل انفرادیت نہیں رکھتی، یا باپ کے سائے میں دکھائی دے گی یا شوہر کے۔ لیکن مسلمانوں کی معاشرتی تہذیب میں کبھی ایسا نامنصفانہ تخیل پیدا نہیں ہوا۔ عورت لڑکی ہو یا بیوی، وہ ہمیشہ فاطمہ اور عائشہ ہی کی حیثیت سے نمایاں ہوگی۔ باپ اور شوہر کے سایہ میں نہیں چھوڑ دی جائے گی۔ افسوس ہے کہ اب یورپ کی اندھی تقلید میں لوگ اس درجہ کھو گئے ہیں کہ اپنا قدیم طریقہ چھوڑ کر یورپ کا طریق تسمیہ اختیار کرتے جاتے ہیں، چنانچہ ہندوستان اور مصر وغیرہ میں یہ طریقہ عام ہو گیا ہے کہ"

مس اور" مسز" "مادا موزیل" اور" مادام" کی ترکیب سے جدید تعلیم یافتہ خواتین کو یاد کیا جائے گا۔ حالانکہ یورپ بھی اس کا خواہش مند نہیں کہ اس رسم کی عمر اور دراز کی جائے۔ قرآن کے نزول سے پہلے عرب کا بھی وہی حال تھا جو اس بارے میں تمام دنیا کا تھا، لیکن قرآن کی تعلیم نے جو انقلاب حال پیدا کردیا اس کی وضاحت کے لیے صرف ایک واقعے کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد جب مسلمانوں میں پہلی مرتبہ سیاسی خانہ جنگی برپا ہوئی تو ایک گروہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کی قیادت میں میدان جنگ کا رخ کیا اور اس وقت کسی مسلمان کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں گزری کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عورت ہو کر ایک سیاسی اور فوجی تحریک کی قائد کیسے ہو سکتی ہیں؟ جو مسلمان آج سے تیرہ سو برس پہلے حضرت عائشہؓ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوئے تھے ظاہر ہے کہ انہیں عورتوں کے اس حق کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ جو لوگ مخالف تھے ان کی مخالفت بھی اصل مابہ النزاع معاملے میں تھی۔ اس بارے میں نہ تھی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عورت ہو کر ایک جنگ آزما سیاسی گروہ کی قائد کیوں کر ہو سکتی ہیں۔"[۴۹]

اسی طرح فقہ کا ایک اہم معاملہ نسخ کی بحث کا بھی ہے۔ یہ ایک ایسی بحث ہے کہ فقہاء کے درمیان میں اختلاف کی جو گنجائش بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ نسخ یعنی ایک حکم کا منسوخ ہو کر دوسرا حکم آجانا۔ اختلاف کی وجہ وہی ہے ایک فقیہہ جس حکم کو منسوخ کرتا ہے دوسرا اس کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس سلسلے میں بھی مولانا نے دوٹوک باتیں کہیں ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

"ایک شریعت کے بعد دوسری شریعت کا ظہور اس لیے ہوا کہ یا تو نسخ کی حالت طاری ہوئی یا نسیان کی، نسخ یہ ہے کہ ایک بات پہلے سے موجود تھی لیکن

موقوف ہوگئی اور اس کی جگہ دوسری بات آ گئی۔ سنت الٰہی یہ ہے کہ مسخ شرائع ہو یا نسیان شرائع لیکن ہر نئی تعلیم پچھلی تعلیم سے بہتر ہوگی یا اس کے مانند ہوگی۔''

تاریخی واقعات کی تفسیر وتوضیح میں مولانا آزاد کی انفرادیت:۔ تاریخی واقعات کی تفسیر میں توضیح وتشریح اور تحقیقی موشگافیوں سے جو استناد مولانا آزاد نے بخشی ہے وہ ان کے وسعت مطالعہ، قوت استدلال اور لہجہ کے اعتماد کا ضامن ہے۔ مثلاً سورہ کہف میں اصحاب کہف کے سلسلے میں نادر تحقیقات ان کی علمی کاوشوں کا شاہکار ہے، محققین کی ایک جماعت کا خیال یہ ہے کہ کہف اور رقیم ان غار اور کتبوں کے لیے وارد ہوا ہے جو علاقہ افسوس یا افسس (EPHESUS) میں واقع ہے اور یہ علاقہ ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر رومیوں کی مشہور بندرگاہ وشہر کے لیے موسوم تھا۔ مولانا آزاد اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا بیان حسب ذیل ہے:۔

''مسیحی مذہب کے ابتدائی قرنوں میں متعدد واقعات ایسے گزرے ہیں کہ عیسائیوں نے مخالفوں کے ظلم ووحشت سے عاجز آ کر پہاڑوں کے غار میں پناہ لی اور آبادیوں سے کنارہ کش ہوگئے۔ یہاں تک کہ وہیں وفات پا گئے اور ایک عرصے کے بعد نعشیں برآمد ہوئیں۔ چنانچہ ایک واقعہ خود روم کے اطراف میں گزرا تھا۔ ایک اطا کیہ کی طرف منسوب ہے۔ ایک افسس میں بیان کیا جاتا ہے۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سورت میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ کہاں پیش آیا تھا۔ قرآن نے ''کہف'' کے ساتھ ''الرقیم'' کا لفظ بھی بولا ہے اور بعض ائمہ تابعین نے اس کا یہی مطلب سمجھا تھا کہ یہ ایک شہر کا نام ہے لیکن چونکہ اس نام کا کوئی شہر عام طور پر مشہور نہ تھا اس لیے اکثر مفسرین اس طرف چلے گئے کہ یہاں رقیم کے معنی کتابت کے ہیں۔ یعنی ان

کے غار پر کوئی کتبہ لگا دیا گیا تھا۔اس لیے کتبہ والے مشہور ہو گئے۔لیکن اگر انہوں نے تورات کی طرف رجوع کیا ہوتا تو معلوم ہو جاتا کہ ''رقیم'' وہی لفظ ہے جسے تورات میں ''راقیم'' کہا گیا ہے اور یہ فی الحقیقت ایک شہر کا نام تھا جو آگے چل کر پیٹرا کے نام سے مشہور ہوا اور عرب اسے بطرا کہنے لگے۔ عالمگیر جنگ کے بعد آثار قدیم کی تحقیقات کے جو نئے نئے گوشے کھلے ہیں ان میں ایک پیٹرا بھی ہے اور ان کے انکشافات نے بحث ونظر کے لیے ایک نیا میدان مہیا کر دیا ہے۔''

جزیرہ نمائے سینا اور خلیج عقبہ سے سیدھے شمال کی طرف بڑھیں تو وہ پہاڑی سلسلے متوازی شروع ہو جاتے ہیں اور سطح زمین بلندی کی طرف اٹھنے لگتی ہے۔ یہ علاقہ نبطی قبائل کا تھا اور اسی کی ایک پہاڑی سطح پر ''راقیم'' نام شہر آباد تھا۔ دوسری صدی عیسوی میں جب رومیوں نے شام اور فلسطین کا الحاق کر لیا تو یہاں کے دوسرے شہروں کی طرح ''راقیم'' نے بھی ایک رومی آبادی کی حیثیت اختیار کر لی اور یہی زمانہ ہے جب پیٹر کے نام سے اس کے عظیم الشان مندروں اور تھیٹر وں کی شہرت دور دور تک پہنچی ۔ 640 میں جب مسلمانوں نے یہ علاقہ فتح کیا تو ''راقیم'' کا نام بہت کم زبانوں پر رہا تھا۔ یہ رومیوں کا پیٹرا اور عربوں کا بطرا تھا۔

''جنگ کے بعد اس علاقہ کی از سر نو اثری پیمائش کی جارہی ہے اور نئی نئی باتیں روشنی میں آرہی ہیں۔ازانجملہ اس علاے کے عجیب وغریب غار ہیں جو دور دور تک چلے گئے ہیں اور نہایت وسیع ہیں۔ نیز اپنی نوعیت میں ایسے واقع ہوئے ہیں کہ دن کی روشنی کسی طرح بھی ان کے اندر نہیں پہنچ سکتی۔ایک غار ایسا بھی ملا ہے جس کے دہانہ کے پاس قدیم عمارتوں کے آثار پائے جاتے

ہیں اور بے شمار ستونوں کی کرسیاں شناخت کی گئی ہیں۔ خیال کیا گیا ہے کہ یہ
کوئی معبد ہوگا جو یہاں تعمیر کیا گیا تھا۔"

"اس انکشاف کے بعد قدرتی طور پر یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ اصحاب
کہف کا واقعہ اسی شہر میں پیش آیا تھا اور قرآن نے صاف صاف "الرقیم"
بتا دیا ہے اور جب اس نام کا ایک شہر موجود تھا پھر کوئی وجہ نہیں کہ رقیم کے معنی
میں تکلفات کیے جائیں اور بغیر کسی بنیاد کے اسے کتبہ پر محمول کیا جائے۔"

"علاوہ بریں دوسرے قرائن بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ قرآن
نے جس طرح اس واقعہ کا ذکر کیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس
واقعہ کی عرب میں شہرت تھی۔ لوگ اس بارے میں بحثیں کیا کرتے تھے اور
اسے ایک نہایت ہی عجیب وغریب بات تصور کرتے تھے۔"[۱۴]

اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا نے الرقیم کی تشریح و توضیح میں تاریخی دلائل کی مدد
سے حقیقت پانے کی کوشش کی ہے اور اپنی رائے کی تقویت کے لیے 1918 کی عالمگیر جنگ
کے بعد واقع ہوئی منکشف آثار قدیمہ کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔ نیز وہ ایک شعر سے بھی اپنی بات
منوانا چاہتے ہیں جس میں شاعر کہتا ہے۔ ؎

ولیس بها الا الرقیم مجاورا
و صدهم والقوم فی الکهف همد

اصحاف کہف اور رقیم کے سلسلے میں مولانا نے غیر معمولی جانفشانی اور گہرے وعمیق
تاریخی مطالعے کی مدد سے جو دلیلیں پیش کی ہیں اس سے اختلاف کی پوری گنجائش ہے لیکن پھر
بھی قابل توجہ ہے۔ مولانا کی توجیہہ سے مسئلہ کی بہت سی گرہیں کھل جاتی ہیں۔

سورہ کہف میں ذوالقرنین کا بھی واقعہ ہے۔ تفسیر کے اعتبار سے سب سے اہم اور
نازک مقام ذوالقرنین کے تذکرے کا مقام ہے۔ مفسرین کے درمیان ذوالقرنین کی شخصیت

کے تعین میں مختلف نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں جو اکثر و بیشتر قیاس پر مبنی ہیں۔ اس سلسلے میں مورخین کے کئی رجحانات سامنے آئے ہیں۔ کسی نے ذوالقرنین سے مراد سکندر مقدونی لیا ہے جس کا زمانہ 356 تا 363 قبل مسیح ہے۔ یہ رائے امام رازی، امام بغوی، امام طبری، امام سیوطی کے علاوہ متاخرین مفسرین میں عبدالماجد دریا آبادی کے علاوہ ''المنجد'' کے مرتبین عبد اللہ العلایلی، السید حسن الامین اور منیر العمادی جیسے محققین ہیں۔ ایک گروہ محققین و مورخین کا وہ ہے جو ذولقرنین کو سکندر تو تسلیم کرتا ہے لیکن وہ سکندر مقدونی نہیں جس کا مشیر و وزیر ارسطو تھا بلکہ وہ سکندر جو عربی النسل سامی تھا اور یہ سکندر سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں تھا۔ اس رجحان کے مورخین و محققین میں ایک اہم نام امام ابن کثیر کا ہے جنہوں نے اپنی تصنیف ''البدایہ ولنہایہ'' میں بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے اور سکندر سامی کو ایک اہل ایمان اور عادل حکمراں تسلیم کیا ہے۔ ابن کثیر نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اسی ذوالقرنین کے وزیر حضرت خضر علیہ السلام تھے جو ایک نبی تھے۔ اہل تحقیق کا ایک گروہ ذوالقرنین کو عرب کا ایک حکمراں تسلیم کرتا ہے جو ملک حیرہ کے خاندان کا ایک فرماں روا تھا۔ بہر حال مفسرین ذوالقرنین کی شخصیت کے تعین میں ایک بات پر متفق نہ ہو سکے۔ مولانا آزاد نے ذوالقرنین کے سلسلے میں اس کے مالہ وما علیہ پر جتنی مربوط اور مدلل سیر حاصل بحث کی ہے اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے منفرد اور بے مثال ہے۔ مولانا نے ذوالقرنین کی شخصیت کے تعین میں بہ یک وقت قرآن فہمی اور غیر معمولی تاریخ دانی کا ثبوت دیا ہے جو قابل رشک ہے۔ مولانا آزاد نے ذوالقرنین کی نشان دہی و تعین میں سب سے پہلے بنی اسرائیل کی تاریخ میں ذوالقرنین کے لقب سے معروف شخصیت کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے اور اسرائیلی تاریخ کے ملبے سے ایک ایسی شخصیت کو برآمد کیا جو قرآن کے ذوالقرنین کے مصداق ہے وہ ایران کا مشہور بادشاہ شہنشاہ سائرس (کیخسرو) ہے۔ اس کا لقب بھی ذوالقرنین (دوسینگوں والا) تھا۔ اس شخصیت کا یہودی لٹریچر میں خوب تذکرہ ملتا ہے اور اس شخصیت میں قرآن کی تمام بیان کردہ خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں۔ پھر یہ کہ مولانا آزاد نے

مزید تین صفات جس سے ذوالقرنین کو از روئے قرآن متصف ہونا چاہیے۔ان کی نشاندہی کی ہے۔یعنی خدا پرستی۔انصاف پسندی اور مال ومنال سے بے نیازی۔ یہ ثابت کیا کہ یہ تینوں صفات سائرس میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔یہودی لٹریچر کے مطابق نبی دانیال نے اسی شخصیت کے بارے میں خواب میں دیکھا تھا کہ بخت نصر کے ہاتھوں بنی اسرائیل کی تباہی و بربادی اور یروشلم کے نبست و نابود ہو جانے کے بعد ان کا ایک نجات دہندہ ظاہر ہوگا جس کو تشبیہ و تمثیل کے پیرایے میں ان کے خواب میں طاقت ور دو سینگ والے مینڈھے کی شکل میں بتایا گیا ہے۔مولانا نے اس سلسلے میں تفصیلی بحث کی ہے اور ذوالقرنین کی تحقیق میں قدیم اور جدید ماخذ کی پوری چھان بین کی ہے۔دیکھیے یہ اقتباس:۔

''چونکہ (دانیال) کے ایک خواب میں میڈیا اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دی گئی تھی اس لیے خیال ہوتا تھا کہ عجب نہیں فارس کے شہنشاہ کے لیے یہودیوں میں ذوالقرنین کا تخیل پیدا ہو گیا ہو۔یعنی دو سینگوں والی شہنشاہی اور وہ اسے اس لقب سے پکارتے ہوں۔تاہم یہ محض ایک قیاس تھا اس کی تائید میں کوئی تاریخی شہادت موجود نہ تھی۔لیکن 1838 کے ایک انکشاف نے جس کے نتائج بہت عرصہ بعد منظر عام پر آئے اس قیاس کو ایک تاریخی حقیقت ثابت کر دیا اور معلوم ہو گیا کہ فی الحقیقت شہنشاہ سائرس کا لقب ذوالقرنین تھا اور یہ محض یہودیوں کا کوئی مذہبی تخیل نہ تھا بلکہ خود سائرس کا یا باشندگان فارس کا مجوزہ اور پسندیدہ نام تھا۔''۴۲

ذوالقرنین کا یہ تخیل صرف یہودیوں کا مذہبی اعتقاد ہی نہیں بلکہ تاریخ عالم کی ایک مسلمہ حقیقت بھی ہے جس کی حیرت انگیز دلیل مولانا نے دی ہے۔فرماتے ہیں:۔

''ایک انکشاف نے شک وتخمین کے تمام پردے اٹھا دیے۔یہ سائرس کی ایک سنگی تمثال (پتھر کا مجسمہ) ہے جو اصطخر کے کھنڈروں میں دستیاب ہوئی۔

اس میں سائرس کا جسم اس طرح دکھایا گیا تھا کہ اس کے دونوں طرف عقاب کی طرح پر نکلے ہوئے ہیں اور سر پر مینڈھے کی طرح دو سینگ ہیں، اور پر خط منخی میں جو کتبہ کندہ سے وہ اس کے لیے کافی ہے کہ تمثال کی شخصیت واضح ہو جائے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ مادہ اور فارس کی مملکتوں دو سینگوں سے تشبیہہ دینے کا تخیل ایک مقبول اور عام تخیل تھا اور یقیناً سائرس کو ذوالقرنین کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔''

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:۔

''دو سینگوں کا تخیل ابتدا میں کیوں کر پیدا ہوا؟ کیا اس کی بنیاد دانیال نبی کا خواب تھا یا بطور سائرس نے یا باشندگان فارس نے یہ تخیل پیدا کیا؟ اس کا فیصلہ مشکل ہے۔ لیکن اگر توریت کی روایات تسلیم کر لی جائیں تو سائرس سے لے کر آرٹا کسز (ارتخلشلسٹ) اول تک تمام شہنشاہ پارس انبیاء بنی اسرائیل سے عقیدت رکھتے تھے اور اس سے ہو سکتا ہے کہ اسی خواب سے ذوالقرنین کا لقب پیدا ہو گیا ہو۔ بہر حال اب اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ سائرس کو ذوالقرنین سمجھا جاتا تھا اور یقیناً عرب کے یہودی بھی اسے اسی لقب سے پکارا کرتے تھے۔''

''اس حقیقت کی وضاحت کے بعد جب سائرس کے ان حالات پر نظر ڈالی جاتی ہے جو یونانی مورخون کی زبانی ہم تک پہنچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے بیان کی ہو بہو تصویر ہے اور دونوں بیان اس درجہ باہم مطابقت رکھتے ہیں کہ ممکن نہیں کسی دوسری شخصیت کا وہم وگمان بھی کیا جا سکے۔''۳۴

واضح ہو کہ مولانا نے یہ ساری تحقیق فرانسیسی سیاح Diemlfoy Marcel کی شاہکار تصنیف L.Art Antiqeen Perse سے ماخذ کی ہے۔ تفسیر لکھتے وقت مستشرقین کی

جانب سے اسلام اور قرآن کے بارے میں اٹھائے جانے والے سوالات اور الزامات وغیرہ کو بھی ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ کہف کے سلسلے میں ان کے تفسیری مباحث طویل ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ذوالقرنین کے سلسلے میں تفسیری مباحث کے اختتام پر یوں رقمطراز ہیں:۔

''ہم نے ذوالقرنین کے بحث میں پوری تفصیل سے کام لیا ہے۔ چونکہ زمانۂ حال کے معترضین قرآن نے اس مقام کو سب سے زیادہ اپنے معاندانہ استہزا کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں ''ذوالقرنین کی کوئی تاریخی اصلیت نہیں ہے۔ یہ محض عرب یہودیوں کی ایک کہانی تھی جو پیغمبر اسلام نے اپنی خوش اعتقادی سے صحیح سمجھ لی اور نقل کر دی'' اس لیے ضروری تھا کہ ایک مرتبہ یہ مسئلہ اس طرح صاف کر دیا جائے کہ شک و تردد کا کوئی پہلو باقی نہ رہے۔''[۴۴]

غرض ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا آزاد نے اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے متعلق تفسیر میں توضیح و تشریح اور تحقیقی انکشافات کیے ہیں۔ اس کی حیثیت علمی شاہکار کی ہے۔ تاریخی شواہد، قوت استدلال اور جچی تلی زبان میں دلاویز پیشکش کی وجہ سے اسے مولانا کے اختصاص قرار دیے جا سکتے ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی وغیرہ نے بھی مولانا کی رائے کو تسلیم کیا ہے۔ بقول مولانا ابوالاعلیٰ مودودی:۔

''جدید زمانے میں تاریخی معلومات کی بنا پر مفسرین کا میلان زیادہ تر ایران کے فرمان روا (خورس، خسرو یا سائرس) کی طرف ہے اور یہ نسبت زیادہ قرین قیاس ہے۔''[۴۵]

''قصص القرآن'' کے مصنف مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے بھی مولانا کی اسی تحقیق کو تسلیم کیا ہے اور اس کی پرزور وکالت کرتے ہوئے پورے وثوق کے ساتھ اس کی پیروی بھی کی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

''دلائل و براہین کی قوت کے لحاظ سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کی تحقیق بلا شبہ صحیح اور قرآن کے بیان کردہ اوصاف اور تاریخی حقائق کی مطابقات کے پیش نظر ہر طرح لائق ترجیح ہے۔''[۴۶]

اسی طرح سورہ کہف میں امام خضر کے متعلق مولانا کی جو تحقیق ہے نکتہ آفریں ہے اور عام مفسرین کی تحقیق سے جدا ہے۔ یاجوج و ماجوج کے بارے میں مولانا کا قول حتمی اور قطعی ہے۔ ان لوگوں کا تعلق منگول قبائل سے ہے۔ ہم کہ سکتے ہیں کہ تاریخی واقعات خصوصاً سورہ کہف کی تفسیر میں مولانا کے اپنے خاص امتیازات ہیں۔ اسی طرح یوسف کو عزیز مصر کی بیوی کی منشاء پوری نہ ہونے کی وجہ سے انہیں قید و بند کی سزا بھگتنی پڑی۔ اس واقعہ کی تفسیر میں مولانا آزاد نے جو نقطہ آفرینی دکھائی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ سامری کی گوسالہ پرستی کے واقعہ کے سلسلے میں جن مفسرین نے رسول سے مراد فرشتہ اور قبضۃ من اثر الرسول'' کا مطلب فرشتے کی نقش قدم کی مٹی لی ہے، ان پر مولانا آزاد نے سخت تنقید کرتے ہوئے اسے یہود کی کہانی قرار دیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:۔

''افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ کہانی تفسیر کی روایتوں میں بھی داخل ہوگئی اور ''اثر الرسول'' کا مطلب یہ بنالیا کہ ''جبریل کے نقش قدم'' کی ایک مشتِ خاک سامری نے اٹھالی تھی۔ لیکن یاد رہے کہ یہ تفسیر کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتی۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ ایسی تفسیر کرنا قرآن کے اس مقام کو تمسخر انگیز حد تک بے معنی بنا دینا ہے۔''[۴۷]

جہاں تک ترجمان القرآن کے اسلوب نگارش کا سوال ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ترجمان القرآن جیسے خالص مذہبی موضوع پر بھی ان کی انشاء پردازی کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ دیکھئے یہ تراشے:

''وجہ الٰہی کے مستور و محجوب چہرے نے جب سرزمین فاران میں اپنا نقاب

الٹا تو اس کے جمال حقیقت کا اولین نظارہ اسی سورہ فاتحہ میں تھا اور پھر یہی سورہ ہمیشہ کے لئے پہلی بھی قرار پائی کہ کرہ ارض پر نوع انسان جب کبھی جستجوئے حقیقت میں بے قرار ہوگی تو سب سے پہلے یہی جلوہ حق اس کے سامنے آئے گا۔" ۴۸

☆☆☆

"جس دنیا میں سورج ہر روز چمکتا ہو جس دنیا میں صبح ہر روز مسکراتی اور شام ہر روز پردہ شب میں چھپ جاتی ہو جس کی راتیں آسمان کی قندیلوں سے مزین اور جس کی چاندنی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہو۔ جس کی بہار سبزہ وگل سے لدی ہو۔۔۔ کیا اس دنیا میں کوئی باشندہ آسائش حیات سے محروم اور نعمت معیشت سے محروم ہو سکتا ہے۔" ۴۹

☆☆☆

"اگر سمندر میں طوفان نہ اٹھتے تو میدانوں کو زندگی وشادابی کے لیے ایک قطرۂ بارش میسر نہ آتا۔ اگر بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک نہ ہوتی تو باران رحمت کا فیضان بھی نہ ہوتا۔ اگر آتش فشاں پہاڑوں کی چوٹیاں نہ پھٹتیں تو زمین کے اندر کا کھولتا ہوا مادہ اس کرہ کی تمام سطح کو پارہ پارہ کر دیا۔ تم بول اٹھو گے، یہ مادہ پیدا ہی کیوں کیا گیا؟ لیکن تمہیں جاننا چاہیے کہ اگر یہ مادہ نہ ہوتا تو زمین کی قوت نشو ونما اایک ضروری عنصر مفقود ہو جاتا۔" ۵۰

☆☆☆

"....... ہر قوت، استداد ڈھونڈ رہی ہے اور ہر تاثیر اثر پذیری کے انتظار میں ہے، جونہی کسی وجود میں بڑھنے اور نشو ونما پانے کی استداد پیدا ہوتی ہے معاً تمام کارخانۂ ہستی اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ سورج کی تمام کارفرمائیاں،

فضا کے تمام تغیرات، زمین کی تمام قوتیں، عناصر کی تمام سرگرمیاں مصرف اس انتظار میں رہتی ہیں کہ کب چیونٹی کے انڈے سے ایک بچہ ہوتا ہے اور کب دہقان کی جھولی سے زمین پر ایک دانہ گرتا ہے۔''اھ

☆☆☆

ترجمان القرآن کے اسلوب نگارش کے سلسلے میں اردو کے صاحب طرز انشاپرداز پروفیسر رشید احمد صدیقی نے بہت ہی جچے تلے اور لطیف انداز میں تفسر ہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

''مولانا نے نے لکھنے کا انداز، لب ولہجہ اور مواد کلام پاک سے لیا جو ان کے مزاج کے مطابق تھا۔ مولانا پہلے اور آخری شخص ہیں جنہوں نے براہ راست قرآن کو اپنے اسلوب کا سرچشمہ بنایا۔ وہی انداز بیان اور زور کلام اور وعید و تہدید کے تازیانے، جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ پہاڑوں کو رعشۂ سیماب طاری کر دیتا۔ مولانا کی تحریروں میں وہ نرمی اور نوازش نہ ملے گی جو پیغمبروں کی دعوت میں ملتی ہے۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں مولانا کی طبیعت پیغمبری کے رول سے اتنی سازگار نہ تھا جتنی خدائی کے رول سے۔ خدا پیغمبروں کی طرح انسانوں میں گھلا ملا نہیں ملتا۔ اس لیے کہ پیغمبروں کی طرح وہ انسانوں میں سے نہیں ہوتا۔''۵۲

☆☆☆

بیسویں صدی کے مستند مفسر قرآن اور بلند پایہ عالم دین مولانا امین احسن اصلاحی نے مولانا آزاد کی تفسیر پر یوں اظہار خیال کیا:۔

''مولانا آزاد رحمتہ اللہ علیہ کی تفسیر کے بعض مباحث اتنے قیمتی ہیں کہ وہ دوسروں کے ہزاروں صفحات پر بھاری ہیں۔ میں نے بھی اپنی کتاب میں ان سے استفادہ کیا ہے اور ان کا حوالہ دیا ہے مثلاً ذوالقرنین کی بحث (اس وقت

کتاب میں یہ حوالہ نہیں ہے۔ مسودہ میں یہ حاشیہ پر تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ
کتابت سے رہ گیا ہے: مدیر) اور بھی متعدد مباحث نہایت قیمتی ہیں، مجھے
مولانا کے بعض نظریات سے اختلاف ہے اور میں نے نام لیے بغیر ان پر تنقید
بھی کی ہے لیکن اس کے باوجود میری نظر میں ان کی اور ان کی کتاب کی بڑی
عظمت ہے۔'' ۵۳؎

☆☆☆

مولانا ابوالکلام آزاد کے اسی منفرد اسلوب میں قرآنی لب ولہجہ کی کیفیت محسوس کرتے
ہوئے سجاد انصاری نے لکھا ہے۔

''میرا عقیدہ ہے کہ اگر قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا اور اردو میں نازل ہوتا تو اس کے لئے
یا تو اقبال کی شاعری منتخب کی جاتی یا ابوالکلام کی نثر'' ۵۴؎

☆☆☆

علامہ نیاز فتح پوری جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اچھے اچھوں کو خاطر میں نہ لاتے
تھے، مولانا آزاد کے تبحر علمی کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''ہم نے مولانا کو اتنا ہی جانا جتنا وہ چاہتے تھے کہ ہم جانیں اور ان کی ہستی
کے بہت سے امکانات دنیا پر ظاہر نہ ہو سکے۔ جس حد تک میرے ذاتی ربط
اور مطالعے کا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر ان کی زندگی ایک خاص سانچے
میں ڈھل کر وہ نہ ہو جاتی جو ہمارے سامنے آئی تو وہ خدا جانے کیا کیا ہو سکتے
تھے۔ اگر وہ عربی شاعری کی طرف توجہ کرتے تو متنبی اور بدیع الزماں ہوتے،
اگر وہ محض دینی و مذہبی اصلاح کو اپنا شعار بنا لیتے تو اس عہد کا ابن تیمیہ ہوتے
، اگر محض علوم حکمیہ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیتے تو ابن رشد اور ابن
طفیل سے کم درجے کے متکلم اور فیلسوف نہ ہوتے، اگر وہ فارسی شعر و ادب

کی طرف متوجہ ہوتے تو عرفی ونظیری کی صف میں انہیں جگہ ملتی۔ وگر وہ تصوف و اصلاح اخلاق کی طرف مائل ہوتے تو غزالی اور رومی سے کم نہ ہوتے اور اگر وہ مسلک اعتزال اختیار کرتے تو دوسرے واصل بن عطا ہوتے۔"۵۵

مولانا ڈسٹرکٹ جیل میرٹھ میں ترجمان القرآن کا دیباچہ لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں:

' میرا یقین ہے کہ مسلمانوں کی زندگی وسعادت کے لیے سرچشمۂ حیات حقیقت قرآن کا انبعاث ہے اور میں نے کوشش کی ہے کہ اس کے فہم وبصیرت کا دروازہ ان پر کھل جائے۔ میں ترجمان القرآن شائع کرتے ہوئے محسوس کرتا ہوں کہ اس بارے میں جو کچھ میرا فرض تھا، توفیق الٰہی کی دستیاری سے میں نے ادا کر دیا۔ اب اس کے بعد جو کچھ ہے وہ مسلمانوں کا فرض ہے اور یہ اللہ کے ہاتھ ہے کہ انہیں ادائے فرض کی توفیق دے۔

حدیث عشق ق سرمستی زمن بشنو، نہ از واعظ
کہ باجام و سبو ہر شب قرین ماہ و پروینم"

مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ ترجمان القرآن میں تاریخی واقعات کی تفسیر مولانا کی قرآنی بصیرت اور علمی صلاحیتوں کی معراج ہے۔ انہوں نے خصوصی طور پر تاریخی واقعات کی تفسیر میں جو انفرادیت، استناد قائم کیا ہے یہی اس کا اختصاص ہے۔

حواشی

۱۔ البحر المحیط، ابوحیان۔ صفحہ ۱۴، بحوالہ معارف القرآن مفتی شفیع

۲۔ الاتقان جلد ۴ صفحہ ۱۷۴، بحوالہ اردو تفاسیر از جمل نقوی

۳۔ ایضاً۔ ص۔ ۱۷۴

۴۔ معارف القرآن حصہ اول، مفتی شفیع

۵۔الہلال مولانا ابوالکلام آزاد شمارہ ۱۲ انومبر ۱۹۱۵

٦۔(مقدمہ ترجمان القرآن۔ابولکلام آزاد، ساہتہ اکاڈمی دہلی۔ص 18

٦۔ایضاً

ے۔ایضاً، حصہ اول، ص۔۱۹

۸۔مولانا ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن جلداول، ساہتیہ اکادیمی، نئی دہلی، ۱۹٦۴ء، ص ۹۔ایضاً

ص۔ے

۹۔ایضاً (الف)

۱۰۔ترجمان القرآن۔جلداول۔ابوالکلام آزاد۔ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی۔ص 18

۱۱۔ترجمان القرآن۔ص 22-21

۱۲۔ایضاً ص۔۲۱۰

۱۳۔ایضاً۔۲۱۰

۱۴۔ترجمان القرآن جلداول دیباچے صفحہ ۵۱ تا صفحہ ۵۲

۱۵۔ترجمان القرآن جلداول دیباچہ طبع اول صفحہ ۱۸

۱٦۔ترجمان القرآن جلداول صفحہ ۸

۱ے۔مطبوعہ معارف اکتوبر ۱۹۳۲ از سید سلیمان ندوی

۱۸۔میر کارواں مولانا ابوالکلام آزاد صفحہ ۲۴۴

۱۹۔ماہنامہ معارف اعظم گڑھ

۲۰۔ترجمان القرآن جلداول تفسیر سورہ فاتحہ صفحہ ۲

۲۱۔ایضاً۔ص۔۱۴

۲۲۔ایضاً۔ص۔۱۲

۲۳۔ایضاً۔ص۔۸۳۔۸۴

۲۴۔ایضاً۔ص۔۲۲۰

۲۵۔ایضاً۔ص۔۲٦۰

۲٦۔سید سلیمان ندوی

۲۷۔تلخیص ترجمان القرآن۔ص۔۵۸

۲۸۔ترجمان القرآن جلد 1ص۔320

۲۹۔ترجمان القرآن 312-317

۳۰۔بحوالہ ُمیرا عقیدہ،شائع کردہ مکتبہ جامعہ ۱۹۵۹ص۲۴

۳۱۔الجمعیۃ مولانا آزاد نمبر۔1958ء ص۔55

۳۲۔ترجمان القرآن۔ص۔۳۵۹۔۳٦۰

۳۳۔ترجمان القرآن۔ص۔۳٦۷۔۳٦۸

۳۴۔ایضاً۔ص۔۱۳۳

۳۵۔ایضاً۔ص۔٦۸۵

۳٦۔ترجمان القرآن جلد2،ص،133

۳۷۔ترجمان القرآن ص144

۳۸۔ترجمان القرآن جلد3ص419

۳۹۔(مولانا آزاد: تذکرہ، مرتبہ مالک رام، ساہتیہ اکادمی، ساتویں بار:2005،ص55)

۴۰۔ایضاً

۴۱۔ترجمان القرآن جلد4،ص408

۴۲۔ایضاً

۴۳۔ایضاً

۴۴۔ترجمان القرآن جلد چہارم ص۔539

۴۵۔ تفہیم القرآن ۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

۴۵۔ قصص القرآن ۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ۔ جلد 3، ص ۔ 147

۴۷۔ ایضاً

۴۸۔ ترجمان القرآن، ص ۶۳،

۴۹۔ ایضاً ص ۔ ۱۱۱

۵۰۔ ترجمان القرآن ۔ ص 669)

۵۱۔ ترجمان القرآن ۔ ص 39)

۵۲۔ معارف دسمبر 1958ء

۵۳۔ مولانا امین احسن اصلاحی، مکتوب بنام شورش کاشمیری، مورخہ 22 جنوری 1973، تدبیر لاہور، 1971ء صفحہ 26، صفحات 704-406

۵۴۔ محشر خیال ۔ سجاد انصاری بحوالہ آزاد فکر وفن، ملک زادہ منظور، ص ۔ ۲۲۳

۵۵۔ نظامہ، خلیق احمد، آثر مولانا ابوالکلام آزاد، ادارہ ادبیات دلی، 1996ء، ص 5-4

☆☆☆

جامع الشواہد فی دخول غیر مسلم فی المساجد

مولانا آزاد کی فقہی بصیرت کا شاہکار

قبل اس کے کہ مذکورہ کتاب کے مشمولات پر تفصیلی گفتگو کی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالے کی تالیف کا مختصر پس منظر اور محرکات کا جائزہ لیا جائے۔ اس کتاب کی اشاعت کا جواز اور تاریخی وسیاسی پس منظر یہ ہے کہ برطانوی استعماریت کے ظلم واستبداد سے عالمی اور ملکی سطح پر انگریزوں کے خلاف بے چینی اور نفرت کی لہر شباب پر تھی۔ ایک طرف ترکی کی آزادی اور اُس کی حاکمیت کے خلاف برطانوی حکومت نے جوروبیہ اختیار کر رکھا تھا اور اپنی سازشوں سے اُن کے لئے جو خطرہ پیدا کر دیا تھا اس سے کوئی بھی باشعور اور انصاف پسند قوم بے نیاز نہیں رہ سکتی تھی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ مسلمان اپنے برادران وطن کے ساتھ مل کر برطانوی استعماریت کے خلاف قومی اتحاد کی مثال پیش کریں۔ اپنے اس موقف کا اظہار مولانا آزاد نے ''الہلال'' کے پہلے ہی شمارے میں کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

> ''اصل مسئلہ یہ تھا کہ ہندوستان کی نجات کے لیے، ہندوستان میں مسلمانوں کے بہترین فرائض کے انجام دینے کے لیے ہندو مسلم اتحاد ضروری ہے۔ یہ میرا عقیدہ ہے جس کا اعلان میں 1912ء میں الہلال کے پہلے ہی نمبر میں کر چکا ہوں۔
>
> ......ہندستان کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ احکام شرع کو سامنے رکھ کر

حضور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھ کر، جو انہوں نے اہل مدینہ اور بت پرست لوگوں سے مصالحت کرتے ہوئے دکھایا، وہ نمونہ جو خود سرور کائنات نے عملاً پیش کیا ہے۔ اور عملاً وحکماً جو تعلیم قرآن نے دے دی ہے۔ ہندستان کے مسلمانوں کا یہ فرض شرعی ہے کہ وہ ہندستان کے ہندوؤں سے کامل سچائی کے ساتھ عہد ومحبت کا پیمان باندھ لیں اور ان کے ساتھ مل کر ایک نیشن ہو جائیں۔ میرے الفاظ یہ تھے کہ ہندستان کے سات کروڑ مسلمان، ہندستان کے بائیس کروڑ ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں مل کر ہندستان کی ایک قوم اور نیشن بن جائیں۔ اب میں مسلمان بھائیوں کو سنانا چاہتا ہوں کہ خدا کی آواز کے بعد سب سے بڑی آواز جو ہو سکتی ہے وہ محمد ﷺ کی آواز تھی۔ اس وجودِ مقدس نے عہد نامہ لکھا: بجنسہ اس کے الفاظ ہیں: اِنّه اُمّة" واحدة"

ہم ان تمام قبیلوں سے جو مدینہ کے اطراف میں بستے ہیں، صلح کرتے ہیں، اتفاق کرتے ہیں اور ہم سب مل کر ایک امّة واحدة بنا چاہتے ہیں۔ امّة کے معنی ہیں قوم اور نیشن اور واحدة کے معنی ہیں ایک۔[1]

مولانا جب رانچی میں نظر بند تھے تو انہوں نے ۱۳ دسمبر ۱۹۱۸ کو لارڈ چیمسفورڈ کو ایک خط لکھا جس میں خلافت اور جزیرۃ العرب کے بارے میں اسلامی احکام کیا ہیں؟ ان پر اس کی توجہ مبذول کرائی۔ وہ لکھتے ہیں:۔

''میں نے ۱۳ دسمبر ۱۹۱۸ کو (جب میں رانچی میں گورنمنٹ آف انڈیا کے حکم سے نظر بند تھا) لارڈ چیمسفورڈ کو ایک مفصل چٹھی لکھی تھی۔ اس میں واضح کر دیا تھا کہ خلافت اور جزیرۃ العرب کے بارے میں اسلامی احکام کیا ہیں۔ میں نے لکھا تھا کہ اگر برٹش گورنمنٹ اسلامی خلافت اور اسلامی ممالک پر خلاف

وعدہ متصرف ہوگئی تو اسلامی قانون کی رو سے ہندوستانی مسلمان ایک انتہائی کشمکش میں مبتلا ہو جائیں گے۔ان کے لیے صرف دو ہی راہیں رہ جائیں گی، یا اسلام کا ساتھ دیں یا برٹش گورنمنٹ کا۔ وہ مجبور ہوں گے کہ اسلام کا ساتھ دیں۔

بالآخر وہی ہوا۔ گورنمنٹ صریح وعدہ خلافی سے باز نہ رہی، اس وعدہ کا بھی ایفا ضروری نہ سمجھا گیا، جو گورنمنٹ آف انڈیا نے 2/ نومبر 1914ء کے اعلان میں کیا تھا اور وہ وعدہ بھی فریب وقت ثابت ہوا جو مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم انگلستان نے 5/ جنوری 1918ء کو ہاؤس آف کامنس کی تقریر میں کیا تھا۔ شریف آدمیوں کے لیے وعدہ خلافی عیب ہے لیکن طاقتور حکومتوں کے لیے کوئی بات بھی عیب نہیں ہے۔

اس حالت نے مسلمانوں کے لیے آخری درجہ کی کشمکش پیدا کر دی۔ اسلامی قانون کی رو سے کم از کم بات جو ان کے فرائض میں داخل تھی یہ تھی کہ ایسی گورنمنٹ کی اعانت اور کوآپریشن سے ہاتھ کھینچ لیں۔ چنانچہ انہوں نے نے ایسا ہی کیا، وہ اس وقت تک اس پر قائم رہیں کے جب تک انہیں اپنا مذہب اور مذہب کے اٹل احکام عزیز ہیں۔[2]

ادھر پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴۔۱۹۱۸) کے خاتمے پر ہندوستانیوں کو ان کی قربانیوں اور وفاداریوں کے صلے میں ''رولٹ بل'' جیسا سیاہ قانون نافذ کیا گیا تا کہ ہندوستانیوں کو کچلا جا سکے۔ ۶ اپریل کو اس بل کے خلاف سارے ملک میں مظاہرہ کیا گیا۔ گاندھی جی جنوبی افریقہ سے ہندوستان واپس آ چکے تھے۔ گاندھی جی نے اس قانون کی منظوری کے خلاف ستیہ گرہ کرنے کے لئے ۴ مارچ ۱۹۱۹ کو لوگوں سے اپیل کی کہ رولٹ ایکٹ کے خلاف پرامن طریقے سے احتجاج کے طور پر ملک گیر ہڑتال کریں۔ گاندھی جی کی اس آواز پر لوگوں نے لبیک کہا۔ جگہ جگہ

احتجاجی جلسے بھی کیے گئے ۔ یہ تمام کارروائی پُر امن طریقے سے چل رہی تھی کہ دہلی کے ستیا گرہیوں کی ایک حلوائی سے تو تو میں میں ہوئی۔ پولس نے مداخلت کرتے ہوئے کچھ ستیا گرہوں کو حراست میں لے لیا جس کے نتیجے میں بھیڑ جمع ہوگئی۔فوج نے گولی چلادی۔لوگ ادھر اُدھر بھاگنے لگے اور چاندنی چوک کی طرف دوڑے ۔ یہاں فوج نے دوبارہ گولی چلادی جس میں پانچ ہندوستانی جاں بحق ہوگئے ۔اس کی خبر جب سوامی شردھانند کو ملی تو وہ پہلے ریلوے اسٹیشن پہنچے اور اُس کے بعد چاندنی چوک آگئے ۔ وہ ستیا گرہوں اور عوام کو سمجھاتے بجھاتے پیپل پارک کی طرف بڑھے یہاں ایک جلسہ ہوا ۔ اُس کے بعد جب وہ گھر جانے کے لئے چاندنی چوک سے گذر رہے تھے اور بھیڑ اُن کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی کہ سامنے سے ایک فوجی دستہ نے اُن کا راستہ روک لیا۔ بھیڑ مشتعل ہوگئی اور فوجیوں کی طرف بڑھنے لگی۔فوجیوں نے بندوق تان لیا۔سوامی شردھانند آگے بڑھے اور سینہ ننگا کر کے فوجیوں سے مخاطب کرتے ہوئے کہالو اگر مارنا ہے تو مارو گولی ۔ میں حاضر ہوں ۔فوجی جو ہندی نہیں سمجھتے تھے ۔ یہ نظارہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے ۔اتنے میں ایک انگریز افسر پہنچا اور معاملے کو رفع دفع کرتے ہوئے فوجیوں کو وہاں سے جانے کا حکم صادر کیا۔سوامی شردھانند نے اپنی اس جاں بازی اور جاں سپاری عمل سے لوگوں کا دل ایسا جیتا کہ دیکھتے ہی دیکھتے مقبولیت کے اعلی مقام پر پہنچ گئے ۔ ہر طرف یہی چرچا کہ سوامی جی ملک کی آزادی کے لئے اپنی جان کی قربانی کے لئے سینہ تان کر کھڑے ہوگئے ۔ ہر طرف نعرہ تکبیر اللہ اکبر اور گاندھی جی کی جے کی فلک شگاف آواز گونج رہی تھی ۔ ہندو مسلم دونوں نے اتحاد واتفاق کی عملی مثال پیش کی ۔

۳۰ مارچ کو مارے جانے والے شہیدوں کی یاد میں ۳۱ مارچ کو تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا ۔سوامی جی نے بھی اس موقع پر پُر جوش تقریر کی ۔ پھر ۴ اپریل کو جامع مسجد کی طرف سے اعلان ہوا کہ بعد نماز ظہر ۳۰ مارچ کو شہید ہونے والوں کو خراج عقیدت پیش کیا جائے گا۔اس سلسلے میں شہر کے مسلمان معززین کا ایک وفد سوامی جی سے مل کر اس جلسے میں شرکت کرنے اور سامعین

سے خطاب کرنے کی درخواست کی۔ سوامی جی نے قبول کرلیا۔ جامع مسجد تشریف لے گئے اور مسجد کے صحن میں کمبّر کے چبوترے پر کھڑے ہوکر لوگوں سے خطاب کیا۔ جامع مسجد دہلی میں بھگوا کپڑے میں ملبوس کسی غیر مسلم سنیاسی کا خطاب کرنا لوگوں کے لئے مسرت آگئیں بھی تھا اور حیرت انگیز بھی۔ اس سے قبل جامع مسجد میں ایسا واقعہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ تقریر کے بعد مسلمانوں کے ایک طبقہ نے سوامی شردھانند کے مسجد کے داخلے اور تقریر پر ردّ عمل کا اظہار کرتے ہوئے اسے مسجد کے بے حرمتی اور اسلامی شریعت کے خلاف گردانا۔ کسی نے اسے فتنہ اور کسی نے بدعت سے تعبیر کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد اُس وقت رانچی میں نظر بند تھے۔ اُنہیں جب یہ معلوم ہوا کہ مسلمان جامع مسجد میں سوامی شردھانند کے داخلے اور تقریر کرنے پر اعتراض کررہے ہیں اور اسے شریعت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ مولانا نے مسلمانوں کے ذہن میں پنپنے والی اس غلط فہمی کے سدّ باب کے لیے ایک مضمون لکھنے کا فیصلہ کیا۔ واضح ہو کہ رانچی کے جامع مسجد میں جمعہ کے خطبوں کا جو سلسلہ مولانا نے شروع کیا تھا اُسے سننے کے لئے شہر کے غیر مسلم دانشور بھی آنا چاہتے تھے۔ جیسا کہ مولانا نے لکھا ہے:۔

''میں جب رانچی میں نیا نیا آیا اور جامع مسجد میں جمعہ کے خطبوں کا سلسلہ شروع ہوا تو شہر کے بہت سے تعلیم یافتہ ہندوؤں اور وکلا وغیرہ کو تقریر سننے کا شوق ہوا۔ انہوں نے کہلایا کہ کوئی ایسی صورت اختیار کیجئے کہ ہم بھی تقریر سن سکیں۔ میں نے جواب دیا کہ'' نظر بندی کی قیود کی وجہ سے عام مجالس کا انعقاد آپ لوگوں کے لئے موجب مشکلات ہوگا۔ اگر شوق ہے تو مسجد میں کیوں نہیں آتے؟ اس پر ان لوگوں کو تعجب ہوا کہ مسجد میں عین جمعہ کے موقعے پر ہم لوگ کیوں کر جا سکتے ہیں؟ لیکن میں نے عین جمعہ کے دن ان کے مسجد میں آنے اور ایک مناسب مقام سے خطبہ سننے کا انتظام کردیا۔ اس کے بعد''

انجمن اسلامی'' قائم ہوئی اور اس کی تمام مجالس بھی مسجد ہی میں منعقد ہوتی
رہیں۔ ان میں بھی تمام ہندو شریک ہوتے رہے۔ صرف اتنی سی بات سے جو
نتائج حسنہ پیدا ہوئے وہ شاید برسوں کے وعظ و تبلیغ اور آج کل کے مجادلانہ
مناظرات و مباحث سے بھی پیدا نہ ہوتے اور ان کا اندازہ ابھی باہر کے لوگ
نہیں کر سکتے، جب تک ایک بڑی طولانی سرگذشت نہ سنائی جائے۔[۳۲]

یہاں بھی لوگوں نے اعتراض کیا تھا کہ شریعت غیر مسلموں کو مسجد میں آنے کی اجازت نہیں دیتی۔ بہر حال سوامی شردھانند کا مسجد میں تشریف لے جانے اور خطاب کرنے پر اپریل ۱۹۱۹ کے اوائل میں مسلمانوں کا جو ردِّ عمل ہوا اس کے جواب میں مولانا نے مضمون لکھنا شروع کر دیا جو ۲۴ رجب ۱۳۳۷ھ مطابق ۲۵ اپریل ۱۹۱۹ء کو اختتام پذیر ہوا۔ چونکہ مولانا رانچی میں نظر بند تھے اور خط و کتابت کرنے کے لئے سرکاری حکام سے اجازت لازمی تھی۔ لہذا اجازت ملنے میں تقریباً بیس دن سے زیادہ کا وقت لگ گیا ۲۱ مئی کو مولانا نے مذکورہ مضمون مع ایک خط مولانا سید سلیمان ندوی کو ارسال کیا۔ تاکہ ''معارف'' اعظم گڑھ میں شائع ہو سکے۔ پورے خط کا متن اس طرح ہے:۔

رانچی (بہار)، ۲۱ مئی ۱۹۱۹ء

صدیقی العزیز السلام علیکم

آج بعض مسائل کی نسبت سخت گمراہی پھیل رہی ہے اور اگر اس کا سد باب نہ ہوا تو ایک نہایت مفید دروازہ کھل کر بند ہو جائے گا۔ اس کے متعلق میں نے ایک مختصر تحریر اخبارات میں شائع کرانی چاہی تھی، لیکن لکھنا شروع کیا تو بہت بڑھ گئی اور اب اخبارات کے لئے حد تحمل و اندراج سے باہر ہو گئی ہے۔ مجبوراً آپ کو بھیجتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ حتی الواسع جلد اور بہ عنوان مناسب اس کی اشاعت کا انتظام ہو جائے گا۔

صورتیں اس کی دو ہیں؛

ایک یہ کہ ''معارف'' میں نکل جائے، اگر آپ پسند کریں، لیکن اس میں مشکل یہ ہے کہ اس ماہ کا نمبر عنقریب شائع ہونے والا ہوگا۔ اس میں گنجائش نہ ہوگی اور آئندہ ماہ پر رکھا جائے تو بہت زیادہ تاخیر ہو جائے گی اور مقصود بہ وجوہ و مصالح تعجیل ہے، بلکہ جتنی دیر باوجود تکمیل تحریر بھیجنے میں بہ وجہ قیود لاحقہ ہو گئی، اس کو بھی نہ ہونا تھا۔ پس اگر اس ماہ کے نمبر میں اس کا اندراج ممکن ہو، اولاً نصف اول تو اس کی کوشش کیجئے۔ نصف ثانی آئندہ نمبر میں نکل جائے گا۔

اگر اس کا موقع باقی نہیں رہا ہے تو پھر ایک صورت اور ہے، یعنی اس تحریر کو نسبۃً خفی قلم اور زیادتی سطور و مسطر کے ساتھ لکھوا چھپوا کر بہ صورتِ ضمیمہ زائد کے اسی نمبر کے ساتھ نکال دیا جائے اور چند دنوں کے لئے اس نمبر کی اشاعت ملتوی رہے۔

اس صورت میں ''معارف'' کے زائد اوراق اور علاحدہ رسالے کے لیے، غرض یہ کہ جس قدر یہ ٹکڑا چھپے، اس کی اجرت و خرچ میرے ذمے ہے، کیوں کہ ''معارف'' پر اس کی معین ضخامت سے زیادہ بوجھ نہیں پڑنا چاہئے اور ہر حال مجھ میں کو چھپوانا ہی ہے۔ رقم مطلوب سے آپ مجھے مطلع کریں تا کہ بھیج دی جائے۔ اگر ایسا ہوا تو موجبِ کمال تشکر ہوگا۔

لیکن اگر یہ دونوں صورتیں ممکن العمل نہ ہوں تو پھر از راہ عنایت جہاں تک جلد ممکن ہو، اس کو بہ صورت رسالہ چھپوا دینے کا انتظام فرما دیجئے۔ پانچ سو نسخے کافی ہوں گے۔ مطبع ''معارف'' میں چھپے اور اگر کسی وجہ سے دقت ہو تو لکھنؤ یا کان پور میں چھپوا دیجئے۔ اعظم گڑھ میں چھپتا تو تصحیح کی طرف آپ کی

موجودگی اطمینان دلاتی، کیوں کہ جو مسودہ بھیج رہا ہوں اس میں کاٹ چھانٹ جا بجا ہے۔ اس صورت میں بھی فوراً اجرت طباعت سے مطلع کیجئے تا کہ روپیہ بھیج دیا جائے۔

مقصود اصلی اشاعت اور جلد اشاعت ہے۔ اگر الگ چھپے تو تقطیع ''معارف'' سے چھوٹی رکھی جائے، یعنی ''مخزن'' کی تقطیع۔ کاغذ معمولی ہونا چاہیے اور خط زیادہ جلی نہ ہو۔

ایک اور ضروری بات ہے، ابتدا میں چوں کہ خیال نہ تھا کہ تحریر بڑھ جائے گی اس لیے بلا فصل و عنوانات محض نمبروں کی ترتیب سے لکھنا شروع کیا گیا، لیکن اب دیکھتا ہوں تو تحریر بہت بڑھ گئی اور بیچ میں کہیں موڑ نہیں، پڑھنے والے اکتا جائیں گے پس اب عنوانات کا قایم کرنا تو خالی از اشکال نہیں، البتہ جب کاتب لکھنا شروع کرے تو اتنی ہدایت کر دی جائے کہ تحریر میں جہاں جہاں سے نیا نمبر شروع ہوتا ہے، وہاں بین السطور وسط میں صرف لفظ ''فصل'' جلی قلم سے لکھ دیا جائے اور نمبروں کو نکال دیا جائے۔ مسودے ہی میں ایسا بنا دیا جائے۔ اس طرح کل بائیس جگہ لفظ فصل آئے گا۔ کیوں کہ کل بائیس نمبر ہیں۔

امید ہے کہ اس بارے میں پوری توجہ کام میں لائیں گے۔

ابوالکلام ؔ

یہ مضمون ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ میں مئی 1919ء اور جون 1919ء کے دو شمارے میں شائع ہوا جس کا عنوان تھا ''مساجد اور غیر مسلم''۔ پہلی قسط 26 صفحات میں شائع ہوئی جب کہ دوسری قسط 36 صفحوں پر مشتمل تھی۔ اس طرح پورا مضمون 58 صفحات پر پھیل گیا۔ مولانا آزاد نے 21 مئی کے خط میں یہ بھی خواہش ظاہر کی تھی کہ ''معارف'' میں

مضمون کی اشاعت کے علاوہ تین سو کاپیاں الگ بھی معمولی کاغذ پر چھپوا لیا جائے اور علحیدہ ٹائیٹل اس پر لگا دیا جائے گا لیکن موضوع کی اہمیت افادیت اور معنویت کے پیش نظر سید سلیمان ندوی نے اس کی پانچ سو کاپیاں الگ سے شائع کرا دیں۔ مولانا بہت خوش ہوئے اور اظہار تشکر پیش کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی کو لکھا:۔

''یہ تو اپنے کامل معنوں میں کشف ہے۔ خود مجھے خیال ہوا تھا کہ تین سو کی تعداد کافی نہیں، زیادہ ہو، لیکن اس لیے نہیں لکھا کہ شاید کتابت رسالہ معارف ورسالہ کی ایک ہی رکھی گئی ہو اور مئی نمبر کا حصہ بہ شکل رسالہ بھی چھپ چکا ہو۔ بہر حال یہ خوب کیا کہ تعداد پان سو کر دی۔ علاوہ عبارت ہدایہ کے معمولی غلطیاں کتابت کی بھی تھیں۔ امید ہے کہ درست ہوگئی ہوں گی۔ ۵

رسالے کے نام کے سلسلے میں بھی مولانا نے سید سلیمان ندوی کو اختیار دے دیا کہ وہ جو پسند کریں وہی نام رکھیں۔ چنانچہ مئی 1919 کے اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

''......واقعی بہ شکل رسالہ کوئی دوسرا نام ہونا چاہیے۔ آپ ہی کوئی تجویز کر کے رکھ دیں۔ آپ نے جو نام لکھا ہے اس کا تجع ثانی بہت خوب ہے، یہی ہونا چاہیے۔ مگر ردالجامدین مانعین ومخالفین پر چوٹ پائی جاتی ہے اور نسبت جمود، اس لیے رسالہ حدود مناظرہ وجدول میں داخل ہو جائے گا اور یہ مقصود نہیں۔ پس اس کو کسی دوسرے قافیے سے بدل دیجیے۔ مثلاً ''الشاہد'' یا ''الفوائد'' یا ''جامع الشواہد'' آخری نام بہت پامال ہو چکا ہے۔ حتی کہ ''جامع الشواہد فی اخراج الوہابین عن المساجد'' تک موجود ہے۔ یہ خوب ہوگا کہ وہاں اخراج وہابین تک کی کوشش اور یہاں دخول مشرکین تک کی توسیع۔

فنحن بوادو العذول بواد

بہ ہر حال کوئی اور قافیہ تجویز کریں اور وہی لوح پر درج ہو۔ ۶

رسالے کے نام ''جامع الشواہد دخول غیر المسلم فی المساجد'' طے پایا اور اسی کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ مولانا کے ایک خط سے اس کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ اس رسالے کی اشاعت کے اخراجات کی ذمہ داری انجمن اسلامیہ نے لی تھی جیسا کہ ان کے ایک خط بنام سید سلیمان ندوی سے پتہ چلتا ہے۔

''صدیق العزیز! السلام علیکم

.... آج باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ جامع الشواہد کا خرچۂ طبع اب تک انجمن سے نہیں گیا۔ گویا معاملہ آپ سے متعلق نہیں۔ لیکن اس تاخیر کے لیے اپنا افسوس اور لاعلمی ظاہر کرتا ہوں۔ ان سے کہہ دیا ہے کہ فوراً بھیج دیں۔ ۷

یہی وجہ ہے کہ ''جامع الشواہد'' کی تمام کاپیاں جب شائع ہو کر رانچی پہنچیں تو مولانا نے کتاب کا صرف ایک نسخہ اپنے پاس رکھ کر ساری کتابیں انجمن کے حوالے کر دیں۔ ابوسلمان شاہجہاں پوری لکھتے ہیں:۔

''رسالے کی اشاعت کے اخراجات چوں کہ انجمن اسلامیہ، رانچی کی جانب سے ادا کیے جانے تھے، اس لیے مولانا نے ایک نسخے کے سوا تمام نسخے انجمن کے حوالے کر دیے تھے۔ جو نسخہ مولانا نے اپنے پاس رکھ لیا تھا، اسی کو نظر ثانی کے بعد دوسرے ایڈیشن کے لیے مسودہ بنا دیا تھا۔ آج ہمارے لیے اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ مولانا نے یہ ترمیم و اصلاح کب کی تھی۔ 1919ء میں اولین اشاعت کے فوراً بعد، یا 1927ء میں، جب اس کی دوسری اشاعت کا فیصلہ کیا تھا اگر چہ یہ اشاعت مولانا کی زندگی میں کبھی منصۂ شہود پر نہیں آ سکی۔ ۸

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری کا یہ دعویٰ کہ اگر چہ اشاعت مولانا کی زندگی میں کبھی منصۂ شہود پر نہیں آ سکی۔ صحیح نہیں لگتا۔ میری باتوں کو تقویت اس لیے ملتی ہے کہ ''الہلال'' کے

10 جون 1917ء کے شمارے میں ص 19 پر یہ اشتہار درج ہے۔

جامع الشواہد

طبع ثانی

مولانا ابوالکلام صاحب کی یہ تحریر ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئی تھی جب وہ رانچی میں نظر بند تھے۔ موضوع اس تحریر کا یہ تھا کہ اسلامی احکام کی رو سے مسجد کن کن اغراض کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے؟ اور اسلام کی رواداری نے کس طرح اپنی عبادت گاہوں کا دروازہ بلا امتیاز مذہب وملت تمام نوع انسانی پر کھول دیا ہے؟

۱۹ء میں جس قدر نسخے چھپے تھے، مدرسہ اسلامیہ رانچی کو دے دیئے گئے تھے جو بہت جلد ختم ہو گئے۔ اب مصنف کی نظر ثانی کے بعد دوبارہ لیتھو میں چھپی ہے۔ (قیمت بارہ آنے (۲۱)

منیجر الہلال کلکتہ

الہلال کے ۱۰ جون ۱۹۲۷ (صفحہ ۱۹) ۲۴ جون (صفحہ ۲۷) یکم جولائی (صفحہ ۱۴) ۱۵ جولائی (صفحہ ۱۸) ۲۹ جولائی (صفحہ ۱۸) ۵ اگست (صفحہ ۱۹) ۱۲ اگست (صفحہ ۱۷) ۲۶ اگست (صفحہ ۱۵) ۲ ستمبر (صفحہ ۲۴) و ستمبر (صفحہ ۲۴) ۱۶ ستمبر (صفحہ ۲۴) ۳ ستمبر (صفحہ ۲۱) ۷ اکتوبر (صفحہ ۲۱) ۱۱۴ کتوبر (صفحہ ۲۲) ۱۲۱ کتوبر (صفحہ ۲۴) ۱۲۸ کتوبر (صفحہ ۲۴) ۴ نومبر (صفحہ ۲۴) ۱۱ نومبر (صفحہ ۲۴) ۱۸ نومبر (صفحہ ۲۴) ۲ دسمبر (صفحہ ۲۴) اور آخری شمارہ ۹ دسمبر (صفحہ ۲۱) کے شمارے میں یہ اشتہار شائع ہوا ہے۔ صرف ۲۲ جولائی، ۱۹ اگست اور ۹ ستمبر یعنی تین شمارے میں مذکورہ اشتہار نہیں ہے جبکہ ۲۱ شمارے میں یہ اشتہار'' اب مصنف کی نظر ثانی کے بعد دوبارہ لیتھو میں چھپی ہے۔'' شائع ہوا۔ قیمت بھی بارہ آنہ بتائی گئی ہے۔ لہذا یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ'' مولانا کی زندگی میں کبھی منصۂ شہود پر نہیں آسکی۔ ظاہر ہے کہ مولانا کی نظر مختلف شماروں کے مذکورہ اشتہار پر ضرور پڑی ہوگی۔ مولانا

اتنی بڑی غلط بیانی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا کی زندگی میں اس کا دوسرا ایڈیشن ضرور شائع ہوا ہوگا۔ اور اصلاح شدہ نسخہ ان کے کتب خانے میں محفوظ رہ گیا ہوگا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری یوں رقم طراز ہیں:۔

''مولانا کا یہ اصلاح شدہ نسخہ ان کے کتب خانے میں تھا۔ جب انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز، نئی دلی کے کتب خانے کا قیام عمل میں آیا تو مولانا کے ذخیرہ کتب کے ساتھ یہ نسخہ بھی کونسل کی لائبریری میں آ گیا۔ سب سے پہلے مولانا کے پرائیویٹ سکریٹری محمد اجمل خان مرحوم کو اس کا علم ہوا۔ اس کے بعد ڈاکٹر عابد رضا بیدار کو اس وقت اس کا پتا چلا، جب مولانا کا ذخیرہ، کتب کونسل کی لائبریری میں منتقل ہوا تھا اجمل خان مرحوم کو بھی شاید ۱۹۶۰ میں اس رسالے کا علم ہوا تھا، اس لئے کہ مولانا آزاد کے اصلاح شدہ نسخے پر انہوں نے ''مصحح'' مولانا آزاد مرحوم کے جملے کے ساتھ ''۱۰ مئی ۱۹۶۰'' تاریخ ڈالی ہے۔ خاکسار کو ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے ذریعے اس نسخے کا علم اگست ۱۹۶۲ میں ہو گیا تھا۔ جب کونسل کا دفتر پٹودی ہاؤس میں تھا اور ڈاکٹر صاحب مولانا آزاد کا ذخیرہ۔ کتب ترتیب دے رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تالیف ''مولانا ابوالکلام آزاد'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔ بعد میں یہ بات سب کو معلوم ہو گئی۔ ۹

میرے پیش نظر ''جامع الشواہد'' فی دخول غیر المسلم فی المساجد'' کی وہ کاپی ہے جس کی تقدیم و تدوین ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری نے کی ہے۔ جس کو مولانا ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کراچی پاکستان نے ۱۹۹۶ میں شائع کیا اور اس کتاب کو ڈاکٹر سلمان شاہجہاں پوری تیسرا ایڈیشن تسلیم کرتے ہیں۔ مذکورہ کتاب کا دوسرا تصحیح و نظر ثانی شدہ ایڈیشن وہ مسیح الحسن کے مرتبہ ایڈیشن کو تسلیم کرتے ہیں جس کا سن اشاعت ۱۹۹۳ء ہے۔ اپنی مذکورہ کتاب کا انتساب

بھی مسیح الحسن کے نام کیا ہے۔جس میں عقیدت کا پرتو بھی ہے اور کشادہ ذہنی کا ثبوت بھی فراہم کرتے ہیں ۔اس کے علاوہ کئی اور ایڈیشن کا ذکر کرتے ہیں جو ان کی نگاہ میں ایڈیشن نہیں نقلیں (ری پرنٹ) تھیں ۔ بہر حال ابوسلمان شاہ جہاں پوری کی تقدیم بہ عنوان '' جامع الشواہد فی دخول غیر مسلم فی المساجد چند خیالات '' کافی اہمیت کا حامل ہے جو ۲۵ صفحات پر پھیلا ہوا ہے ۔ یہ مضمون دراصل '' جامع الشواہد '' کی کلیت ہے ۔اس کے مطالعے سے جامع الشواہد کے تفہیم بہت آسان ہوجاتی ہے ۔ ابوسلمان شاہجہاں پوری نے اس تقدیم '' میں تحریک خلافت کی مذہبی حیثیت، ہندو اور مسلمان کی باہمی اشتراک کی ضرورت پر مختصر گفتگو کے بعد '' جامع الشواہد '' کی تالیف کے پس منظر، سوامی شردھا نند کا دہلی کی جامع مسجد میں تقریر کرنا اور اس سلسلے میں کوتاہ ذہن لوگوں کا جامع مسجد کی بے حرمتی سے تعبیر کرنا سبھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ جامع مسجد دہلی کو کئی بار انگریزوں نے اپنے لشکر کی فرد گاہ بنایا۔ابوسلمان شاہجہاں پوری نے مولوی ذکاؤ اللہ دہلوی مرحوم کی تحریر کے حوالے سے مسلمانوں کو یہ یاد دلایا ہے کہ ۱۸۵۷ کے غدر کے بعد انگریزوں نے مسجدوں کے تقدس اور حرمت کی پامالی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی ۔ مولانا آزاد نے مسلمانوں کو غیرت دلاتے ہوئے اس بات کی تلقین کی ہے کہ ابھی ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت ہے کہ تاکہ برطانوی استعماریت کو شکست دی جاسکے ۔ آگے چل کر دہلی میں ستیا گرہ کے موقع پر ہونے والے فسادات کا ذکر کیا ہے اور پھر سوامی شردھانند کے داخلے اور تقریر کے خلاف کوتاہ ذہن مسلمانوں کا واویلا مچانے پر مولانا ابوالکلام آزاد کا جو ردعمل ہوا جس کے نتیجے میں انہوں نے مضمون لکھا۔اس کا اجمالی بیان ہے ۔ معارف میں اشاعت کیلئے بھیجنا، سید سلیمان ندوی کو خطوط ارسال کرتے، مضمون کو رسالے کی شکل میں پرنٹ کرانے ۔ رسالے کا عنوان متعین کرنے کے سلسلے میں جو بھی خط و کتابت ہوئی ہے،ان کی نقل ابوسلمان شاہجہاں پوری نے کتاب کے اختتام پر دے دی ہے ۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری کی تحویل میں '' جامع الشواہد '' کا وہ اصلاح شدہ نسخہ تھا جو

بقول ان کے دوسرے ایڈیشن کے لئے مولانا نے تیار کرایا تھا۔ ابوسلمان شاہجہاں پوری کو اس نسخہ کا علم ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے ذریعہ ہوا۔ اس کی پوری تفصیل ابوسلمان شاہجہاں پوری نے بیان کیا ہے۔ مولانا آزاد نے دوسرے ایڈیشن کے لئے جو مسودہ تیار کیا تھا۔ اس میں اوائل کے مقابلے میں بہت سے اصلاحات، ترمیم وحذف کئے تھے۔ ابوسلمان شاہجہاں پوری نے بہت عرق ریزی سے اس کا گوشوارہ ترتیب دی ہے۔ املاء کی ساخت، لہجے، اعراب، امالہ اور دیگر اصلاحات کے لے رسالہ کی اشاعت کے وقت نمبروں کے بجائے لفظ ''فصل'' کا جو اضافہ کیا گیا تھا سبھوں کی تفصیل مستند طریقے سے بیان کی گئی ہے۔ ۱۹۲۷ میں ''الہلال'' کے مختلف شماروں میں دیے گئے اشتہار سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ'' جامع الشواہد'' کا دوسرا ایڈیشن ''مصنف کی نظر ثانی کے بعد دوبارہ لیتھو میں چھپی ہے'' اور قیمت بارہ آنہ بتائی گئی ہے لیکن ابوسلمان شاہجہاں پوری کو شاید اس کا علم نہ رہا ہو یہی وجہ ہے کہ اپنی'' تقدیم'' میں صفحہ ۴۵ پر دوسرا ایڈیشن نہ شائع ہونے کا جواز اس طرح پیش کرتے ہیں:۔

> ایک غور طلب مسئلہ یہ رہ گیا کہ مولانا نے جامع الشواہد کی کتابت کرا لینے کے باوجود اسے شائع کیوں نہیں کیا؟ باون صفحے کے رسالے کی اشاعت کوئی مسئلہ نہ تھا۔ مولانا اس پر نظر ثانی کر چکے تھے، کتابت ہو چکی تھی، پریس اپنا تھا، کام میں کوئی پیچیدگی اور کوئی وقت طلب مسئلہ نہ تھا۔ جہاں ہر ہفتہ ایک شان دار میگزین (الہلال) چھپتا ہو، وہاں دو ریم کاغذ کی چھپائی، جس میں پان سو سے زیادہ رسالہ تیار ہو سکتا تھا، کوئی مسئلہ نہ تھا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ پہلی اشاعت (۱۹۱۹) کے بعد ۱۹۲۷ء سے پہلے یا ۱۹۲۷ء کے بعد مولانا کے خطوط میں یا کسی اور تحریر و بیان میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ ذکر آزاد از مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی میں دو جگہ اس کا نام آیا ہے۔ ایک تو ۱۸ برس کی عمر کے بعد کی تصنیفات میں اس کا نام آیا ہے۔ یا ۱۸ اگست ۱۹۲۷ء کے مولانا ملیح آبادی

کے نام ایک خط میں اس کے لئے بہ قدر ایک سطر کے مضمون آیا ہے۔ جس میں کہا گیا ہے اگر منشی عباس علی فارغ ہوں تو انہیں جامع الشواہد کی بقیہ کا پیاں لکھنے کے لیے دے دی جائیں۔ اس سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ مولانا کے نزدیک اس کام کی کوئی اہمیت تھی اور وہ اس کی اشاعت کے لئے بے چین تھے۔[۱۰]

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری نے ۱۸ اگست ۱۹۲۷ کے ایک خط کا ذکر کیا ہے جو مولانا آزاد نے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کو لکھا ہے۔ جب کہ "الہلال" کے ۱۰ جون ۱۹۲۷ کے شمارے سے متواتر یہ اشتہار شائع ہوا ہے کہ رسالے کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔ لہذا ابوسلمان شاہجہاں پوری کا یہ دعویٰ کہ جامع الشواہد کا کوئی ایڈیشن ۱۹۱۹ کے بعد ۱۹۹۳ تک دوبارہ شائع نہیں ہوا۔ صحیح نہیں لگتا۔ بعد میں ڈاکٹر شاہجہاں پوری کو اس کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کا علم ہوا تو انہوں نے ضمیمہ 1 کے تحت صفحہ 163 پر "الہلال" کا اشتہار شائع کر دیا

مولانا آزاد کی تصنیف "جامع الشواہد" کے مذکورہ ایڈیشن جس کی تقدیم و تدوین ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری نے کی ہے، میں تمہید کے علاوہ چودہ فصول پر مختص ہے۔ ہر فصل کے لئے ایک عنوان بھی منتخب کیا گیا ہے۔ مختصر "تمہید" کے ضمن میں مولانا آزاد نے سوامی شردھانند کے ذریعہ جامع مسجد میں کی جانے والی تقریر پر ہونے والے اعتراض کا جواب نہایت ہی مدلل اور منطقیانہ طور پر دیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اس طرز عمل کو اسلامی نقطۂ نگاہ سے کسی بھی طرح سے قابل اعتراض نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اگر مسجد میں منبر کے چبوترے پر کھڑے ہو کر مسلمانوں کی اجازت سے سوامی شردھانند نے تقریر کی تو اس میں کوئی شرعاً قباحت نہیں۔ غیر مسلموں کے داخل ہونے کا جہاں تک معاملہ ہے، اس سلسلے میں مضمون کے اختتام پر لکھتے ہیں:۔

"رہا اصل مسئلہ یعنی غیر مسلموں کا مسجد میں داخل ہونا، تو معترضین کو معلوم ہونا چاہئے کہ نہ صرف داخل ہونا جائز ہی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ اگر مصلح

مقتضی ہوں تو انہیں مسجدوں میں بہ طور مہمان کے ٹھیرایا بھی جاسکتا ہے اور
مسلمانوں کا جو امام یا مسلمانوں کی جو جماعت مصالح کی رعایت کے ساتھ
ایسا کرتی ہے وہ ٹھیک ٹھیک اس اسوہ حسنہ کی پیروی کرتی ہے جو صاحب
شریعت صلعم نے امت کو دکھایا ہے۔''[11]

فصل اول کا عنوان ''مسجد نبوی میں غیر مسلموں کا داخل ہونا'' ہے۔اس عنوان کے تحت مولانا آزاد نے تاریخی اعتبار سے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی اکثر مجالس اور صحبتیں مسجد نبوی میں ہی منعقد ہوتی تھیں غیر مسلم ان صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔آپ کے بعض یہودی قرض داروں نے مسجدوں میں آکر تقاضا کیا ہے اور آپ نے اپنے حلم اور خلق کی وجہ سے ان کا حق طلب و تقاضا تسلیم کیا ہے۔مولانا لکھتے ہیں:۔

''غیر مسلم اقوام سے پولیٹیکل علائق، سفر کا ایاب و ذہاب، معاہدہ و مواثیق کی
مجالس شوریٰ، عرائض وشکایات مسلمین وغیر مسلمین، یہود مدینہ اور مشرکین
اطراف وجوانب سے پولیٹیکل تعلقات کی گفت وشنید یہ اور اسی طرح کے
تمام معاملات مسجد نبوی میں طے پاتے تھے۔خود مسلمانوں کو آپ نے مسجد
کے متعلق متعدد معاملات میں تنبیہ فرمائی اور انہی سے احکام احترام وآداب
مسجد مستنبط ہوئے۔مثلاً؛ تیز بو کی چیز کھا کر مسجد میں آنا، گم شدہ آدمی یا حیوان
کو پکارنا یا خرید وفروخت کرنا۔''[12]

تاریخی واقعات کی روشنی میں یہ بھی ثابت کیا ہے کہ مسلمان نہ ہونے کی بنا پر کسی غیر مسلم کو مسجد میں داخل ہونے سے کبھی نہیں روکا گیا۔خلیفہ دوم تک جس قدر غیر مسلم اقوام وقبائل کے وفد آتے تھے وہ یا تو مسجد میں ٹھہرائے جاتے تھے یا شہر کے مسلمانوں کے یہاں۔تاریخ اسلام میں سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے سرکاری مہمان سرا بنائی تو لوگ یہاں ٹھہرنے لگے۔

فصل دوم ''واقعہ، وفد بحران'' عنوان کے تحت اس واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس

کا ذکر صحاح وسیرت میں بھی موجود ہے اور جس کی نسبت سورہ آلِ عمران کی آیات مبارکہ نازل ہوئی۔ بخران جو یمن میں واقع ہے اور وہاں عیسائیوں کی آبادی تھی۔ جب اسلام کی دعوت وہاں پہنچی تو آمدورفت کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور دوسری مرتبہ جو وفد مدینہ پہنچا تو اتوار کا دن تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ وہ لوگ مسجد نبوی میں پہنچ کر پہلے اپنی نماز ادا کرنی چاہی۔ بعض مسلمانوں کو ان لوگوں کی تجویز ناگوار گذری اور انہیں روکنا چاہا لیکن آنحضرت ﷺ نے روکنے سے منع فرماتے ہوئے کہا کہ نماز پڑھنے دو۔ چنانچہ وفد کے تمام عیسائیوں نے جن کی تعداد ساٹھ تھی پورب کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ مولانا نے اس سلسلے میں علامہ ابن قیم کی کتاب ''زادالمعاد'' سے اقتباس نقل کرتے ہوئے یہ مغز اُبھارا ہے کہ غیر مسلم مسجد میں بلائے جا سکتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے اُنہیں مسجد میں داخل ہونے سے نہیں روکا۔ دوسرے یہ کہ غیر مسلم مسلمانوں کی مسجد میں اپنے طریق پر اللہ کی عبادت کر سکتا ہے بشرطیکہ کوئی فعل بت پرستی کا نہ ہو اور کسی طرح کی فساد کا اندیشہ نہ ہو، تیسرے یہ کہ ساٹھ آدمیوں کی جماعت نے اپنے طریق پر نماز ادا کی ہوگی یعنی مسیحی نماز کے تین رکن ہیں تلاوت، سجدہ، دعاء لہذا یہ معاملہ اپنی نمایاں اور ممتاز شکل میں بھی احترام مسجد کے خلاف نہ تھا ورنہ آپ ضرور روکتے۔ مولانا نے اس سلسلے میں حافظ ابن قیم کے فقہ پر بحث کا بھی حوالہ دیا ہے جو اس واقعہ کے متعلق ہے۔ مضمون کے آخر میں مسلمانوں کو عبرت دلانے کی سعیٔ مستحسن کی ہے کہ چند جزوی اختلاف کی بنا پر خود مسلمانوں کو مسجد میں آنے سے روکا جاتا ہے اور اس کے لئے مقدمہ بازیاں تک ہوتی ہیں۔

فصل سوم کا عنوان ''واقعۂ وفد ثقیف'' ہے جس کے تحت مولانا نے اسلامی تاریخ کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں کی مسجد میں نہ صرف اہل کتاب کو ٹھہرنے کی اجازت ہے بلکہ مشرکین بھی ٹھہرائے جا سکتے ہیں۔ اپنی باتوں کو تقویت بخشنے کے لئے قبیلہ ثقیف کے وفد کا ذکر کرتے ہیں جو فتح مکہ کے بعد آیا تو آنحضرت صلعم نے اُن کے قیام کے لئے ایک خیمہ مسجد نبوی میں نصب کرا دیا۔ اس سلسلے میں مولانا نے طبرانی، ابوداؤد اور حافظ عسقلانی سے مروی

روایات کا بھی حوالہ دیا ہے۔ یہ وفد رمضان کے مہینے میں آیا تھا۔ مغیرہ بن شعبہ نے درخواست کی تھی کہ ٹھہرانے اور خدمت کرنے کا موقع اُنہیں دیا جائے ۔ آنحضرت صلعم نے اُن کی درخواست پر فرمایا تھا کہ میں اُن کی خدمت سے تمہیں نہیں روکتا لیکن ایسی جگہ ٹھہراؤ جہاں سے یہ لوگ قرآن سن سکیں۔ آگے چل کر مولانا نے مذکورہ واقعہ کی روشنی میں کئی نکات اُبھارے ہیں مثلاً مسجد میں ٹھہرانا کسی مجبوری و غدر کی بنا پر نہیں تھا بلکہ قصداً ٹھہرایا گیا کہ یہ لوگ قرآن پاک سن سکیں۔ دوسرے یہ کہ مذکورہ واقعہ فتح مکہ کے بعد ۹ ہجری میں پیش آیا تھا جو مسلمانوں کے لئے غلبہ اور شان و شوکت کا زمانہ تھا۔ لہٰذا وفد کی حیثیت مفتوح کی تھی اور ان کا رویہ عاجزانہ تھا۔ یہ تمام لوگ مشرک تھے۔ مسجد نبوی میں قیام۔ کلام الٰہی کی سماعت و جماعت، صلواۃ کے نظارے اور آنحضرت صلعم کے خلق عظیم اور اُن کی محبت سے اس قدر مسخر ہوئے کہ اسلام کی صداقت کا اعتراف کرتے ہوئے مشرف بہ اسلام ہونے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ ابھی تک چونکہ بت پرستی اور جاہلیت کا کانٹا دل سے نہیں نکلا تھا لہٰذا انہوں نے کچھ شرائط منوانی چاہی مثلاً نماز سے چھوٹ، زنا، سود، شراب پینے کی اجازت وغیرہ شامل تھا لیکن تمام شرائط کو رد کر دیا گیا۔ آخر میں ان لوگوں نے یہ درخواست کی کہ اپنی دیبی (جس کی وہ پوجا کرتے تھے) اس کو اپنے ہاتھ سے نہیں ڈھا سکتے۔ یہ بات آنحضرت صلعم نے منظور کر لی اور خالد بن ولیدؓ کو چند صحابہ کے ساتھ بھیجا کہ طائف کی دیبی کو منہدم کر دیں۔ لہٰذا خالد بن ولید نے جا کر مندر کی زمین تک کھود ڈالی۔ اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد مولانا لکھتے ہیں:۔

> '' ان واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ سخت شرک پرست اور اسلام کی عداوت میں کس درجے سخت تھے۔ بایں ہمہ آں حضرت ﷺ نے مسجد میں ٹھہرایا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جس قلعہ۔ طائف کو مسلمانوں کی منجنیق چالیس دن تک سنگ باری کر کے بھی فتح نہ کر سکی۔ اس کے بسنے والوں کے دلوں کو آں حضرت ﷺ کے خلقِ عظیم۔ اسلام کی رواداری مسجد کے قیام اور

اسلامی عبادت کے نظارے نے چند گھنٹوں کے اندر فتح کرلیا۔ لوہے کی تلوار
کو سپر پر روکا جاسکتا ہے، لیکن محبت کی تلوار کے لئے کوئی سپر نہیں۔'' [۱۴۳]

اس سلسلے میں مولانا نے حضرت عائشہؓ سے مروی ایک روایت بھی نقل کی ہے جس میں حضرت عائشہؓ کے پوچھنے پر کہ جنگ اُحد والے دن سے بھی بڑھ کر کوئی شدت اور مصیبت کا دن آپ پر آیا تھا؟ آپ نے فرمایا۔'' ہاں وہ دن جب میں طائف گیا اور اعانت وقبول حق کی امید سے اپنی دعوت ابن عبد یالیل کے سامنے پیش کی اور اُس نے میری کچھ پرواہ نہ کی۔ وہ دن احد کے دن سے بھی میرے جیسے سخت تھا۔'' لیکن باوجود تمام شداید کے آپ نے فرمایا تھا'' اس پر بھی میں اُن لوگوں کے لئے بددعا نہیں کروں گا۔، میں نے صدائے حق کا بیج ڈال دیا ہے۔ آج نہیں تو کل پھل لائے گا۔'' چنانچہ یہی ہوا۔ مولانا لکھتے ہیں:۔

'' جن لوگوں نے پتھر پھینکے تھے خود دوڑے دوڑے آئے کہ حق کے بے پناہ
تیروں سے اپنے دلوں کو دونیم کردیں۔ یہ تیر ان دشمنوں پر کہاں چلائے گئے،
میدان جنگ میں نہیں خدا کی مقدس عبادت گاہ کے صحن ہیں۔ [۱۴۴]

فصل چہارم کا عنوان'' وفد ثقیف کے قیام فی المسجد کی تعلیل'' ہے جس کے تحت وفد ثقیف کو مسجد میں ٹھہرانے کی علت بتائی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ابوداؤد، احمد وطبرانی کی روایت سے مولانا نے اپنی باتوں کو تقویت بخشی ہے۔ اُنہیں مسجد میں اس لئے ٹھہرایا گیا کہ وہ اسلام کے محاسن سے واقف ہوسکیں۔ قرآن کی صدائیں ان کی کانوں میں پڑیں گی۔ مسلمانوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر خدا کی سچی اور فطری عبادت کی خوبیاں اُن کے دلوں میں راہ پیدا کریں گی آگے چل کر مولانا اسلام کی صداقت وحقیقت، قوت وطاقت پر مختصر گفتگو کرتے ہیں۔ مضمون کا اختتام اِن جملوں پر ہوتا ہے:۔

'' مسجد کا اصلی احترام یہی ہے کہ اس میں انسانوں کی بھلائی کے لئے
انسانوں کا اجتماع ہو۔ انسانوں کے نکال دینے میں اس کی حرمت نہیں، بلکہ

بے حرمتی ہے، اسلام نوع انسانی کی عظمت واحترام کے لئے آیا ہے۔ تذلیل
وتحقیر کے لئے نہیں آیا ہے۔

پس وہ کسی انسان کو بہ حیثیت ایک انسان کے نجس نہیں قرار دیتا، جس کی
چھوت سے مٹی اور اینٹ ناپاک ہو جائے۔ نجاست انسان کے جسم میں نہیں
بلکہ اس کے اعتقاد اور عمل میں ہوتی ہے۔ کاش جسم میں ہوتی تو دریا کا پانی
اسے دھو دیتا اور انسان کا بنا ہوا کپڑا پونچھ دیتا۔ مگر افسوس وہ دل اور عمل کی
گندگی ہے جس پر نہ تو پانی بہایا جاسکتا ہے اور نہ کوئی ہاتھ صاف کر سکتا ہے۔
اسے صرف خدا کا سچا ایمان اور راستی کا کامل عشق ہی پاک کر سکتا ہے سو انسان
پر اس کی راہیں بند نہ کرو!''[۱۵]

فصل چہارم کے بعد ایک مختصر تحریر ''اسلام کی دینی عمارت صرف مسجد ہے'' کے عنوان سے
ہے۔ بقول ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری پہلے ایڈیشن میں یہ چھٹی فصل تھی۔ اس ایڈیشن میں
مصنف نے اسے حذف کر دیا۔ اس عنوان کے تحت مصنف نے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ
اسلام کی دینی عمارت صرف مسجد ہے اور کوئی نہیں۔ پس اگر اسلام غیروں کو قبول کرنا چاہتا ہے تو
مسجد میں ہی قبول کرنا پڑے گا۔ اس
سلسلے میں مولانا نے رانچی میں قیام کے دوران شہر کے تعلیم یافتہ ہندوؤں اور وکلاء وغیرہ
کے لئے ایک مناسب انتظام جمعہ کے دن مسجد ہی میں کر دیا تھا۔ انہیں مولانا کے خطبات سننے کا
بہت شوق تھا۔

''جامع الشواہد'' کا پانچواں فصل ''ثمامہ بن اثال کا واقعہ'' کے عنوان سے ہے جس کی
تفصیل صحیحین میں موجود ہے۔ ثمامہ بن اثال نجد کا رئیس تھا۔ ہجرت کے پانچویں سال اسے
گرفتار کر کے نجد سے لاکر مسجد نبوی کے ستون سے باندھ دیا گیا۔ تین دن تک وہ مسجد ہی میں
رہا۔ تیسرے دن آنحضرت صلعم نے بلا کسی شرط کے رہا کر دیا۔ مولانا آزاد امام بخاری کی ایک

روایت کا متن نقل کرتے ہیں۔ ثمامہ بن اثال پر حضور اکرم صلعم کے اس خلق عظیم کا ایسا اثر ہوا کہ آزاد ہونے کے بعد خود واپس آ گیا کہ مسجد کے ستون کی جگہ اب دین حق کی زنجیروں سے ہمیشہ کے لئے وابستہ کر دیا جائے۔ مولانا نے اس سلسلے میں امام بخاری کی ''کتاب الصلوۃ کے ایک خاص باب کا ذکر کیا ہے جس میں اس واقعے کے سلسلے میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے استدلال کیا گیا ہے اور جواز ثابت کیا ہے کہ غیر مسلموں کو مسجد میں داخل کرنا جائز ہے۔ اس میں اہل کتاب یا مشرک کی کوئی قید نہیں۔

کتاب کے چھٹے فصل کے عنوان ''عامۂ مجتہدین اور احناف کی رائیں'' کے تحت مولانا نے غیر مسلموں کا مسجد میں داخل ہونے کے سلسلے میں ائمہ مجتہدین خصوصی طور پر حضرت امام ابو حنیفہؒ کا کیا مسلک رہا ہے؟ اس کا جائزہ لیا ہے۔ اس سلسلے میں ''ہدایہ'' اور ''اشباہ والنظائر'' کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ ذمی کا مسجد میں داخلہ ممنوع نہیں اگر جنبی ہو اور حنفیہ کے نزدیک مسلمان کی اجازت بھی نہیں اگر چہ مسجد حرام ہو۔ اس سلسلے میں حضرت امام شافعیؒ کے مسلک کی بھی نشان دہی کرتے ہیں جس کی رو سے ذمی عام مسجد میں تو داخل ہو سکتا ہے مگر مسجد حرام میں نہیں۔

فصل ہفتم کا عنوان ''تشریح آیۂ انما المشرکون نجس مذہب احناف اور مسلمانوں کا عمل مستمر'' ہے۔ اس عنوان کے تحت مولانا آزاد نے قرآن کی آیت۔ انما المشرکون نجس۔۔۔۔ لہٰذا جو سورہ توبہ کی آیت نمبر ۲۸ ہے کے پیش نظر لفظ نجاست کی تشریح کرتے ہیں مذہب احناف کے اس عقیدے کی توضیح کی ہے کہ تمام اہل سنت کا اس پر اتفاق ہو چکا ہے کہ نجاست سے مراد نجاست معنوی یعنی اعتقاد و شرک کی نجاست ہے نہ کہ نجاست جسمی دلائل کتاب وسنت اس پر ناطق و شاہد ہیں۔ احتیاج بیان نہیں۔ مختلف کتابوں اور روایتوں مثلاً تفسیر ابو السعید حنفی، حاشیہ، ہدایہ، عنایہ سعدی اور شامی کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ:۔

''حنفیہ کے نزدیک مسلمانوں کے لئے جائز نہیں کہ غیر مسلوں کو مسجد حرام میں

غلبہ وتمکین کے ساتھ داخل ہونے دیں لیکن اگر کسی خاص عارضی ضرورت سے کسی غیر مسلم کو آنے دیا جائے۔ مثلاً تعمیر عمارت یا تجارت کے لئے یا غیر مسلم حکومتوں کے غیر مسلم سفرا ہوں تو جائز ہے لیکن ائمہ ثلاثہ اس کے خلاف ہیں۔"[16]

اس سلسلے میں مولانا آزاد حافظ نووی شرح مسلم کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں اور پھر اس کا ترجمہ بھی۔

"یعنی کسی حال میں جائز نہیں کہ غیر مسلم کو حدود حرم میں داخل ہونے دیا جائے اور اگر کوئی غیر مسلم پوشیدہ چلا جائے تو اس کا اخراج واجب ہے لیکن امام ابو حنیفہ کے نزدیک جائز ہے۔"[17]

مولانا نے اس سلسلے میں نہایت تفصیلی طور پر تمام دلائل و مصالح، قول ائمہ ثلاثہ و جمہور کو ہی قوی ثابت تسلیم کیا ہے چنانچہ آج تک اسی پر عمل ہو رہا ہے۔ عثمانی حکومت کا حوالہ دیتے ہوئے بھی ثابت کرتے ہیں کہ اگرچہ عثمانی حکومت کا سرکاری مذہب حنفی تھا لیکن اُن لوگوں نے بھی اس معاملے میں امام صاحب کے مذہب پر عمل نہیں کیا اور ہمیشہ حدود حرم میں غیر مسلموں کا داخلہ ممنوع رہا مولانا اس کا جواز پیش کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:۔

اصل یہ ہے کہ امتِ مسلمہ کے بقا کے لیے ضروری تھا کہ جس طرح تعلیم و احکام ہمیشہ کے لیے اوراق و صحف میں محفوظ کر دیے گئے تھے اسی طرح با عتبار مکان کے بھی ایک مرکزی مقام ہمیشہ کے لیے ایسا مقرر کر دیا جاتا جو صرف پیروان اسلام کے لیے مخصوص ہوتا اور وہاں کی فضا اغیار و اجانب کی موجودگی سے کبھی ملوث نہ ہوتی۔ اسلام نے ان بے شمار مصالح و حکم کی بنا ر(جو اپنے مقام پر معلوم و منضبط ہیں)۔ سرزمین حجاز کو اس غرض سے منتخب فرمایا۔ ذلک تقدیر العزیز العلیم۔

پس ضروری تھا کہ اسے صرف پیروان اسلام ہی کے لیے مخصوص کر دیا جاتا،
تا کہ کرہ ارضی کے سخت سے سخت عہد انقلاب و حوادث میں بھی ایک مرکز
اسلام و امن محفوظ رہے۔ یہی معنی ہیں اس آیہ کریمہ کے:
واذجعلنا البیت مثابة للناس و امنا جعل الله الکعبة البیت
الحرام ام قیاما للناس اور ومن دخله کان امنا
اور چوں کہ یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا، جب تک اس میں نہایت مبالغہ نہ
کیا جاتا اس لیے ناگزیر ہوا کہ نہ صرف غیر مسلموں کے قبضہ و تمکین کو بلکہ
سرے سے ان کے قرب و وجود ہی کو ہمیشہ کے لیے روک دیا جائے۔ کیوں
کہ اگر آمد و رفت کا دروازہ کھلا رہے گا تو خصوصیت اسلام کی اہمیت باقی نہ
رہے گی اور اس کی اہمیت باقی نہ رہی تو بہت ممکن ہے کہ قبضہ و استیلا کا دروازہ
بھی کھل جائے۔ شریعت جس قدر اہتمام اصل مفاسد کے انسداد میں کرتی
ہے، اتنا ہی اہتمام وسائل مفاسد کے روک تھام میں بھی کرتی ہے۔ چوں کہ
اس مقام کی حفاظت دائمی طور پر مطلوب تھی، اس لیے ضروری تھا کہ اول ان
سے ان تمام وسائل کا بھی سد باب کر دیا جائے جو کسی نہ کسی شکل میں اس کی
حفاظت کو صدمہ پہنچا سکتے ہیں [۱۸]

آخر میں یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اس بارے میں حنفیہ کا مذہب ضعیف ہے اور قوی وہی ہے جو ائمہ ثلاثہ و جمہور کا مذہب ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ نصِ قراں اور عمل صحابہ سے بھی اسی مذہب کی تائید ہوتی ہے۔ آنحضرت صلعم کی زبانِ مبارک سے مرض الموت میں آخری وصیت جو نکلی تھی اس کو بھی نقل کرتے ہیں:۔

"اخرجوا الیھود والنصاری من جزیرة
العرب (صحیحین عن ابن عباس وعائشه و ابی

ھریرہ).

یعنی یہود ونصاری جزیرۃ العرب میں نہ رہیں۔ وہ اب یہاں اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ جب پورے جزیرے کے لئے یہ وصیت کی گئی جس میں حرمین کے علاوہ دیگر حصص عرب بھی وہ داخل ہیں تو ثابت ہے کہ حرم کے لئے تو بہ درجہ اولی یہ مطلب ہوگا۔"۱۹

مضمون کے آخر میں اس واقعے کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جس کے تحت حضرت عمرؓ نے اسی وصیت کے مطابق خیبر اور یمن کے یہود ونصاری کو کافی معاوضہ دے کر عرب سے خارج کر دیا تھا اور بلاد شام وسواد عراق میں آباد کرایا تھا۔

فصل ہشتم میں "امام شافعی کا مذہب اور صاحب ہدایہ کا تسامح" عنوان کے تحت مختلف روایتوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ امام شافعیؒ غیر مسلموں کو عام مساجد میں اہل اسلام سے اجازت لے کر داخل ہونے کو جائز قرار دیتے ہیں مگر مسجد حرام میں نہیں۔ مولانا آزاد اس سے اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"امام شافعی کا استدلال حرف نص قرآنی فلا یقربو المسجد الحرام سے ہے۔ جس نے خود مسجد حرام سے کو خاص طور پر مخصوص و مستثنی کر دیا۔ تمام مسجدوں کے لئے ایسا حکم نہیں دیا۔ اور اس ایک ظاہر و ناطق دلیل کے بعد اور کسی دلیل کی ان کو ضرورت کیا تھی؟ بلاشبہ وہ ممانعت کی علت نجاست کو قرار دیتے ہیں، مگر اپنے قیاس ورائے سے نہیں، بلکہ اس لئے کہ خود قران ہی نے یہ تعلیل کر دی ہے: انما المشرکون نجس فلایقربو المسجد الحرام ." انما " اور اس کے بعد حرف "فا" کا آنا اپنی دلالت میں ظاہر و ناطق ہے۔ مگر وہ نجاست سے نجاست جسمی مراد نہیں لیتے۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کے مذہب میں غیر مسلم کی ملامست اور

مواکلت جائز نہ ہوتی۔''[20]

آگے چل کر ایک اور نکتے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مسجد حرام سے مقصود کیا ہے؟ صرف عمارت کعبہ یا اور بھی کچھ۔ ایک جماعت صرف احاطۂ مسجد کو ہی مسجد حرام تسلیم کرتا ہے لیکن جمہور کا مذہب یہ ہے کہ ''مسجد حرام'' سے مقصود تمام حرم ہے۔ اس سلسلے میں سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت نقل کرتے ہوئے اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:۔

"سبحان الذی اسری بعبدہ لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی" میں بالاتفاق مسجد حرام سے مقصود مکہ معظمہ ہے نہ کہ نفس مسجد۔ کیوں کہ معلوم ہے کہ اسریٰ کا معاملہ آپؐ پر جب واقع ہوا تو آپؐ ام ہانی کے مکان میں تھے، نہ کہ مسجد حرام میں، اور اسی طرح مسجد اقصی سے مقصود بیت المقدس ہے، نہ کہ صرف ہیکل۔''[21]

اس سلسلے میں حافظ ابن کثیر کی تفسیر کے حوالے سے عطا کا قول نقل کیا گیا ہے کہ مدینہ منورہ حرم ہے کہ نہیں؟ اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ فی الجملہ اس کے حرم ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ اس سلسلے میں حافظ نووی کے شرح مسلم کے حوالے سے ایک حدیث بھی نقل کی گئی ہے۔ یہ حدیث حضرت امام شافعیؒ، امام مالک اور احمد کے مذہب کی تائید کرتی ہے کہ مدینہ کے لئے بھی حرم ہے۔ البتہ امام ابوحنیفہؒ نے اس کی مخالفت کی ہے۔ اُن کے نزدیک مدینہ حرم نہیں ہے ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری نے اس فصل کا آخری پیراگراف اپنے حواشی میں نقل کیا ہے جسے مولانا نے اس ایڈیشن میں حذف کر دیا ہے۔

''پس جب مدینہ کے لئے بھی حرم مثل مکہ کے نصاً ثابت ہوا اور من جملہ احکام حدود حرم کے منع جواز دخول غیر مسلم ہے تو معلوم ہوا کہ " فلا یقربوا " کے حکم میں مدینہ بھی داخل ہے اور مدینہ میں بھی غیر مسلموں کا داخل ہونا کسی حال میں جائز نہیں۔''[22]

ایک عنوان ''مسجد میں غیر مسلموں کا داخلہ مقید ہے یا غیر مقید؟'' کے تحت ہے۔ بقول ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری یہ بارہویں فصل تھی۔ نئے ایڈیشن میں مصنف نے اسے حذف کر دیا ہے۔ اس عنوان کے تحت مولانا نے گذشتہ صفحات کے حوالے سے یہ واضح کیا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک غیر مسلموں کا مسجد میں داخل ہونا مطلقاً جائز ہے۔ اس کے لئے مسلمانوں کے اذن کی ضرورت نہیں لیکن امام شافعی وغیرہم ائمہ کے نزدیک مسلمانوں یا مسلمانوں کے امام کی اجازت وطلب کے بغیر جائز نہیں۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ممکن ہے کہ حکومت ابوحنیفہؒ کے زمانے میں اس قید کی ضرورت نہیں ہو لیکن اگر ہندوستان کے تناظر میں دیکھا جائے تو اذن وطلب ورضا کی قید ضروری ہے اور جواز دخول کو اذن مسلم سے مقید کرنا نہایت ضروری ہے مولانا اپنی گفتگو کا نچوڑ اس طرح پیش کرتے ہیں:۔

> ''یعنی جب کبھی مسلمانوں کا کوئی پیشوا یا مسلمانوں کی کوئی جماعت غیر مسلم یا غیر مسلموں کی کسی صلح پسند اور دوست وحلیف جماعت کو مقاصد صالحہ۔ ملک و ملت سے مسجد میں بلانے یا کم از کم تقریباً ان کے داخل مسجد ہونے پر راضی ہو تو ایسا کرنا شرعاً جائز ہوگا۔ وہ مجلس میں شریک ہو سکتے ہیں اور ضرورت ہو تو خطبات ومواعظ مسجد کو سن سکتے ہیں۔ جماعت نماز کا منظر دیکھ سکتے ہیں اور ضرورت ہو تو غیر اوقات صلوۃ جماعت میں جائز ومستحسن امور پر پوری آزادی سے تقریر بھی کر سکتے ہیں، بلکہ خود مسلمانوں کو چاہیے کہ حسب ضرورت و حالت معاملاتِ مشترکہ پر ان سے مجالس مسجد میں مشورہ کریں اور ان کی واقفیت وتجارب سے فائدہ اٹھائیں۔[۲۳]

اس ضمن میں وہ حضرت عمرؓ کی مثال پیش کرتے ہیں جنہوں نے بعض اوقات مجلس شوریٰ میں غیر مسلموں کو خود بلاتے تھے اور ملکی معاملات پر اُن سے مشورہ کرتے تھے۔ مضمون کے آخر میں مولانا حتمی اور قطعی پر مشورہ دیتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:۔

''پس ان روایات سے بھی ثابت ہوا کہ امام وقت یا مسلمانوں کی طلب و
اذن سے غیر مسلم مساجد میں داخل ہوئے، اسی طرح آج بھی مسلمانوں کو کرنا
چاہئے۔ اذن کی قید کا ضروری نہ سمجھنا تو ایک طرح کی تفریط معلوم ہوتی ہے۔
جس طرح مطلقاً منع میں تشدد وافراط ہے۔''۲۴

فصل نہم میں ''ایک غلط استنباط'' کے عنوان کے تحت اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے جسے بعض اخبارات نے شائع کیا تھا کہ جب خود مسلمانوں کے لئے جائز نہیں مسجد میں بلا طہارت داخل ہوں تو ہندوؤں کو بٹھانا اور بلانا کب جائز ہے؟ مولانا فرماتے ہیں تمام کتب فقہ، حنفیہ میں صاف لکھا ہے:۔

" ولا یمنع من دخول المسجد جنبا بخلاف المسلم
یعنی غیر مسلم اگر چہ جنبی ہو، مسجد میں داخل ہونے سے نہیں روکا جائے
گا۔ برخلاف مسلمانوں کے وہ احکام اسلامی تعمیل پر مجبور ہیں اور ان کے لئے
بحالتِ جنابت داخل ہونا جائز نہیں۔۲۵

آگے چل کر خود مسلمانوں کے لئے مقیم و عابر کا جو فرق کیا گیا ہے اُن پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ پھر اس نکتے کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ تمام شور وشغب کے لئے قاطع یہ ہے کہ غیر مسلم فروع میں میں مخاطب ہی نہیں کہ اُن کی نسبت احکام طہارت کا سوال پیدا ہو۔ مضمون کے اختتام پر دوٹوک الفاظ میں یوں رقم طراز ہیں:۔

''جس مسجد مقدس کی بنیاد اول روز سے تقویٰ وطہارت پر پڑی۔ جس کی
دیواریں وحی الٰہی کا مورد ومہبط ہوئیں اور جس کے نمازیوں کی پاکی اور ستھرائی
پر خود اللہ تعالیٰ نے گواہی دی۔ وہ تو مشرکین طائف کے نزول واقامت سے
ناپاک نہیں ہوئی اور اللہ کے رسولؐ نے ٹھیرانے سے پہلے غسل کر لینے کا حکم
نہیں دیا۔ لیکن آج ہندوستان کی مسجدیں ہندوؤں کے چار گھڑی قیام سے

ناپاک ہوجائیں گی، اس لئے کہ احکام اسلام کے مطابق وہ غسل وطہارت
کرکے نہیں آتے۔ اگر موجودہ عہد کے علما کی فقاہت وافتا کا معاملہ یہاں
تک پہنچ چکا ہے تو پھر بجز انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ دینے کے چارہ
نہیں ۔ اور شاید اس کے پڑھ دینے کا وقت مدت ہوئی کہ آچکا اور گزر
چکا۔۲۶

فصل دہم کا عنوان ''ہندوستان کے ہندو کس قسم کے غیر مسلم ہیں'' ہے جس کے تحت مولانا نے ذمیوں کے متعلق واضح کیا ہے کہ ان سے کیا مراد ہے پھر غیر مسلموں کی جو تقسیم بندی اسلام نے کی ہے اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ فقہا نے اس کے تین قسمیں بتائی ہیں (۱) اہل کتاب (۲) شبہہ اہل کتاب (۳) مشرکین وعبدۃ الاوثان۔ مولانا نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے یہ صاف کردیا ہے کہ اہل کتاب اور شبہہ اہل کتاب سے جزیہ قبول کرنے اور ذمہ لینے پر سب کا اتفاق ہے آگے چل کر مجوسیوں کو شبہہ اہل کتاب کی طرح سلوک کرنے کے سلسلے میں صحابہ کے اجماع کا ذکر کیا ہے پھر امام ابوحنیفہ اور احمد کے حوالے سے اس نکتے کی نشان دہی کی گئی ہے کہ مشرکین عرب کو اہل الذمہ میں شمار کرنا جائز نہیں مگر عجم کی تمام بت پرست اقوام کا شمار اہل الذمہ میں ہوگا اور اس طرح جمہور کے نزدیک مشرکین عجم بھی شبہہ اہل کتاب میں داخل ہیں۔ مولانا ہندوستان کے ہندوؤں کا شمار بھی قطعاً اسی صف میں کرتے ہیں اور ان کے نزدیک جو بات مجوسیوں کے لئے جائز رکھی گئی ہوگی وہ ان کے لیے بھی بدرجۂ اولی جائز ہوگی۔ ان کا کہنا ہے کہ جب مجوسی، صائبین کو شبہہ اہل کتاب میں شامل کیا گیا تو ہندوؤں کو کیوں نہیں۔ وہ کہتے ہیں:۔

''میں کہتا ہوں کہ ہندوستان کے ہندو ان دونوں قوموں یعنی مجوسیوں اور صائبہ سے بھی بدرجہا بہتر مذہبی ومدنی حالت رکھتے ہیں۔ پس اگر ان دونوں کا شمار شبہہ اہل کتاب میں ہوا تو یہ اشارہ ہے اس طرف کے ہندوؤں کا شمار بہ

طریق اولیٰ ہوگا۔'' ۲۷؎

اس سلسلے میں حافظ ابن المنذر سے حضرت علیؓ کا وہ قول بھی نقل کیا گیا ہے جس میں انہوں نے مجوسیوں کی تعریف علم سے ان کے ذوق وشوق کی بنا پر کی گئی ہے۔

مولانا آزاد اس معاملے میں ہندوؤں کو بدرجہ اولیٰ قرار دیتے ہیں۔ دوسرے ایڈیشن میں کچھ فصلوں کو خارج کر دیا گیا ہے مثلاً ''حضرت عمر بن عبدالعزیز کا ایک فرمان'' اور ''ذمیوں کے دخول مسجد کی نسبت احناف کی رائے اور اس کا جواب'' کے عنوان سے ہے۔ ذمیوں کے سلسلے میں امام ابوحنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ مسجد حرام میں داخل ہو سکتے ہیں۔ فصل یازدہم میں ''اس سلسلے میں احناف کے علاوہ ائمۂ ثلاثہ کی رائے'' کے تحت مولانا نے بتایا ہے کہ امام مالک اور امام احمد نے منع فرمایا ہے۔ آگے چل کر اس نکتے کی بھی نشان دہی کرتے ہیں کہ ''فقہاء وائمہ کے اقوال و مذاہب کی نسبت بے شمار مسائل میں اور بسا اوقات مختلف روایتیں بلکہ متضاد روایتیں پائی جاتی ہیں اور فقہ حنفی میں تو اس کے نظائر سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں مثلاً حضرت احمد سے اس بارے میں دو قول مشہور ہیں۔ ایک قول میں تمام غیر مسلموں کے لیے جائز قرار دیا گیا ہے مگر اذن مسلم کی شرط دونوں میں ہے۔ فقہاء حنابلہ کا فتویٰ اور عمل دوسرے قول پر ہے بلکہ بعض اکابر حنابلہ کے نزدیک تو اذن مسلم کو بھی شرط نہیں۔ فقہائے مالکیہ کے نزدیک ایک قول میں تو مطلقاً منع ہے مگر دوسرا قول یہ ہے کہ ذمیوں کو اجازت دی جا سکتی ہے، اگر مصلحت ہو مگر غیر ذمیوں کو نہیں۔ ایک عنوان ''مقامات و بلاد اسلام میں غیر مسلموں کے حقوق کی تفصیل'' کے تحت ہے جو اس ایڈیشن میں حذف کر دیا گیا ہے۔ فصل دوازدہم میں ''کیا مسجدیں صرف نماز کے لیے ہیں'' عنوان بنایا گیا ہے۔ بعض لوگوں کا اس سلسلے میں یہ کہنا تھا کہ مسجد صرف عبادت کے لیے ہے۔ اس لیے اس قسم کی مجلسیں وہاں منعقد کرنا جائز نہیں۔'' مولانا نے نہایت تفصیلی طور پر مستند حوالوں سے اس کا جواب دیا ہے جس کے مطالعے سے مولانا کی فقہی بصیرت اور منطقی استدلال کے علاوہ ان کے وسعت مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا نے واضح طور پر بتایا ہے کہ مسجد میں بے

شار اعمال و اجتماعات کا ثبوت ملتا ہے۔ ائمۂ اسلام نے نہ صرف ان کے جواز پر بلکہ ان کے استحسان پر اتفاق کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے صحیح بخاری کی کئی حدیثوں کا حوالہ دیا ہے جو احکام مسجد کے متعلق ہیں اور آنحضرت ﷺ نے مسجد کی عمارت سے کیا کیا کام لیے ہیں۔ اس کی تفصیل ہے۔ عہد نبوی میں مسجد نبوی سرکاری مہمان سرا کا کام دیتی تھی۔ اموال، غنائم اور خراج و زکوٰۃ مسجد ہی میں لائے جاتے تھے اور وہیں لوگوں میں تقسیم ہوتے تھے۔ عہد خلفائے راشدین میں بھی ایسا ہوتا رہا۔ آگے چل کر حضرت انسؓ کی ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ جب بحرین سے خراج آیا تو حضور ﷺ نے حکم دیا کہ مسجد میں پھیلا دو۔ چنانچہ نماز کے بعد خود مسجد میں بیٹھ کر اسے تقسیم کیا۔ آگے چل کر امام بخاری نے اس سلسلے میں جو باب باندھے ہیں اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ مسافر کا مسجد میں قیام باتفاق جائز ہے ایک روایت بھی نقل کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ ولیدہ کے مسلمان ہونے پر ان کے قیام کے لیے مسجد میں ایک خیمہ کھڑا کیا گیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ وہ مسجد میں اکثر سو جایا کرتے تھے۔ مولانا نے نہایت تفصیلی طور پر اس موضوع پر گفتگو کی ہے۔

مسجد نبوی میں فقرا و صعالیک کی دار الاقامت، متعلمین کا قرآن و شریعت کے لیے درس گاہ، اصحاب صفہ کا ایک چبوترے پر شب و روز پڑے رہنا۔ ہر طرح کی مجلسیں اور صحبتیں منعقد ہونا۔ فوجوں کی تیاری اور تربیت، اس کے لیے مالی اعانت کی فراہمی یہ تمام امور مسجد ہی میں انجام پاتے تھے۔ مسجد نبوی میں حضرت حسان بن ثابت اپنے قصائد سناتے تھے اور خود آنحضرت ﷺ سنتے اور خوش ہو کر دعائیں دیتے تھے۔ عہد نبوی مسجد ہی میں شفا خانے کا کام دیتی تھی۔ جنگ خندق میں حضرت سعدؓ زخمی ہوئے تو انہیں مسجد میں خیمہ کر کے رکھا گیا۔ بہت ساری مثالیں اور تاریخی واقعات پیش کرتے ہوئے وہ اس کی بھی تلقین کرتے ہیں:۔

”......یہ جو بار بار کہا جاتا ہے کہ مسجد صرف نماز کے لیے ہے تو سوچ سمجھ کر کہنا چاہئے۔ یہ نہیں کہ جو منہ میں آیا کہہ دیا اور جو بات اپنی ہوا و خواہش کے

خلاف ہوئی جہٹ ناجائز ٹھہرادی لیکن مسجد کا نماز کے لیے ہونا کب اس سے
مانع ہے کہ تبعاً دیگر مقاصد صالحہ وصفہ کے لئے بھی استعمال میں لائی
جائے۔"۲۸

آگے چل کر حضرت عمر کے زمانے کے واقعات بھی نقل کیے گئے ہیں اور بہت ہی واضح انداز میں مولانا نے ثابت کیا ہے کہ مسجد صرف نماز کے لیے ہی نہیں بلکہ بہت سارے دینی، معاشرتی، ملکی، سیاسی، معاملات مسجد میں طے پاتے تھے۔ یہ کرنا بالکل جائز ہے۔

فصل سیزدہم میں "رفع الصوت فی المسجد اور حضرت عمر کی روایت کی تشریح" عنوان کے تحت ان لوگوں کا جواب دیا گیا ہے جو حضرت عمرؓ سے منسوب ایک واقعہ کو جواز بنا کر مسجد میں مخلوط جلسے اور تقریر و بحث کو جائز نہیں قرار دیتے ہیں۔ حضرت عمر نے دو شخصوں کو مسجد میں بلند آواز میں باتیں کرتے سنا تو انہوں نے کہا کہ اگر تم شہر کے باشندے ہوتے، مسافر نہ ہوتے تو میں سخت سزا دیتا۔ اس سلسلے میں امام بخاری کی صحیح روایت کے دو واقعہ ایک حضرت عمر والا واقعہ جس کے راوی سائب بن یزید ہیں اور دوسرا کعب بن مالک کا واقعہ جس کے تحت کعب بن مالک اور ان کے ایک مقروض مسجد میں اپنے قرض کی نسبت بات چیت کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ چلا چلا کر باتیں کرنے اور ان کی آواز آنحضرت ﷺ نے اپنے حجرے میں سن لی اس پر آپ نکلے اور کعب کو اشارہ کیا کہ اس قدر اپنے قرض میں سے چھوڑ دو...... ۔ مولانا نے ان دونوں واقعات کے مفہوم کو بیان کرتے ہوئے واضح کیا کہ ان دونوں روایتوں کو اس باب میں امام بخاری نے اس لیے جمع کیا کہ مسئلے کے دونوں پہلو منع و جواز کے واضح کرنا چاہتے تھے۔ آگے چل کر حافظ عسقلانی کی تصنیف فتح الباری سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں جس کے تحت امام مالک مطلقاً رفع الصوت کو مکروہ کہتے تھے خواہ درس و تدریس علم ہی میں کیوں نہ ہو۔ دیگر ائمہ کی نزدیک اگر کسی ایسی بات کے لئے رفع صوت ہو جس میں کوئی دینی یا دینوی منفعت ہو تو جائز ہے ورنہ نہیں امام بخاری نے حدیث عمر اور حدیث کعب جو جواز کے لیے لاتے ہیں وہ بیکار اور لغو

باتوں کے لیے ہے کسی ضرورت کی بنا پر ہو تو جائز ہے۔اس سلسلے میں حضرت عمرؓ کے عہد کے کئی واقعات کے حوالے سے مسجد میں نیک مقاصد کے لئے باتیں کرنے کا جواز پیش کیا ہے لیکن وہ یہ بات پسند نہیں کرتے تھے کہ مسجد نبوی میں بلاضرورت چلا کر بات کی جائے اور اس طرح مقام رسالت کی تعظیم واحترام سے بے پروائی وغفلت کی بنیاد پڑے۔

کتاب کا چہاردہم فصل ''انقلاب حالات وخاتمہ'' کے عنوان سے ہے جس میں مولانا اس بات کی تلقین کرتے ہیں:۔

''خاتمہ سخن میں ایک معاملہ کی طرف اشارہ ناگریز ہے۔ یہ معلوم ہے کہ گروہ کے دائرے فکر ونظر کے حدود میں اور نظم وصحت اعمال کے لیے ضروری ہے کہ ان حدود سے تجاوز نہ کیا جائے۔ ہر گوشہ علم وعمل میں ساری مصیبتیں اسی تجاوز عن الحد سے پیش آتی ہیں۔۲۹

آگے چل کر وہ اس تاسف کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ آج کل ہر وہی تحریر عوام وخواص میں مقبول ہوتی ہیں جو مذہبی رنگ میں لکھی گئی ہوں۔ ہر شخص اپنی باتوں میں شریعت کا حوالہ دیتا ہے۔خواہ وہ شریعت کے علم وعمل سے بے بہرہ کیوں نہ ہو۔تحریر میں قرآن کی آیتوں کو کھپانا علمی شان سمجھتا ہے۔اس آخری باب کا اختتام مولانا اس طرح کرتے ہیں:۔

''یہ حالت دیکھ کر بعض اوقات خیال ہوتا ہے کہ اس دینی انارکی اور مذہبی طوائف الملوکی سے تو وہی پچھلی حالت بہتر تھی۔ اللہ تعالی مسلمانوں کو اور علمائے عصر کو توفیق دے کہ وہ اس حالت کے مہلک نتائج محسوس کریں اور کوئی نہ کوئی اسی راہ اختیار کریں جس سے نظم واقوام امت کا باب مسدود کھل سکے۔ بغیر اس کے کوئی ایسی بھی اصلاح حال کے لیے سود مند نہ ہوگی۔ واللہ المستعان وعلیہ۔''۳۰

''جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد'' مولانا آزاد کی وہ تصنیف ہے جس میں

فقہی مباحث بیان کیے گئے ہیں۔ کتاب کے مطالعے سے اس نکتے کا انکشاف ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کا فقہی منہاج مجتہدانہ ہے۔ وہ اپنی باتوں کو تقویت بخشنے کے لیے مجموعی اسلامی فقہ کی روشنی میں اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔ ''جامع الشواہد'' کے مطالعے سے مولانا کے ذوق و ذہن، فقہ پر ان کا وسیع مطالعہ، اجتہادی بصیرت، دلائل کا استنباط اور فقہی مستدلات کا پتہ تو چلتا ہی ہے ساتھ ہی ہندو مسلم اتحاد کے لیے وہ کس قدر کوشاں تھے اس کا اعتراف مولانا کی مخالفین نے بھی کیا ہے میں اپنی باتوں کا اختتام مولانا سید سلیمان ندوی کی اس تحریر پر کرنا چاہوں گا جو رانچی کے حوالے سے ہے۔ دیکھیے یہ اقتباس:۔

> ''زمانہ قیام رانچی میں ایک سال تک جامع مسجد میں مولانا نے مسلمانوں کو قرآن مجید کا درس دیا۔ ترجمان القرآن اس زمانے میں ختم ہوا۔ تفسیر میں ایک جامع تصنیف کا سلسلہ ۲۳ پاروں تک پہنچی۔ فقہ اسلامی پر بغیر فریقانہ تعصب کے صرف کتاب وسنت کو پیش نظر رکھ کر متعدد رسائل الصلوٰۃ، الزکوٰۃ، الحج، النکاح ترتیب دیے۔ علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم اور شاہ ولی اللہ کی سوانح قلمبند کی۔ ان سطروں کو لکھتے ہوئے مجھے دھوکہ ہوا ہے کہ خود امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم، یا شمس الائمہ سرخی یا امیہ بن عبدالعزیز اندلسی کے حالات تو نہیں لکھ رہا ہوں۔ ۳۱

☆☆☆

حواشی

۱۔ خطباتِ آزاد، مرتبہ مالک رام۔ ص ۱۵، ساہتیہ اکاڈمی دہلی

۲۔ قول فیصل، ادبستان لاہور۔ ص۔ ۱۲۳۔۱۲۲

۳۔ جامع الشواہد، ابوالکلام آزاد۔ تقدیم وتدوین۔ ڈاکٹر ابوسلیمان شاہجہاں پوری، ناشر مولانا ابوالکلام آزاد، ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان کراچی

۴۔ایضاً۔ص۔166-167

۵۔ایضاً۔ص۔168-169

۶۔ایضاً۔ص۔168-170

۷۔ایضاً۔ص۔173

۸۔ایضاً۔ص۔25

۹۔ایضاً۔ص۔26

۱۰۔ایضاً۔ص۔45

۱۱۔ایضاً۔ص۔45

۱۲۔ایضاً۔ص۔57-58

۱۳۔ایضاً۔ص۔66

۱۴۔ایضاً۔ص۔68

۱۵۔ایضاً۔ص۔75

۱۶۔ایضاً۔ص۔86-87

۱۷۔ایضاً۔ص۔87

۱۸۔ایضاً۔ص۔88

۱۹۔ایضاً۔ص۔89

۲۰۔ایضاً۔ص۔98-99

۲۱۔ایضاً۔ص۔101

۲۲۔ایضاً۔ص۔103

۲۳۔ایضاً۔ص۔105-106

۲۴۔ایضاً۔ص۔106

۲۵۔ایضاً۔ص۔107

۲۶۔ایضاً۔ص۔109

۲۷۔ایضاً۔ص۔114

۲۸۔ایضاً۔ص۔134

۲۹۔ایضاً۔ص۔160

۳۰۔ایضاً۔ص۔161

۳۱۔مضمون ''یوسف ثانی'' از مولانا سید سلیمان ندوی، مشمولہ ماحول کراچی آزاد نمبر۔۱۹۶۱

انجمن اسلامیہ کی تشکیل اور مدرسہ اسلامیہ کا قیام

رانچی میں نظر بندی کے دوران مولانا آزاد کو اس کا احساس اور زبردست احساس تھا کہ یہاں کے مسلمان تعلیمی اور معاشی اعتبار سے پسماندگی کے شکار ہیں، جہالت، بدعقیدگی، غیر اسلامی رسم ورواج کے شکنجے میں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ ان سے نجات بغیر تعلیمی فروغ کے ممکن نہیں۔ لہٰذا اسی مقصد کے پیش نظر مسلمانوں کی اصلاح، تعلیمی فروغ، اجتماعی نظام کی درستگی، مذہبی شعور کو بیدار کرنے اور اصلاحی ادب کی اشاعت کے لیے مولانا کی تحریک پر 15 اگست 1917 کو انجمن اسلامیہ رانچی کا قیام عمل میں آیا۔ اس سلسلے میں ایک کمیٹی کی تشکیل دی گئی جس کے صدر الطاف حسین خان بنائے گئے اور سکریٹری مولوی عبدالرحمن صاحب بی۔ اے۔ منتخب ہوئے۔ واضح ہو کہ یہ وہی الطاف حسین خاں ہے جو سی، آئی۔ ڈی کے انسپکٹر تھے اور حکومت نے انہیں مولانا کی نگرانی پر مامور کیا تھا۔ مولانا خود تو اس کمیٹی میں نہیں تھے لیکن ان کی سرپرستی اور رہنمائی میں انجمن چلتی رہی۔ یکم ستمبر 1917 کو انجمن اسلامیہ کی ایک میٹنگ مولوی عبدالکریم کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ مولانا بھی اس میں شریک ہوئے، انہوں نے ایک مختصر تقریر بھی کی۔ اس میٹنگ میں یہ فیصلہ لیا گیا کہ اس انجمن کے زیر اہتمام رانچی میں ایک مدرسہ قائم کیا جائے۔ 17 اکتوبر 1917ء کو انجمن اسلامیہ کی ایک اور میٹنگ مولوی عبدالکریم کی صدارت میں بمقام ڈورنڈہ ہوئی۔ اس موقع پر بھی مولانا آزاد شریک ہوئے۔ تقریباً دوسو روپیہ کی رقم چندہ کی شکل میں موصول ہوئی۔ ڈورنڈہ کے منشی ظہورالدین جو لکڑی کا کاروبار کرتے تھے،

انہوں نے دو ہزار روپیہ کی مالیت کا ایک مکان انجمن کو دینے کا وعدہ کیا۔ 21 اکتوبر 1917 کی میٹنگ میں چند اہم تجاویز منظور کیے گئے جن میں مدرسہ کی عمارت میں کام آنے والے تعمیری سامان کی خریداری کے لیے مجلس انتظامیہ کو پیشگی رقم کی فراہمی، عطیات کی فراہمی کے لیے کوشش کے علاوہ علاقہ کے لوگوں کے درمیان دینی شعور بیدار کرنے اور مدرسہ کی ضرورت کا احساس دلانے کے لیے ایک جلسے کے انعقاد کا فیصلہ شامل تھا۔ 16 نومبر کو کرایے کے ایک مکان میں درس و تدریس کا کام شروع کر دیا گیا سب سے پہلے جس طالب علم کا داخلہ لیا گیا وہ مولانا کے ہم نام آٹھ سالہ محی الدین احمد تھا جس کا داخلہ تیسرے درجے میں ہوا۔ اسی دن آٹھ اور طالب علموں کا داخلہ ہوا۔ مدرسہ کے لیے زمین کی فراہمی کا مسئلہ باتوں بات میں طے ہو گیا۔ اس کا ذکر ابوالحسنات نعمانی اس طرح کرتے ہیں:۔

> ''....... مورابادی سے منتقل ہو کر مولانا جامع مسجد سے قریب جس میں آج کل چاند مل کا پٹرول پمپ ہے۔ اس کوٹھی میں چلے آئے۔ قریب ہی میں منشی ظہور الحق صاحب کی زمین تھی۔ جن میں لکڑی کا کاروبار تھا۔ مولانا ٹہلتے ہوئے ایک روز وہاں پہنچ گئے۔ منشی جی نے اس زمین پر قیام مدرسہ کا ذکر کیا۔ مولانا بہت خوش ہوئے۔ گویا یہ ان کے دل کی آواز تھی جس کا اظہار ان کی زبانی ہوا۔'' [1]

24 فروری 1918 کو باضابطہ مدرسے کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس سلسلے میں عام اور آسان ہندی میں اشتہار بھی شائع ہوا۔ دعوتی کارڈ اردو اور انگریزی میں تقسیم کیے گئے۔ سنگ بنیاد کی تقریب کے موقع پر ایک عظیم الشان جلسے کا بھی اہتمام کیا گیا جس کی صدارت مہاراجا بہادر چھوٹا ناگپور (راتو مہاراجا) نے فرمائی اور انہوں نے ہی لوگوں کی درخواست پر مدرسہ کی عمارت کی بنیاد کا پہلا پتھر رکھا دس ہزار سے زیادہ افراد کا مجمع تھا۔ جلسے کا آغاز قرآن شریف کی تلاوت سے ہوا جس میں ایک حافظ صاحب نے مصری لہجے میں سورہ انبیاء کی چند آیتیں تلاوت

کی۔ سامعین پر محویت کا عالم طاری تھا۔ اس جلسے کی تفصیلی روئداد 6 مارچ اور 9 مارچ کے روز نامہ جمہور کلکتہ اور روز نامہ ہمدم لکھنؤ میں شائع ہوئی۔ اس رپورٹ کو کمیٹی کے ایماء سے انجمن اسلامیہ کے جوائنٹ سکریٹری مولوی ولایت حسین نے ترتیب دی تھی جو اس وقت سنٹ پال ہائی اسکول رانچی میں ہیڈ مولوی کے عہدے پر فائز تھے۔ ملاحظہ ہو رپورٹ کا تراشہ:۔

''کچھ عرصہ ہوا آپ کو رانچی کے مسلمانوں کی تعلیمی بیداری کی نسبت لکھ چکا ہوں۔ خدا نے اپنے فضل و کرم سے اس دور افتادہ ملک کی ہدایت و ارشاد کے لیے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کو بھیج دیا۔ آپ کی ڈیڑھ سال کی موجودگی نے نہ صرف رانچی شہر بلکہ تمام چھوٹا ناگپور ڈویژن میں ایک ایسی حیرت انگیز بیداری اور سچی اسلامی زندگی پیدا کر دی ہے جس کے تفصیلی حالات اگر بیان کیے جائیں تو لوگ مشکل سے باور کریں گے۔ قابل غور امر ہے کہ حضرت مولینا کا یہاں قیام کس حال میں ہوا؟ نظر بندی اور قید کی حالت میں، جبکہ وہ نہ تو آزادی کے ساتھ ہر شخص سے مل سکتے ہیں۔ نہ بغیر نگرانی کے کہیں جا سکتے ہیں، اور نہ بغیر پولیس کی ڈائری میں اپنا نام درج کرائے کوئی ان کے یہاں جا سکتا ہے، اور جبکہ ان کی ایک ایک حرکت پر ایسی سخت و شدید پابندیاں عاید ہیں کہ اگر ان میں ایک پابندی بھی ہم پر لگا دی جائے تو یقیناً ہم اپنی زندگی سے بیزار ہو جائیں۔ پھر علاوہ اس کے طرح طرح کے شدائد و مصائب ہیں جن کا سلسلہ برابر دو سال سے جاری ہے اور روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے۔ ہزاروں روپیہ کے کاروبار، گھربار، اور مال و اسباب کی بربادی اور تمام وسائل و معاش کا ایک قلم بند ہو جانا، کوئی معمولی بات نہیں۔ دوسرے نظر بندوں کی طرح گورنمنٹ سے بھی ان کو کوئی الاؤنس نہیں ملتا، اور طبیعت کی غیرت کا یہ حال ہے کہ کلکتہ کی انجمن اعانت نظر بندان

اسلام نے دومرتبہ ڈیڑھ ڈیڑھ سوروپیہ بھیجا تو اس کو بھی یہ لکھ کر واپس کر دیا کہ میری زندگی کا مقصد دوسروں کی خدمت کرنا ہے، دوسروں سے اپنی خدمت کرانا نہیں ہے۔ دوسال سے اپنا اسباب وسامانِ زندگی فروخت کر کے زندگی بسر کر رہے ہیں اور نہیں معلوم ان پر کیسے کیسے وقت گزر چکے ہیں؟ یہ ایک ایسی آزمائش ہے کہ جس میں اگر کوئی مبتلا ہوتا تو اس کو اپنی مصیبتوں کی فکر وغم ہی سے فرصت نہیں ملتی، دوسروں کی فکر کیا کرتا؟ لیکن نہیں معلوم خدا تعالیٰ نے حضرت مولینا کو کیسا صابر وشاکر دل دیا ہے کہ باوجود ان تمام مصائب کے، انہوں نے اپنے مقصد اصلی میں خدمت خلق اللہ کو ایک لمحہ کے لیے فراموش نہ فرمایا، اور ابتدائی دور رانچی سے لے کر اس وقت تک اپنا تمام وقت مسلمانوں کی ہدایت واصلاح اور دعوۃ وتبلیغ حق میں شب وروز کی دعوت وارشاد سے اس طرح بدل دی۔ ہندستان کے بڑے بڑے شہروں کو بھی وہ سعادت ایمان عمل نصیب نہیں جو رحمت الٰہی سے ہم باشندگان رانچی کو گھر بیٹھے حاصل ہو گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی پاک زندگی کا جوہر اس نظر بندی ہی میں کھلا۔ جو شخص قید اور نظر بندی کی حالت میں اپنی ساری مصیبتیں بھول کر خدا کے بندوں کی ایسی بے لوث اور انقلاب انگیز خدمت کر سکتا ہے اور ایک وحشی وکفرستان ملک کو سچا مسلمان بنا دے سکتا ہے، ظاہر ہے کہ وہ آزادی اور اطمینان کی حالت میں کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ حضرت مولانا نے قید میں رہ کر جو کچھ کیا ہے، کاش ہم آزادی کے چین اور راحت میں اس کا عشر وعشیر بھی کر سکیں۔ تمام رانچی میں ایک بھی شخص ایسا نہیں مل سکتا جن کو مولانا کی کسی طرح کی بھی خدمت کرنے کی عزت ملی ہو۔ لیکن شاید ہی ایسی کوئی جماعت ہوگی جس نے اس عرصہ میں ان سے طرح طرح کے فوائد اور

اعانتیں نہ حاصل کی ہوں۔ حتیٰ کہ یہاں کا ہر ہندو بھی ایک اوتار کی طرح ان کی عزت کرتا ہے اور اپنی ہر مشکل اور مصیبت میں ان کی طرف اسی طرح دوڑتا ہے جس طرح یہاں کا ہر مسلمان۔ وہ ہر شخص سے اس کی مصیبت پوچھتے ہیں اور اس کو حتی الوسع دور کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ہم لوگوں نے اس تمام مدت میں ایک مرتبہ بھی ان کی زبانی کوئی کلمہ غم و افسوس یا اپنی تکلیف و پریشانی کا نہیں سنا۔ حتیٰ کہ یہاں کسی کو بھی یہ نہیں معلوم کہ کن حالات میں ان کی زندگی بسر ہوتی ہے اور کیا کچھ ان پر گزرتی ہے۔

مدرسہ اسلامیہ، رانچی

یہ مولانا کی مسیحائی تھی جس نے یہاں کے مردہ دل مسلمانوں میں حرکت پیدا کر دی اور گزشتہ ماہ اگست میں انجمن اسلامیہ رانچی کی بنیاد پڑی، جس کی مختصر کیفیت اخبارات میں شائع ہو چکی ہے۔ انجمن نے اپنے قیام کے دوسرے مہینے میں لوگوں کو ایک اسلامی مدرسہ اور بورڈنگ ہاؤس کے قیام کی ضرورت پر توجہ دلائی اور مولانا کی دو چار تقریروں ہی نے ہر شخص کے اندر اس کے لیے جوش اور سرگرمی پیدا کر دی۔ الحمدللہ کہ جس کام کو بڑے بڑے دولت مند شہروں کی انجمنیں برسوں کی تجویزوں اور جلسوں سے بھی انجام نہیں دیتیں ، وہ رانچی کے نہایت غریب، بے مایہ اوران پڑھ مسلمانوں کی انجمن نے پانچ ماہ کی قلیل مدت میں پورا کر دکھایا۔ چنانچہ مدرسہ کے لیے زمین کا بھی انتظام ہو گیا، تعمیر کے لیے روپیہ بھی فراہم ہو گیا۔ انتظام و اہتمام کے لیے مستعد اور جانباز آدمی بھی مہیا ہو گئے اور نہایت تیزی کے ساتھ تعمیر کا کام بھی شروع ہو گیا۔ خدا کے فضل و کرم سے امید ہے کہ عنقریب مدرسہ کی عمارت مکمل ہو جائے گی اور بورڈنگ ہاؤس بھی طیار ہو جائے گا۔

یہ بھی واضح رہے کہ یہ پانچ ماہ مدرسہ کی عمارت کا کام شروع کرنے میں لگے۔ ورنہ انجمن نے اصلی کام تو تحریک کے ساتھ ہی شروع کردیا تھا۔ یعنی ایک کرایہ کے مکان میں مدرسہ اسلامیہ کا فتتاح ہو چکا ہے اور الحمدللہ روز بروز ترقی کررہا ہے۔ اس وقت تک سولڑ کے اس میں داخل ہو چکے ہیں اور پانچ مدرس، ایک جدید نصاب تعلیم کے مطابق (جو عربی وانگریزی دونوں پر حاوی ہے) تعلیم دے رہے ہیں۔

سنگ بنیاد رکھنے کا جلسہ

مدرسہ اسلامیہ کی سنگ بنیاد رکھنے کا عظیم الشان جلسہ گزشتہ اتوار کو زیر صدارت مہاراجہ بہادر چھوٹا ناگپور منعقد ہوا۔ میں اس جلسہ کا مختصر حال آپ کو لکھتا ہوں، کیوں کہ یہ ایک عجیب وغریب اور ناقابل فراموش منظر تھا جو اس سرزمین میں سب سے پہلے نظر آیا۔ اور اگر چہ حضرت مولانا کے قیام کی برکتیں شب وروز رانچی کی درودیوار سے ظاہر ہورہی ہیں مگر کسی کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی جو اس جلسہ سے آشکارا ہوگئی۔ اس جلسہ نے ہر شخص کو دکھلا دیا کہ ان کے ڈیڑھ سال کے قیام نے رانچی کو کیا سے کیا کردیا؟ جب سے رانچی میں گورنمنٹ بہار کا صدر مقام قرار پایا ہے، یہاں اکثر سرکاری جلسے اور دربار ہوتے رہتے ہیں مگر آج تک کوئی قومی مجمع اس عظمت وشان کے ساتھ منعقد نہیں ہوا تھا۔

جلسہ کا اعلان ایک ہفتہ پہلے اردو اور انگریزی کارڈ اور ہندی اشتہار عام کے ذریعہ کردیا گیا تھا۔ اور دور دور خبر پہنچ چکی تھی۔ مدرسہ کی زمین پر ایک نہایت وسیع وخوشنما پنڈال بنایا گیا تھا جس کا طول پلیٹ فارم کے علاوہ سوفٹ اور عروض ساٹھ ستر فٹ سے کم نہ ہوگا۔ سڑک کے رخ پر ایک نہایت شاندار

دروازہ لگایا گیا تھا اور آنے والوں کی رہنمائی کے لیے ایک اور استقبالی دروازہ پوسٹ آفس کے سامنے چوراہے پر بھی کھڑا کیا گیا تھا۔ تاریخ جلسہ کی صبح ہی سے لوگ پہنچنا شروع ہو گئے اور شہر میں تو اس دن بجز میدان جلسہ کے اور ہر طرف سناٹا چھا گیا تھا۔ لیکن دو بجتے بجتے تمام پنڈال بھر گیا اور پھر لوگوں کی وہ کثرت ہوئی کہ میدان جلسہ سے لے کر چوراہے تک بجز آدمیوں کے سروں کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ بڑے بڑے شہروں میں کانفرنسوں اور لیگوں کے لیے شاید ہی ایسا عظیم الشان جلسہ ہوا ہو۔ پنڈال کی کرسیوں ، بینچوں اور درمیان کے فرش کی نشست گاہ میں کم از کم دس ہزار آدمیوں کا مجمع ہو گیا۔

سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ شہر کے تمام ہندو جماعت نے (اور رانچی میں با اعتبار تمول عزت دینوی کے صرف ہندو سربرآوردہ ہیں) اس شوق و ذوق اور ہمدردی سے جلسہ میں شرکت کی کہ ان کا جوش مسلمانوں سے کہیں زیادہ فائق نظر آتا تھا۔ شہر کے تمام بنگالی ، کائستھ ، مارواڑی اور ویسے ہندو جماعتوں کے لوگ جلسہ میں سب سے پہلے آنے والے اور سب سے زیادہ دلچسپی لینے والے تھے، اور اگر چہ سررابندرناتھ ٹیگور کے یہاں اسی دن برہموسماج کی سالگرہ کا جلسہ تھا، لیکن جب برہمو بنگالی جماعت کو اس جلسہ کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے خود بخود اپنے جلسہ کا پروگرام بدل دیا اور اس جلسے کو اپنی قومی و مذہبی جلسے پر ترجیح دی۔ سرکاری حکام میں سی آنریبل مسٹر فوکس، ڈائرکٹر تعلیم، بہار اینڈ اڑیسہ نے معذرت کی چٹھی لکھی تھی لیکن ان کے علاوہ عدالتوں اور سرکاری دفاتر کے حکام اور مقامی یوروپین تاجر زمینداران چائے اور انگلش و رومن مشنوں کا اسٹاف سب موجود تھے۔

رانچی جیسے کوڑہ مقام پر ایسے عظیم الشان مجمع کا منعقد ہونا اور یہاں کے غریب اور کسمپرس مسلمانوں کی انجمن کی ایک دعوت پر تمام ضلع کا جمع ہو جانا، اگر چہ نہایت تعجب انگیز ہے لیکن جیسا کہ آنریبل مسٹر اس۔ کے۔ سہائے نے جلسہ میں کہا 'اس تمام مجمع کو دراصل ایک دوسری ہی چیز کھینچ لائی تھی اور وہ صرف مولینا ابوالکلام کی کشش تھی۔' جس دن سے مولینا یہاں تشریف لائے ہیں، ان کے تمام مواعظ و ارشادات مسجد یا بعض دیگر مساجد میں ہوتے ہیں۔ انجمن کے جلسے بھی جس قدر ہوئے مسجدوں میں ہی ہوئے۔ اگر چہ بہت سے ہندو شائقین کو ان کی کشش مسجدوں کی مجلسوں خصوصاً درس قرآن شریف میں کھینچ لاتی تھی، تاہم یہ ظاہر ہے کہ غیر مسلم اشخاص کو مسجد میں آتے ہوئے ایک طرح کی رکاوٹ ہوتی ہے اور وہ لوگ اس کو مسلمانوں کی ایک مخصوص مذہبی جگہ سمجھتے ہیں۔ پس تمام غیر مسلم جماعت مشتاق تھی کہ مسجد کے علاوہ کسی عام موقع پر مولانا کی تقریر ہو اور ان کو سننے کا موقع ملے، اور اطراف وجوانب سے تو صدہا آدمی اسی شوق میں آئے تھے کہ ایک نظر ان کو دیکھ ہی لیں۔ صرف یہی کشش تھی، جس نے ہزاروں آدمیوں کو جمع کر دیا، ورنہ کہاں رانچی اور کہاں ایسے جلسے؟

جلسہ کا آغاز قرآن شریف کی تلاوت سے ہوا۔ ایک حافظ صاحب نے سورہ انبیاء کا آخری رکوع مصری لہجہ میں تلاوت کیا۔ ان الذین سبقت لهم منا الحسنیٰ اولانک عنها مبعدون اور اس وقت تمام جلسہ پر ایک عجیب عالم محویت طاری ہو گیا۔ کیا ہندو کیا مسلمان سب کے سب اس کلام پاک کی صدا میں محو تھے۔ اس کے بعد صدر مجلس کا انتخاب ہوا اور ان کی مختصر تقریر کے بعد مولوی محمد کریم صاحب بی۔ اے نے انجمن کی رپورٹ

انگریزی میں پڑھ کر سنائی جس میں مسلمانان رانچی کی دردانگیز تعلیمی واخلاقی پستی کے حالات بالتفصیل بیان کیے گئے تھے اور انجمن کے قیام اور مدرسہ اسلامیہ کی تحریک اور فراہم شدہ سرمایہ کی تفصیلات تھیں۔ آخر میں مہاراجہ بہادر سے درخواست تھی کہ مدرسہ کا بنیادی پتھر نصب فرمائیں اور مولوی عبدالرحمٰن صاحب بی۔اے سکریٹری انجمن نے اس کا اردو ترجمہ حاضرین کو سنایا۔اس کے بعد سنگ بنیاد رکھنے کی رسم عمل میں آئی۔سنگ بنیاد رکھنے کے بعد پھر کارروائی مطبوعہ پروگرام کے مطابق شروع ہوئی۔سب سے پہلے آنریبل مسٹرایس کے سہائے ممبر کونسل بہار نے تقریر کی اور ارکان انجمن کا تمام ہندوؤں کی طرف سے شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے اس محبت اور اخلاق سے ہندو بھائیوں کو بھی مدعو کیا اور ان کے دلوں میں محبت کا ایسا نقش ثبت کر دیا جو کبھی محو نہ ہوا۔انہوں نے کہا کہ' آج مسلمانان رانچی نے اپنی قومی زندگی کا ایسا موثر اور شاندار ثبوت دے کر ثابت کر دیا کہ ہم ہندوؤں کو بھی ان سے بہت کچھ سیکھنا باقی ہے۔ جو کام آج تک یہاں کسی ہم ہندوؤں نے باوجود دولت و کثرت اور تعلیم کے انجام نہیں دیا، اس کو آپ لوگ غریب اور بے مایہ ہو کر اس شان و کامیابی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔آج آپ کے اس جلسے اور اس عظیم الشان انتظام و سرگرمی کو دیکھ کر ہم لوگوں کے دلوں پر جو اثر ہوا، اس کے بیان کرنے کے لیے مجھ کو الفاظ نہیں ملتے، ان کے بعد مسٹر کالی پدو بوس ایم۔اے پلیڈر (جو رانچی کے سب سے بڑے بنگالی زمیندار اور وکیل ہیں) کھڑے ہوئے۔انہوں نے کہا' میں تہہ دل سے مسلمانان رانچی کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آج انہوں نے اپنی زندگی کا ایسا ثبوت دکھلایا جو کبھی ایسا مجمع میری نظر سے نہیں گزرا۔ہم ہندوؤں کو آپ لوگوں کی تقلید کرنی چاہیے۔'

آخر میں انہوں نے کہا کہ 'میں نہیں چاہتا کہ اس اثر کو جو آج کا جلسہ دیکھ کر میرے دل پر ہوا ہے، صرف زبان تک محدود رکھوں کیوں کہ اصلی چیز عملی ہمدردی ہے۔ میں آج اعلان کرتا ہوں کہ جس قسم کی خدمت آپ مجھ سے لیں میں اس کے لیے دل و جان سے تیار ہوں۔'

'رائے صاحب' مسٹر اپندر ناتھ، سکریٹری کواپریٹیو سوسائٹی نے کہا کہ 'ہم چاہتے ہیں کہ یہ مدرسہ تمام ملک میں ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی ایک مجسم یادگار ہو، ہم ہندوؤں کو کوشش کرنا چاہیے کہ اگر اس کی تعمیر میں مسلمانوں کا ایک پیسہ لگے تو ہمارا دو پیسہ۔' یہ کہہ کر انہوں نے 200 روپیہ چندہ میں پیش کیا۔

رائے بہادر مسٹر ٹھاکر داس بی۔اے نے (جو رانچی کے بہت بڑے سوداگر ہیں) کہا کہ 'سکریٹری صاحب نے اپنی رپورٹ میں بیان کیا ہے کہ مدرسہ کے لیے ابھی انجمن کو دس ہزار روپے کی اور ضرورت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر مولینا صاحب جیسے مہاتما ہم میں موجود ہیں تو ہم کو روپیہ کی کیا پرواہ ہے؟ یہ وہ لوگ ہیں جو مٹی کو سونا بنا دے سکتے ہیں۔ روپیہ کی کچھ فکر نہ کیجئے۔ آپ کی رانچی کو تو وہ خزانہ مل گیا ہے کہ ایک مدرسہ کی کیا حقیقت ہے۔ اس سے آپ چاہیں تو مدرسوں سے بنا لے سکتے ہیں'۔ آخر میں کہا کہ میں اپنی جانب سے تین سو روپیہ کی رقم پیش کرتا ہوں۔

ان کے بعد مسٹر جگت پال سہائے نے تقریر کی جو یہاں کے ایک نہایت ہی روشن خیال اور غیر متعصب پرانے وکیل ہیں۔ انہوں نے کہا کہ 'مولینا صاحب کی نظر بندی کی وجہ سے آج تمام ہندوستان دکھی ہو رہا ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ اس واقعہ سے ہم رانچی کے باشندوں کی تو سوئی قسمت جاگ اٹھی۔ ورنہ کہاں مولینا اور کہاں رانچی کی غریب سرزمین؟ خدا کا کوئی کام

حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔اس نے ہم لوگوں کو بیدار کر دینے اور برکت بخشنے کے لیے ان کو یہاں بھیج دیا۔اگر ہمارے ملک میں ایسے دو چار آدمی بھی پیدا ہو جائیں تو اس کی ساری مصیبتیں دور ہو جائیں۔ایسے آدمی اس سنسار میں سیکڑوں برس کے بعد کہیں پیدا ہوتے ہیں۔ہم لوگوں کو آزادی کے چین اور راحت میں اپنے بھائیوں کی کچھ فکر نہیں۔ان کو نظر بندی کی حالت میں بھی اپنے بھائیوں کی رکھشا کی ایسی لو لگی ہوئی ہے کہ رات دن اپنا اسی میں بسر کر رہے ہیں۔یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر زبان سے کچھ بھی نہ کہیں تو صرف ان کو ایک نظر دیکھ لینا ہی آدمی کو نیک بنا دیتا ہے۔' آخر میں انہوں نے کہا کہ 'جو لوگ کہتے ہیں کہ ہندو مسلمانوں میں اتفاق نہیں ہو سکتا۔اگر وہ اس وقت ہوتے تو میں ان سے پوچھتا کہ اس جلسے میں ہندوؤں کو مسلمانوں سے الگ کر کے پہچان لو،تمام ہندو مسلمان کس طرح ملے جلے یہاں بیٹھے ہیں کہ پہچان نہیں پڑتی۔سچ ہے کہ نہ ہندوؤں میں ایسے سچے رہنما ہیں جو مسلمانوں کا دل اپنی مٹھی میں لیں او نہ مسلمانوں میں ایسے پیشوا ہیں جو ہندوؤں کے دلوں میں اپنا گھر بنالیں۔اگر مولینا صاحب جیسے سچائی اور محبت کے اوتار ملک میں پیدا ہو جائیں تو وہ ایک دن میں ہندو مسلمانوں کو ایک کر کے دکھلا دیں۔آپ مسلمان لوگ ان کی جس قدر عزت کرتے ہیں، یقین کیجئے ہم لوگوں کے دلوں میں اس سے دوگنی ان کی محبت اور عظمت ہے۔'

مسٹر موصوف دیر تک اسی طرح کی پر اثر اور مخلصانہ خیالات ظاہر کرتے رہے اور چوں کہ سچے جوش دل سے تقریر کر رہے تھے اس لیے ان کا ہر جملہ تاثیر و کیفیت میں ڈوبا ہوا تھا۔بالآخر انہوں نے اپنی تقریر کو اس شعر پر ختم کیا۔

در حیر تم کہ تفرقہ کفر و دین چہ است

از یک چراغ کعبہ و بت خانہ روشن است

ان کے بعد راجہ صاحب سلطان پور (اودھ) نے (جو بہ غرض تبدیل آب وہوا یہاں مقیم ہیں) ایک مختصر تقریر میں ارکان انجمن کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اگر چہ میں یہاں مقیم ہوں تاہم آپ صاحبوں نے مجھ کو بھی فراموش نہ کیا اور ایسے شاندار جلسہ میں شرکت کا موقع دیا۔ میں آج کے جلسہ اور اس کے اثر کو ہمیشہ یادرکھوں گا۔'

جب تمام تقریریں ہو چکیں تو حضرت مولینا ابوالکلام آزاد کھڑے ہوئے اور ان کے کھڑے ہوتے ہی تمام جلسہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔ ان کی بلند اور گرجتی ہوئی آواز جب بلند ہوئی تو تمام حاضرین کے دل اضطراب سے ہل گئے اور محویت اور بیخودی کا ایک ایسا عجیب عالم سب پر طاری ہو گیا جس کی کیفیت بیان کرنے کے لیے مجھ کو الفاظ نہیں مل سکتے۔ کیا ہندو، کیا مسلمان اور کیا عیسائی؟ سب محو سرشار تھے اور بلا ادنیٰ مبالغہ کے لکھتا ہوں کہ کوئی بھی اپنے ہوش میں نہ تھا۔ تقریر کیا تھی؟ ایک دریا تھا کہ جب تک رکا تھا، رکا ہوا تھا۔ لیکن جب روانی پر آ گیا تو ایک سیلاب تھا جس کے لیے کوئی روک نہ تھی۔

افسوس کہ یہ مضمون بہت طولانی ہو گیا ہے، اس لیے مولینا کی تقریر کا خلاصہ درج نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں جو مطالب بیان کیے تھے۔ وہ اس لائق ہیں کہ ہندوستان کے تمام ہندو مسلمان ان کو اپنا دستور العمل بنائیں۔ ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات، ملکی خدمت کی اصلی راہ، خدا کا عالمگیر قانون محبت اور اس کی نسبت قرآن کا پیام، ہندستان کی موجودہ حالت کے متعلق مسلمانوں کا اسلامی فرض جو قرآن نے بتلایا ہے اور اسی طرح کے تمام اہم مطالب کو انہوں نے بالتفصیل بیان کیا تھا۔ ان مطالب کے بعد وہ

انجمن کی جانب متوجہ ہوئے اور بالتفصیل بتلایا کہ انجمن کے مقاصد کیا کیا ہیں اور وہ کس قسم کی درسگاہ قائم کرنا چاہتی ہے؟ اور اس درسگاہ سے کس طرح کے آدمی تیار ہو کر نکلیں گے؟ انہوں نے قرآن کی مختلف آیات و احکام پڑھ کر سنائے اور ایک سچے مسلمان جماعت کی تصویر کھینچ کر دکھلایا کہ قرآن شریف دنیا میں کیسے انسان پیدا کرنا چاہتا ہے۔ پھر فرمایا کہ ایسے انسانوں کے پیدا کرنے کا کام کوئی محدود اور مخصوص قومی کام نہیں ہے بلکہ ایک عالمگیر انسانی خدمت ہے۔ اگر ایک ہندو، ہندوستان کی ملکی ترقی کے لیے بے قرار ہے، اگر ایشیائی ایشیا کی عام تنزل و تباہی کو اقبال و کامرانی سے بدل دینا چاہتا ہے، اگر ایک مسیحی، گمشدہ مسیحیت کو پھر دوبارہ دنیا میں واپس لانا چاہتا ہے، اگر ایک یوروپین موجودہ تمدن کی اس خونخوار اور درندگی سے عاجز آ گیا ہے، جس نے آج یوروپ کے میدانوں کو خون کے سیلابوں سے بھر دیا ہے، تو ان سب کے لیے کامیابی اور مراد کی صرف ایک ہی راہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو سچا مسلمان بننے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ اس ایک کام کے انجام پاتے ہی دنیا کے تمام کام انجام پا جائیں گے۔'

مولینا کی تقریر کی تاثیر اور کیفیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب وہ تقریر کر کے بیٹھے تو عرصہ تک تمام جلسہ میں بالکل سناٹا چھایا رہا اور بہت دیر کے بعد لوگ اپنے ہوش و حواس میں واپس آئے۔ میں آئندہ آپ کو ان کی تقریر کا خلاصہ بھیجوں گا۔

اس کے بعد انہوں نے چندہ کی تحریک کی اور تین ہزار چار سو روپیہ وصول ہو گیا۔ زیور اور دیگر اشیاء اس کے علاوہ ہیں جو چند مخلص اور اسلام پرست عورتوں نے مدرسہ کے جلسہ میں بھیجی تھیں۔

جلسے کے دوسرے ہی دن مدرسہ کی تعمیر کا کام شروع ہوگیا۔ امید ہے کہ دو تین ماہ کے اندر عمارت مکمل ہو جائے گی۔ انجمن نے ارادہ کرلیا ہے کہ یکم مارچ سے شہر کے تمام محلوں میں نائٹ اسکول بھی جاری کر دیے جائیں ۔''

(خاکسار، ولایت حسین،)

جوائنٹ سکریٹری، انجمن اسلامیہ رانچی،

و ہیڈ مولوی سینٹ پالس ہائی اسکول، رانچی

روز نامہ جمہور (کلکتہ، 3 مارچ، 1918ء) اور روز نامہ ہمدم (لکھنؤ، 6 مارچ 1918ء)

یہ جلسہ کیا تھا؟ ہندو مسلم اتحاد کا ایک حسین سنگم تھا اور مولانا آزاد کے تدبر اور سیکولر کردار کا جیتا جاگتا ثبوت۔

مدرسہ کی عمارت کی تعمیر کی رقوم کی فراہمی ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ اسے کس طرح حل کیا گیا۔ اس سلسلے میں ابوالحسنات نعمانی یوں رقمطراز ہیں:۔

'' مولانا نے مدرسہ کی تحریک کی شہر، دیہات اور کلکتہ سے کافی رقوم موصول ہوئے مگر پھر بھی عمارت پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی۔ اسی دوران میں مولانا کا پریس کلکتہ میں فروخت ہوا اور مولانا نے اس کے روپیے مدرسے کی عمارت میں صرف کر دیے۔ اس کی تحقیق نہ ہوسکی کہ مولانا نے کتنے روپے خرچ کیے۔ مگر متحقق ہے کہ اوپر کی عمارت مولانا کے روپیے سے بنی ہیں۔ مولانا نے اس کو ظاہر کرنے کی بھی کوشش نہیں کی مگر بات چھپی نہیں۔ الطاف حسین خان مرحوم ریٹائرڈ انسپکٹر تعمیری امور میں منتظم اعلیٰ کی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے اس دوران میں اور بعد میں بار ہا لوگوں سے تذکرہ کیا ہے.....'' ۲

انجمن اسلامیہ کا پہلا سالانہ جلسہ اور مدرسہ اسلامیہ کا افتتاح:۔ 2 اکتوبر 1918 کو انجمن اسلامیہ کے عہدیداران کی ایک اہم میٹنگ مدرسے کی نوتعمیر عمارت میں ہوئی۔ مولانا بھی

اس میٹنگ میں شریک ہوئے گرچہ یہ نظر بندی کے شرائط کے خلاف تھی۔ یہ میٹنگ اس لیے بلائی گئی تھی کہ مدرسے کے افتتاح کے لیے تاریخ کا تعین کرلیا جائے۔ میٹنگ میں یہ فیصلہ لیا گیا کہ مدرسہ کا افتتاح اور جلسے کا انعقاد 3 نومبر تا5 نومبر متعین کیا جائے۔ لہٰذا انجمن اسلامیہ کا پہلا سالانہ جلسہ اور مدرسے کا افتتاح 3 نومبر 1918 کو منعقد ہوا۔ اس موقع پر جناب محمد اسمٰعیل صاحب محمدی کلکتہ نے جلسے کی صدارت فرمائی اور خطبۂ صدارت بھی پیش کیا۔ اس جلسے میں شرکت کرنے والے زعمائے ملت کی ایک طویل فہرست ہے جس میں پٹنہ سے شاہ سلیمان پھلواروی، عبدالعزیز بیرسٹرایٹ لا) کلکتہ سے حاجی غنی لطیف، نور محمد زکریا، داؤد احمد، فضل الدین احمد، مولوی اکرم سہسرام سے مولانا قادر بخش وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ رانچی سے شریک ہونے والی اہم شخصیتوں میں رائے بہادر رادھا گوبند چودھری، کالی پدو بوس، رائے صاحب، امر یندر ناتھ بنرجی، ٹھاکر داس، بابو گورکھ ناتھ، آنریبل مسٹر لیس، سہائے کے علاوہ کلکتہ کے بابو ہن چند وغیرہ خاص طور پر اہم ہیں۔ اس موقع پر کئی حضرات نے تقریریں بھی کیں۔ مولانا نے بھی جلسے کو خطاب کیا اور آنے والے مہمانانِ کرام کا شکریہ ادا کیا۔ مدرسے کی تعمیر کے تئیں الطاف حسین خان کی دلچسپیوں، ایثار وقربانی، انتھک محنت کے اعتراف میں اس موقع پر انہیں میڈل سے نوازا گیا۔ جناب محمد اسمٰعیل صاحب محمدی نے جو خطبۂ صدارت پیش کیا تھا اسے البلاغ پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ ہاؤس رپن، لین سے شائع کرالیا گیا تھا جسے شرکاء میں تقسیم بھی کیا گیا۔ اس خطبۂ صدارت کو تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ پورے متن کو یہاں نقل کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا۔

تقریر صدارت

اجلاس سالانہ انجمن اسلامیہ، رانچی

از: جناب محمد اسمٰعیل صاحب، محمدی کلکتہ، حضرت ارکان انجمن و بزرگان رانچی!

آپ نے اپنی قابل عزت انجمن کے پہلے سالانہ جلسے کی صدارت کیلئے مجھ کو منتخب

فرمایا۔اوراس طرح موقع دیا کہ ایک ایسے شاندار مجمع کے سامنے جو قوم کے لائق سے لائق اور قابل سے قابل افراد سے مرکب، اور خدمات قومی کی یادگار مثالوں سے معمور ہے، اپنے ناچیز خیالات پیش کروں۔ جب میں اپنی ان توقعات کو خیال کرتا ہوں جو قدرتی طور اس مقام سے وابستہ ہوں گی، اور پھر اپنی بے بضاعتی اور ہیچ مدانی کو دیکھتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ کس چیز کو اس انتخاب کا باعث قرار دوں؟ اگر ایسی عظیم الشان مجالس کی صدارت کے لئے شرط اول علم ہے، تو میں دیکھتا ہوں کہ اس اعتبار سے آپ کا تاریخی صوبہ ہندوستان کے کسی صوبے سے پیچھے نہیں ہے، اور ایسے اصحاب علم وفضیلت یہاں موجود ہیں جن کی موجودگی میں اپنے آپ کو کسی طرح اس مقام کا مستحق نہیں سمجھ سکتا۔ اور اگر اس کے لئے وہ چیز شرط ہے جو فی الحقیقت عالم سے بھی بڑھ کر اور اس کا حاصل نتیجہ ہے، یعنی عمل اور خدمت قوم وملک، تو اس لحاظ سے بھی آپ کے صوبے کا پلہ ہندوستان کے کسی صوبے سے گھٹا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ یہاں بعض ایسے بزرگان قوم موجود ہیں جن کی خدمت تمام ہندوستان میں قدر و قیمت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے، اور صرف قوم ہی نہیں بلکہ تمام ملک ان کی خدمات کی عزت کو محسوس کرتا ہے۔ ایسے بزرگوں کی موجودگی میں مجھ ایسے بے بضاعت و بے مایہ شخص کا صدر ہونا یقیناً ایک طرح کی صریح جسارت ہے۔

حضرات! اس مقام کے استحقاق واہلیت کے لئے اور وجوہ وشرائط بھی ہو سکتے ہیں، لیکن میں نے تو کسی باعث وسبب کو بھی نہیں دیکھا جو اصحاب شہرت وفضیلت اور خدام ملت کی موجودگی میں میرے انتخاب کی سفارش کر سکیں۔ آپ نے موتیوں کے ڈھیر کو چھوڑ کر کنکر کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے، اور جب کہ آپ کا ہاتھ لعل والماس کو چن سکتا تھا تو آپ نے کانچ کے ٹکڑوں کو پسند کیا۔ آپ نے ان بلندیوں کی طرف نظر نہ اٹھائی جو پیشتر سے بلند ہیں، بلکہ ان پستیوں اور خاکساریوں کو اپنی نظر مہر سے دیکھا جن کو آپ کا لطف وکرم بلاشبہ بے مائیگی کی پستی سے اٹھا کر اوج عزت وقبول پر پہنچا سکتا ہے۔ آپ نے ان دامنوں کو زحمت تشریف نہ دی جو شہرت وفضیلت کے زر و جواہر سے بھرپور آتے اور آپ کو اپنے فیضان علم ولیاقت سے مالا مال کر جاتے

۔ بلکہ آپ نے ایک ایسے تہی دست و بے مایہ کو دعوت التفات دی جو اپنا خالی دامن لے کر آپ کے پاس آیا ہے، جس میں نہ تو علم وفضیلت کے جواہر ہیں، نہ شہرت و ناموری کے موتی، البتہ اگر آپ چاہیں تو اپنے لطف محبت کے پھولوں سے اسے بھر دے سکتے ہیں، اور گو وہ خالی دامن آپ تک پہنچا ہے۔ لیکن مالا مال واپس جا سکتا ہے!

حضرات! جب کہ صورت حال یہ ہے تو میرے لئے اس کے سوا کیا چارہ ہے کہ آپ کے اس انتخاب کو محض آپ کے حسن ظن اور شیوۂ لطف وکرم کا نتیجہ قرار دوں، اور اس عزت کے لئے اپنے دل سے سچے اعتراف اور زیادہ سے زیادہ شکر گذاری و ممنونیت کو پیش کر دوں۔

حضرات! آپ کے اس انتخاب کا اصلی باعث تو صرف آپ کے حسن ظن اور لطف و کرم کو یقین کرتا ہوں کہ شاید آپ نے اپنے سالانہ جلسے کی صدارت کی عزت کلکتہ کے ایک باشندہ کو دے کر اس قدیم رشتہ وتعلق کو تازہ کرنا چاہا ہو جو آپ کے خوش موسم شہر کا ایک عرصہ دراز تک صوبۂ بنگال سے رہ چکا ہے۔ آپ کا یہ دلچسپ علاقہ خود صوبۂ بہار کی طرح بنگال ہی کا ایک حصہ تھا اور ملک کی انتظامی تقسیم میں اس کا شمار بنگال ہی کی سرزمین میں کیا جاتا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں جب مشرقی ہند کی از سر نو تقسیم ہوئی تو بہار کا حصہ مستقل ایک صوبے کی شکل میں علاحدہ کر دیا گیا اور اڑیسہ کے ساتھ چھوٹا ناگپور کا علاقہ بھی بہار میں شامل کر دیا گیا۔ لیکن گو آپ کا علاقہ ملکی تقسیم کے نقشے میں ہم سے جدا کر دیا گیا ہے، مگر قومی تعلقات کے عالمگیر نقشے میں وہ اب تک ہم سے جڑا ہوا ہے۔ اور یہ جدائی دل کے رابطہ و یگانگت پر کچھ اثر نہیں ڈال سکتی۔ بلا شبہ آپ نے اس شاندار جلسے میں اپنے برادران بنگال کو مدعو کر کے اور کلکتہ کے ایک باشندے کو صدارت کی عزت دے کر اس پرانے رشتے کو از سر نو استوار کر دیا ہے۔

حضرات! اگر اس انتخاب کی یہ وجہ نہیں ہے، تو شاید اس کا یہ سبب ہو کہ چند سالوں سے آپ باشندگان رانچی اور سرزمین بنگال میں ایک اور نیا رشتہ بھی پیدا ہو گیا ہے اور جو ان تمام تعلقات سے جو اب تک ان علاقوں میں رہ چکے ہیں، کہیں زیادہ مؤثر و نمایاں ہے۔ تقریباً تین

سال سے کلکتہ کی ایک نہایت قیمتی دولت آپ کے حصے میں آ گئی ہے، اور سرزمین بنگال کے ساتھ تمام ملک بھی اس کی برکتوں اور سعادتوں سے محروم ہوگیا ہے۔ اگر اس دولت روحانی کی نسبت کو صرف صوبۂ بنگال سے مخصوص کر دینا ہندوستان کے دیگر حصوں کے حق تلفی ہوگی۔ کیونکہ اس کے فیضان و برکات سے یکساں طور پر تمام ہندوستان بلکہ تمام عالم اسلام مستفید ہو رہا تھا، تاہم بنگال اور علی الخصوص کلکتہ کے اس شرف سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اس کے قرب و مقام ہونے کی عزت اسی کو حاصل تھی، آپ یقین کیجیئے کہ یہ وہ دولت و سعادت ہے جس کے ملنے پر تمام ہندوستان کو آج آپ پر رشک ہے، اور آپ کی خوش قسمتی اور تقدیر الٰہی کی کرشمہ سازی پر حیران و متعجب ہو رہا ہے۔ جب کہ تمام ملک اپنی محرومی پر غمگین ہوا تو آپ کے لئے اپنی خوش قسمتی پر فخر و ناز کرنے کا خود بخود سامان ہوگیا۔ جس باد سموم کے جھونکوں میں تمام ملک کے لئے خزاں کی بربادیاں تھیں، وہی آپ کے لئے بہار کی تازگی اور شادابی ہوگئی۔ یہ قدرت الٰہی کے وہ کرشمے ہیں جن کو انسان دیکھ کر متحیر ہو سکتا ہے لیکن ان کے اسباب و مصالح کو نہیں پا سکتا۔ کتنے ہی حوادث و تغیرات ہیں جن میں بظاہر کوتاہ نظر انسان صرف مایوسی و غمگینی ہی دیکھتا ہے مگر فی الحقیقت انہی میں بڑی بڑی امیدیں اور سعادتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ اور کتنے ہی سیلاب حوادث و انقلابات ہیں جو اگر ایک طرف سرسبز کھیتوں کو پامال کر جاتے ہیں، تو دوسری طرف بہت سی خشک اور بنجر زمینوں کو سیراب بھی کر دیتے ہیں۔

حضرات یہ بھی ایک سیلاب حوادث تھا جو ہماری سرزمین پر آیا اور آ کر اس نے میدانی زمینوں کو پامال کیا، تو آپ کی رانچی کی بلند اور پہاڑی سطح تک بلند ہو کر اسکو سیراب و سرسبز بھی کر دیا۔ اب سے دو سال پہلے کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ خیال نہ گذر ہوگا کہ موجودہ عہد کے غمگین و افسوسناک واقعات سے آپ کے لئے ایک ایسا پر مسرت و نشاط نتیجہ نکلے گا۔ اور وہ غم انگیز واقعہ جس میں مایوسی و حسرت ہی نظر آتی تھی، ایک دور افتادہ حصہ ملک میں اصلاح و ترقی کا ایک عظیم الشان دور پیدا کر دے گا! کس کے خواب و خیال میں بھی یہ خطرہ گذر سکتا تھا کہ

ہندوستان کے بڑے بڑے ترقی یافتہ شہر جس دعوتِ حق سے محروم ہوگئے ہیں ، اس کی صدا نا گپور کی پہاڑیوں سے بلند ہوگی، اور رانچی سے ہم باشندگان کلکتہ و بہار کے پاس یہ پیام پہنچے گا کہ قومی تعلیم و ترقی کے ایک سب سے زیادہ بہتر و کامل کام میں آ کر شریک ہوں، اور اس کو اپنی اپنی آبادیوں کے لئے ایک صحیح اور کامل نمونہ تصور کریں؟

حضرات! عجب نہیں کہ آپ نے اپنے برادران بنگال کو خاص طور پر اس لئے یاد کیا ہوتا کہ وہ اپنی آنکھوں سے اپنی محرومی اور آپ کی خوش قسمتی کا منظر دیکھ لیں۔ اگر اس انتخاب کی یہی وجہ ہے تو اے برادران رانچی! میں آپ کو نہ صرف بنگال بلکہ تمام ہندوستان کی طرف سے مبارک باد دیتا ہوں کہ انقلاب و تغیر کو جو بہتر سے بہتر جلوہ آپ ہم کو دکھلا سکتے تھے، آپ نے دکھلا دیا، اور آپ نے آج کے دن ثابت کر دیا کہ قدرت نے ہم سے چھین کر جو دولت و سعادت آپ کو عطا فرمائی تھی، الحمد للہ، آپ نے اس کی قدر و قیمت پہچاننے میں غفلت نہ کی، اور اس کے فیض و برکت سے آپ پوری طرح بہرہ مند ہوئے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج کا شاندار و موثر دن آپ کی سرزمین پر طلوع ہوا ہے، اور بڑے بڑے شہروں کی نظریں عزت و احترام کے ساتھ آپ کی جانب اٹھنے لگی ہیں۔ ہم اپنی آنکھوں سے آج اصلاح و ترقی کے ایک ایسے سرچشمے کو آپ کی سنگلاخ سرزمین میں اُبلتا ہوا دیکھ رہے ہیں جو انشاء اللہ نہ صرف اپنے قرب و جوار کو، بلکہ تمام ملک کو سیراب کرے گا۔

حضرات! آپ کا یہ علاقہ اب صوبۂ بہار میں داخل ہے اور گو آپ کا شہر باوجود اپنی بہت سی خوبیوں اور مناسبتوں کے اس کا صدر مقام قرار نہ ہوسکا تاہم صوبے کے گرمائی صدر مقام کی حیثیت ضرور رکھتا ہے اور اس وقت تک سرکاری دفتر کی مرکزیت اسی کو حاصل ہے۔ اس لئے بیجا نہ ہوگا اگر سب سے پہلے میں آپ کے صوبے کی نسبت چند کلمات عرض کروں۔ آپ کا صوبہ اپنی عظیم الشان تاریخی روایات اور قدیمی عظمت کے اعتبار سے ہندوستان کی ایک ایسی سرزمین ہے جو تاریخ ہند کے ہر دور میں کسی نہ کسی حیثیت سے برابر ممتاز رہی ہے۔ اب سے تین ہزار برس

بیشتر کی قدامت میں جس کی تاریکی نے ہندوستان کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو پوشیدہ کر رکھا ہے، آپ کے صوبے کی عظمت ایک چمکتے ہوئے ستارہ کی طرح روشن نظر آتی ہے، جب کہ یہ سرزمین مگدھ دیس کے نام سے مشہور تھی اور اس کا اولالعزم راجہ پاٹلی ٹھیک اسی مقام پر اپنا دارالحکومت تعمیر کر رہا تھا جہاں اب آپ کا دارالحکومت پٹنہ ہے۔ اس وقت یہ آبادی ایک عظیم الشان قلعہ کی صورت میں تھی جس کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ پانچ سو برجوں سے گھرا ہوا تھا اور چونسٹھ دروازے مختلف سمتوں میں بنائے گئے تھے۔ یہ قلعہ اپنے بانی کی طرف منسوب ہوکر پاٹلی پتر اکے نام سے مشہور ہوا۔ ۳۰۰ قبل مسیح میں جب سکندر اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا ہے تو اس وقت بھی پاٹلی پترا اپنے پورے جاہ وجلال کے ساتھ آباد تھا اور راجہ چندر گپت یہاں کا تاجدار تھا۔ اس مشہور فرمانروا کے عزم وہمت نے مگدھ دیس کے حدود حکومت کو ہندوستان کی آخری شمالی سرحد تک ایک سلطنت قائم ہوگئی تھی۔ عظیم الشان راجہ اس کا اسی چندر گپت کا پوتا تھا جس کی فتح یابیوں اور اولوالعزمیوں کی مشہور داستان محتاج بیان نہیں۔ اس کے زمانے میں مگدھ دیس کی حکومت بنگال اور اڑیسہ تک پھیل گئی۔ خلیج بنگال سے لے کر پشاور تک اور ہمالیہ سے وندھیا تک کا تمام ملک پاٹلی پترا یعنی پٹنہ کے زیر نگیں تھا۔ دو ہزار برس سے زیادہ زمانہ گذر گیا، لیکن اب تک آپ کے صوبے کی عظمت وتہذیب کی نشانیوں و ہندوستان نے محفوظ رکھا ہے اور آپ کی سرزمین سے سینکڑوں کوسوں کے فاصلے پر وہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد نمایاں ہوتی رہتی ہیں پنجاب کے دریا آپ سے کس قدر دور ہیں؟ لیکن ان کے کنارون سے آج تک وہ سکے نکل رہے ہیں جن پر راجہ اسوکا کا نام نقش ہے اور اس طرح اس کی حکومت کی وسعت دنیا کو یاد دلا رہے ہیں ! ہندوستان کی شمالی سرحد کی بلندیاں آپ کی مشرقی نشیبی زمین سے کس درجہ بعید و بلند ہیں؟ مگر آج تک ان کے مختلف گوشوں میں وہ کتبے قائم ہیں جن میں پاٹلی پتر کی دارالحکومت کے مذہبی فرمان درج کیے گئے اور صدیوں سے زمانہ کے انقلابات وحوادث کا تن تنہا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ہستنا پور یعنی عظیم الشان دہلی کے گھنڈر بھی آپ کے آوازۂ عظمت اور آثار تمدن سے خالی نہیں ہیں

، وہاں بھی وہ عجیب وغریب سنگی لاٹیں اب تک موجود ہیں جن کے کتبوں میں آپ کے اس قدیم دارالحکومت سے جاری شدہ احکام درج ہیں اور آج بھی اسی طرح پڑھے جاسکتے ہیں جس طرح ۲۰۰ قبل مسیح ہندوستان کی تمام آبادیوں میں پڑھے جاتے تھے۔

اسی راجہ اسوکا نے سب سے پہلے بدھ مذہب کو قبول کیا، اور ۲۲۲ قبل مسیح مین ہندوستان کی وہ عظیم الشان مذہبی کانفرنس پاٹلی پتر میں منعقد ہوئی جس میں تمام ہندو بیرون ہند سے علماء مذہب جمع ہوئے تھے، سب سے پہلے اسی مجمع میں بدھ مذہب کی تعلیمات مرتب ومکمل کی گئیں اور دنیا کے اس ''سب سے زیادہ تعداد والے'' مذہب کی تعلیمات کا مرکز یہی سرزمین قرار پائی۔ یہی وجہ ہے کہ پاٹلی پتر کا ذکر صرف ہندوستان ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ چین وجاپان اور تبت کی پرانی تاریخی روایات میں بھی عزت واحترام کے ساتھ اس کا نام لیا جاتا ہے۔

حضرات! یہ تو آپ کے صوبے کی تہذیب وحکومت کی قدیم روایات ہیں، لیکن اس کی مذہبی عظمت تو کسی بیان کی محتاج نہیں۔ ہندوستان کو وہ عظیم الشان بانی مذہب یعنی گوتم بدھ جس کے پیرو آج دنیا میں سب سے زیادہ تعداد رکھتے ہیں، آپ ہی کی سرزمین میں اپنی مرکزی یادگار چھوڑ گیا ہے، اور اشجر معرفت کا نشان اب تک گیا میں سیاحان عالم کو بتلایا جارہا ہے جس کے نیچے اس بانی مذہب نے راز حقیقت دریافت کیا تھا۔

اسلامی عہد میں بھی آپ کا صوبہ ہندوستان کا ایک ممتاز سربرآوردہ صوبہ رہا، اور تاریخ مغلیہ کے بڑے بڑے یادگار واقعات کی یاد اسی سرزمین سےس وابستہ ہے۔ عظیم آباد کا نام اب تک اس کا اعلان کررہا ہے کہ شہنشاہ اورنگ زیب کے پوتے عظیم الشان نے اس کی عمارات وجنگی استحکامات کو از سر نو محکم واستوار کیا تھا اور مشرقی ہند کی تہذیب وتمدن کا یہ مرکز تھا۔ علمی حیثیت سے آپ کی سرزمین تمام عہد اسلامی میں ہندوستان کی ایک مشہور مردم خیز سرزمین رہی ہے۔ جس کے بڑے بڑے شہر ہی نہیں بلکہ دیہات اور قصبات تک مشہور ومعروف علماء ہند کا وطن ومولد بنے، اور جن میں بعض علماء اس عظمت ومقبولیت کے ہوئے کہ صدیوں سے ان تصنیفات

اسلامی مدرسوں میں داخل درس ہیں۔اوران کا پڑھنا پڑھانا علماء اسلام کیلئے نشان عزت وامتیاز تسلیم کیا جاتا ہے۔گذشتہ سو برسوں میں اگر چہ مسلمانوں کا علمی وتمدنی تنزل درجۂ غایت تک پہنچ چکا تھا، بایں ہمہ آپ کی سرزمین خدمت علم دین کے اعتبار سے ہندوستان کے کسی صوبے سے پیچھے نہ رہی،اوراصحاب علم وفضیلت کی ایک بڑی جماعت بہار کے شہروں اور قصبات سے نکل کر تمام اطراف ہند میں شہرت وامتیاز حاصل کرتی رہی۔

حضرات! آپ کے تاریخی صوبے کی گزشتہ عظمت وشہرت کی سرگزشت تو بہت طول وطویل ہے۔یہ چند مختصر اشارات تھے،لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ موجودہ حالت کا گذرے ہوئے زمانے سے مقابلہ کرنا چاہیں تو اس کے لئے یہ اشارات ناکافی نہیں ہین ورنہ آپ کی یہ عظیم الشان سرزمین جس کی تاریخ ہر عہد ودور میں ایسے شاندار واقعات سے معمور رہی ہے، کم سے کم یہ حق تو ضروری رکھتی تھی کہ ہندوستان کے موجودہ عہد کی تعلیمی سرگرمیوں اوراصلاح ترقی کی کوششوں میں دوسرے صوبوں سے پیچھے نہ رہے۔وہ سرزمین جو قدیم عہد میں نصف ہندوستان کا دارالحکومت رہی ہے اوراسلامی عہد میں بھی بڑے بڑے علماء واہل اللہ کا مولد ومدفن ہوئی،اگراپنی گزشتہ تاریخ کو نہیں لوٹا سکتی،تو کم ازکم ہندوستان کی موجودہ جدوجہد میں ایک نمایا ں حصہ تو لے سکتی ہے؟لیکن مجھے کمال افسوس ودرد کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس اعتبار سے آپ کے صوبے کی موجودہ حالت کسی طرح بھی خوش آئند نہیں کہی جا سکتی، جب کہ ہندوستان کے تمام صوبے تعلیم وترقی کی سرگرمیوں کا کچھ نہ کچھ سامان ضرور رکھتے ہیں تو آپ کے صوبے میں ہر طرف غفلت وجمود کا سناٹا چھایا ہوا ہے۔قومی جدوجہد کی یہاں کوئی علامت نظر نہیں آتی۔زندگی حرکت وترقی کی سعی سے آپ کی بڑی بڑی آبادیاں خالی ہیں۔علمی تنزل روز بروز بڑھتا جاتا ہے ،مگراس کی تلافی کا کوئی سامان نہیں کیا جاتا،اہل علم روز بروز اٹھتے جاتے ہیں مگران کی جگہ بھرتی نظر نہیں آتی۔آپ کے صوبے میں اللہ تعالی کے فضل وکرم سے سربرآوردہ اورصاحب رائے بزرگوں کی کمی نہیں ہے۔ان میں بعض اس درجہ کے نامور حضرات ہین جن کی قابلیت کا تمام ملک

اعتراف کرتا ہے، مگر یہ کس قدر افسوسناک واقعہ ہے کہ خود ان کے صوبے کے لئے ان کی قومی خدمات میں کوئی حصہ نہیں ہے؟ جہاں تک میری معلومات ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے تمام صوبے میں مسلمانوں کی کوئی طاقتور انجمن نہیں ہے۔ کوئی قومی مرکز نہیں ہے، کوئی ایسی قومی درسگاہ نہیں ہے جو کسی صحیح اور قابل اعتماد انتظام و اہتمام کے ساتھ قائم ہو۔ بانکی پور میں ایک قومی کالج قائم کرنے کی صدائیں بارہا اٹھ چکی ہیں۔ مگر آج تک اس کے لئے کوئی امید افزا سبیل نہیں نکلی۔ حتیٰ کہ شاید اس کا ذکر بھی اب زبانوں پر باقی نہیں رہا۔

حضرات! میں نہیں سمجھتا کہ تمام مسلمانان رانچی کو ان کی اس اہمیت و عزم پر کیونکر مبارکباد دوں کہ انہوں نے صوبۂ بہار کی اس عام چھائی ہوئی خاموشی میں یکایک اپنی صدا کا غلغلہ بلند کیا ، اور جس تحریک کی توقع ہم کو اس صوبے کے بڑے بڑے شہروں سے تھی اس کی آواز ایک ایسے دور افتادہ اور گمنام مقام سے بلند ہوئی۔ رانچی اور چھوٹا ناگپور کا تمام علاقہ ہمیشہ سے ملک کا ایک گم نام و کس مپرس علاقہ رہا ہے۔ ہم نے اب سے دس بارہ برس پہلے تو اس کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ غالباً ۱۹۰۸ء میں بنگال کے مشہور لفٹنٹ گورنر سر اینڈ یو فریزر نے اس علاقہ کا دورہ کیا اور وہ پہلا موقع ہے کہ باہر کے لوگوں نے اور علی الخصوص بنگال کے لوگوں نے ایک خوش آب وہوا پہاڑی مقام کی حیثیت سے اس کا نام سنا۔ اس کے بعد غالباً ۱۹۱۰ء میں پرولیا رانچی کی چوتھی ریلوے لائن جاری ہوئی، اور اس طرح باہر کے لوگوں کی زیادہ آمد و رفت ہونے لگی پھر ۱۹۱۲ء میں جب صوبۂ بہار ایک مستقل صوبہ قرار پایا تو ہم نے سنا کہ رانچی کو عمدہ آب وہوا کی وجہ سے صوبے کا صدر مقام بنایا جا رہا ہے، اور کم از کم موسم گرما میں تو اعلیٰ حکام کا قیام وہاں ضرور رہے گا۔

حضرات! رانچی کی پچھلے شہرت کی بڑی تاریخ یہ ہے جو میں نے چند لفظوں میں ختم کر دی۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت اب تک باہر کے لوگوں کے علم میں تھی۔ یہاں کی آب وہوا کی تعریف کا شبہ ہم نے بارہا سنی تھی، لیکن یہاں کے بسنے والوں کے دلوں کی تعریف اب تک نہیں

سنی تھی۔ یہاں کے پہاڑوں کی نسبت ہم نے اخباروں میں یقیناً دیکھا کہ بعض نہایت خوشنما اور بلند آبشاریں ان سے گرتی ہیں، مگر یہ تو کبھی نہیں سنا تھا کہ علم وحق کا کوئی سرچشمہ بھی ان پتھروں کے اندر پوشیدہ ہے۔ ہاں، البتہ ایک اور واقعہ بھی پچھلے دنوں ایسا ہوا جس کی وجہ سے رانچی کا نام بار بار لوگوں کی زبانوں پر آنے لگا تھا۔ یعنی لوگوں نے سنا کہ وہاں بعض مسلمان نظر بند مقیم ہیں، لیکن اس سے زیادہ تو اس کی نسبت دنیا کو کچھ معلوم نہ تھا۔

لیکن اے برادران رانچی! آپ کو میں بار بار مبارک باد دینے سے کبھی نہیں تھک سکتا کہ آپ کی فوری بیداری اور اچانک سرگرمی نے یکا یک ہمارے سامنے ایک نئی رانچی کا شاندار جلوہ پیش کر دیا ہے جواب سے دو سال پہلے کی رانچی سے ایک بالکل مختلف چیز ہے۔ وہ آپ کی پچھلی اور پرانی رانچی گمنام تھی، مگر یہ نہ صرف اپنے صوبے ہی میں بلکہ تمام ملک میں مشہور ہے۔ وہ جہاں غفلت کی تاریکی میں پوشیدہ تھی، اور جدوجہد کی روشنی میں جہاں تاب و درخشندہ ہے، اگر اس کی اسلامی آبادی پر قومی موت کی خاموشی چھائی ہوئی تھی تو اس کی آبادی زندگی کی جان بخش صداؤں سے معمور ہو رہی ہے۔ وہ اپنی روحانی بیماریوں کے لئے باہر طبیبوں کی محتاج تھی، تو یہ اب اپنے ہاتھ میں باہر کے بیماروں کے لئے داروئے شفا لئے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی ہوشیاری و بیداری کے لئے باہر کی صداؤں اور غلغلوں کی منتظر تھی، اور یہ نئی رانچی، آپ کی ہمت و مستعدی کی بسائی ہوئی رانچی، آپ کے جوش قومی، قوت ایمانی، اور ایثار و اخلاص کی مثالوں سے معمور رانچی، اپنی دو سالہ زندگی کے اندر تمام ملک کے لئے خدمت قومی کا بہترین نمونہ اور سبق رکھتی ہے!

اے برادرانِ رانچی! آپ کی انجمن کے جس قدر حالات مجھے معلوم ہوئے ہیں، میں ان کی بنا پر پورے عزم و یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے نہ صرف اپنے شہر کی تعلیم و ترقی کے لئے ایک مقامی انجمن قائم کی ہے، بلکہ اپنے علمی نمونے سے ملک کی تمام انجمنوں کے لئے ایک بہترین مثال قائم کر دی ہے۔ آپ کے اس کام کی عزت کس درجہ ہماری نظروں میں بڑھ جاتی

ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے جو کچھ انجام دیا ہے، دولت وتمول اور کثرتِ تعداد وسامان کے ساتھ نہیں، بلکہ کمال درجہ غربت وافلاس اور قلت و بے سامان کی حالت میں۔ آپ کے یہاں بڑے بڑے دولت مند مسلمان نہیں ہیں جو بڑی بڑی رقمیں کار خیر کے لئے نکال سکیں اور اپنے غریب بھائیوں کی جانب سے اپنا فرض قومی انجام دیں۔ آپ کی آبادی بہت وسیع نہیں ہے کہ کثرت تعداد کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی رقمیں بھی یکجا ہوکر ایک بہت بڑی رقم بن جائیں۔ آپ کے یہاں تعلیم مفقود ہے، اور قومی کام کرنے والوں کے لئے یہ پہلا کام اور پہلی مشق ہے۔ بایں ہمہ آپ نے اپنی سچی ہمت اور خدا پر کامل اعتماد سے تھوڑے ہی عرصے کے اندر علمی کام انجام دینے کا ایک شاندار نمونہ دکھلا دیا جو ہندوستان کے بڑے بڑے دولت مند شہروں کی غفلت و بے علمی کے لئے ایک تازیانہ عبرت ہے۔ آج آپ نے ہم کو یہ سب سے زیادہ قیمتی اور ضروری سبق دیا ہے کہ کامیابی کی اصلی قوت صرف روپیہ اور تعداد ہی میں نہیں ہے بلکہ اتحاد، سرگرمی اور ہمت میں ہے، اور آپ کے لئے یہ شرف بس کرتا ہے!

حضرات! آپ کی انجمن کی بنیاد اگست ۱۹۱۷ء میں رکھی گئی جس پر صرف ایک سال دو مہینے کا زمانہ گذرا ہے۔ پس آپ نے جو کچھ کیا ہے اسی چودہ مہینوں کے اندر کیا ہے اور پھر کیسی غربت اور بے سروسامانی کی حالت میں! اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی علمی زندگی کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا اور جس قلیل مدت میں ملک کی بڑی بڑی انجمنوں نے ابتدائی ماتب بھی طے نہیں کئے، آپ نے اسی زمانے کے اندر اپنے کام کو اس حد تک مکمل کر دیا کہ آج ہماری نظریں دیکھ دیکھ کر آپ کی عزم وہمت کا یہ نمونہ دکھلا کر تمام ملک کی ہمدردی واعانت کو حاصل کر لیا ہے اور تمام مسلمانان ملک کا فرض ہے کہ وہ اس کی تکمیل میں آپ کے یار ومددگار ہوں۔ علی الخصوص میں صوبہ بہار کے اعیان واکابر کو اس طرف توجہ دلاؤں گا، اور عرض کروں گا کہ آپ کے غریب و بے سامان بھائیوں نے جس عظیم الشان کام کی تن تنہا بنیاد رکھی ہے، وہ دراصل آپ کے فرض قومی تھا۔ اور اب آپ کا فرض ہے کہ ان کے کام کی قدر وقیمت محسوس کریں اور اس کی تکمیل

میں پوری طرح یار و مددگار ہوں۔

حضرات! میری یہ گذارش ناتمام رہے گی، اگر میں اس مدرسہ کا خاص طور پر ذکر نہ کروں جس کا افتتاح کل درپیش ہے۔ آپ کی انجمن کا یہی وہ زریں کارنامہ ہے جس کی وجہ سے آپ کی تحریک مقامی حیثیت سے نکل کر تمام مسلمانان ہند کے لئے ایک عام تحریک ہوگئی ہے۔ یعنی آپ نے اس مدرسہ کو جدید اصلاح یافتہ نظام تعلیم کے ماتحت قائم کیا ہے، جو عربی اور انگریزی، دونوں زبانوں کی تعلیم سے مرکب ہے، اور جس کے سینئر کلاسز میں اسلامی علوم وفنون کی قدیم طرز تعلیم کے تمام نقائص دور کر کے ایک صحیح اور جامع نصاب تعلیم اختیار کیا گیا ہے۔ یہی مسلمانوں کی سب سے بڑی قومی ضرورت تھی جس کو اگرچہ گذشتہ تیس سال سے تمام ملک محسوس کر رہا ہے، مگر اب تک اس کی کوئی عملی اور ضروریات وقت سے ساتھ دینے والی صورت نہیں نکلی تھی۔ آپ نے اس کام کو انجام دے کر ملک کی سب سے بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے، اور یہی وہ کام ہے جس کی تکمیل میں بلا شہر اور صوبے کے امتیاز کے تمام مسلمانان ہند کو آپ کی اعانت کرنی چاہئے آپ کی انجمن کا یہ کام اس قدر اہم ہے کہ اس کے لئے بہت زیادہ تفصیل وتشریح کی ضرورت تھی مگر میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ یہ موضوع بحث میرے دائرہ لیاقت سے باہر ہے اور اس کے لئے علماء کرام اور اصحاب درس و تعلیم ہی زیادہ موزوں ہو سکتے ہیں۔ جو انشاء اللہ اس کی مفصل کیفیت آپ کے سامنے پیش کریں گے۔

حضرات! کارخانہ قدرت الہٰی کے کچھ عجیب اسرار ہیں جن کے ادراک سے فہم میں انسانی عقل حیران ودرماندہ رہ جاتی ہے۔ ہزاروں انسان ہیں جو ایک چیز کے لئے بڑی بڑی آرزوؤں اور حسرتوں کے ساتھ سعی وکوشش کرتے ہیں۔ مگر کامیاب نہیں ہوتے، اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہی چیز ایک شخص کو بسا اوقات بے مانگے اور بلا کسی ظاہری طلب وکوشش کے مل جاتی ہے ۔اور کوشش کرنے والے درماندہ اور متحیر دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے ہیں! دنیا عالم اسباب ہے اور بلاشبہ اس کے بھی کچھ مخفی اسباب ضرور ہوں گے، لیکن وہ اس قدر باریک ومخفی ہیں کہ انسانی نظر

اب تک ان کو نہ پا سکی۔ یقیناً آپ میں سے ہر فرد اس عقیدے میں مجھ سے متفق ہوگا کہ ایک ایسی ہی کامیابی وخوش قسمتی آپ کے حصے میں بھی آئی ہے۔ جو گراں قدر موقع اصلاح وترقی کا آپ کو خود بخود مل گیا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو بڑی بڑی آرزوؤں اور کوششوں سے بھی دوسروں کے حصے میں نہ آئی، اور اگر بعض خاص واقعات وحوادث پیش نہ آتے تو کس کو امید ہو سکتی تھی کہ یہ صورت حال پیش آئے گی؟ پیاسوں نے ہمیشہ پانی کو ڈھونڈھا ہے لیکن آپ کے لئے یہ قانون باطل ہو گیا اور خود پانی آپ کی پیاس کو ڈھونڈتا ہوا آپ کے دروازوں پر پہنچ گیا۔ بیماروں نے ہمیشہ طبیبوں کی جستجو کی ہے مگر میں آپ کی خوش قسمتی کو کن لفظوں سے تعبیر کروں کہ خود طبیب آپ کے سرہانے آ کھڑا ہوا۔ دنیا بھر کے مسافر منزل مقصود کی طرف دوڑتے ہیں مگر آپ راہ سعادت کے وہ مسافر ہیں جس کی طرف منزل مقصود خود دوڑتی ہوئی چلی آئی۔ آج سے دو سال پہلے آپ کی سر زمین اپنے علاج کے لئے دوسروں کی محتاج تھی، لیکن صرف مہینوں کے اندر یہ انقلاب حال ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ کی سرزمین دوسروں کے لئے دار الشفا بن گئی ہے اور وہ وقت دور نہیں جب دور دور کے لوگ آپ کے اس شفا خانہ علم کے محتاج ہوں گے۔ فی الحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کا ایک مخصوص فضل وکرم ہے جو آپ کے حصے میں آیا ہے اور بڑی ہی بدبختی تھی اگر ایسی عظیم الشان مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا جاتا۔ اور یقیناً بڑی سے بڑی مبارک باد کے آپ کے مستحق ہیں کہ آپ نے اس مہلت کی قدر وقیمت کو سمجھا اور اس سے مالا مال ہو جانے میں کوتاہی نہ کی۔ یہ آپ کی مہلت شناسی کی ابتداء ہے، اور امید ہے کہ آنے والا وقت پچھلے وقتوں سے اور زیادہ شاندار اور کامیاب ہوگا۔ اور آپ اس مہلت سے فائدہ اٹھانے میں اس سے کہیں ہمت ومستعدی دکھلائیں گے، جس قدر اب تک دکھلا چکے ہیں، آپ کے پاک سفر کا آغاز اس قدر شاندار اور امید افزا ہے، تو اس کا اختتام اس سے کہیں زیادہ عظیم الشان وکامیاب ہونا چاہئے۔ اگر اس مہلت سے فائدہ اٹھانے میں آپ نے ذرا بھی کوتاہی کی تو یاد رکھئے کہ حسب ظاہری پھر ایسا موقع شاید ہی آپ حاصل کر سکیں گے۔

حضرات !اب میں اورزیادہ آپ کی قیمتی وقت نہیں لینا چاہتا،آپ بزرگان ملت کے ارشادات ومواعظ سننے کے لئے بےقرار ہوں گےجن کواس شاندار دن نے یہاں مجتمع کردیا ہے، پس میں آپ کے لطف ومحبت کا مکرر شکریہ ادا کرنے کے بعد اورآپ کی کامیابی کی دعاء مانگتے ہوئے اپنی گذارش کوختم کرتا ہوں، اورسکریٹری صاحب سے کہتا ہوں کہ اپنی رپورٹ پیش کریں۔

انجمن اسلامیہ کا دوسرا سالانہ اجلاس:۔

انجمن اسلامیہ کا دوسرا سالانہ اجلاس 24اکتوبر 1919ء تا26اکتوبر 1919ء منعقد ہوا۔اس جلسے میں تقریباً چار ہزار افراد شریک تھے۔جن عظیم شخصیتوں اوراکابرامت نے اپنی شرکت سے اس جلسےکووقار بخشا ان میں شیر بنگال آنریبل اے۔کےفضل حق،سید سلیمان ندوی،شاہ سلیمان پھلواروی(پٹنہ) سجاد حسن (گیا)،ایف ڈی احمد(کلکتہ)مسٹر یونس بیرسٹر(پٹنہ)کے علاوہ کلکتہ سے جے۔ایچ۔عبداللہ۔احمد زکریا وغیرہ کے علاوہ مقامی لوگوں میں رائے صاحب ٹھاکرداس،رائے صاحب امریندر ناتھ بنرجی بھی شریک جلسہ رہے۔شرکاء میں مقامی طور پر مسلمانوں، بنگالیوں اور بہاری ہندوؤں کی بھی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔جلسہ کے انعقاداوراس کی کامیابی کے لیے مولانا آزادکس طرح تیاری میں مصروف تھے،ان کے ایک خط سےاندازہ ہوتاہے جوانہوں نے سید سلیمان ندوی کوارسال کیا تھا۔دیکھیے یہ اقتباس:۔

”بالفعل ضروری بات وہ ہے کہ انجمن اسلامیہ کادوسرا سالانہ جلسہ 24,25,26 ر اکتوبر 1919 کوقرار پایا ہے۔اس سال آپ کی شرکت نہایت ضورروری ہے۔خواہ کچھ ہومگرآپ کوآنا ہی پڑیگا۔اگرآپ شریک نہ ہوئے تو بڑاقلق ہوگا۔بہار کا جوحال ہے پوشیدہ نہیں۔رنگون تک سے لوگ آئے مگرخوداس صوبے میں کسی کوتوفیق نہ ملی،آپ ہی اس فرض کیفایہ کوفرض عین بنایئے۔کیا اچھا ہوتااگرآپ صوبہ بہار کی گذشتہ علمی زندگی وتعلیمی حالات پرایک ایسا لکچر

دیجیئے...... مولوی ابوالحسنات صاحب کو بھی ساتھ لائیے۔ گو افسوس کہ عمادی حیدرآباد میں ہیں اور بلائے نہیں جاسکتے اور حادثہ کانپور پر بھیڑا زمانہ گذر چکا۔ ایک دن کا جلسہ صرف صوبہ کے تعلیمی و علمی مذاکرہ کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ مولوی ابوالحسنات صاحب بھی کوئی تحریر تیار کریں تو بڑی خوشی ہوگی۔

مشورہ لکھیے کہ سوبہ بہار کے علما میں کون کون قابل دعوت اور مستحق سعی خاص ہیں؟ آپ لکھیں گے کوئی نہیں، لیکن یہ جواب تو تمام ملک بلکہ دنیا کے لیے بھی دیا جاسکتا ہے۔''[۴۹]

اس جلسے میں شیر بنگال فضل حق نے شعلہ بیان تقریر کی۔ اس بات پر کافی گرجے برسے کہ گورنر بہار رانچی میں ہی تھے۔ ان کو مدعو بھی کیا گیا مگر انہوں ے جواب دینے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ مولانا آزاد نے اس تقریب کی کامیابی کا سہرا رانچی کے عوام کے سر باندھا خصوصاً ہندو بھائیوں سے جو انہیں تعاون ملتا رہا۔ اظہار تشکر پیش کیا۔ مدرسہ کی عمارت کی تعمیر کے سلسلے میں تقریباً چودہ ہزار کی جو رقم موصول ہوئی تھی اس کا گوشوارہ بھی پیش کیا گیا۔ مزید جلسے کے شرکاء نے چار ہزار روپے کی رقم چندہ کی شکل میں دینے کے اعلان کیا۔

مدرسہ کے نصاب کی ترتیب و تدوین:۔ مولانا آزاد کے ایک خط بنام محی الدین احمد قصوری کا پتہ چلتا ہے۔ محی الدین قصوری کا تعلق ضلع لاہور سے تھا۔ انہوں نے کلکتہ سے شائع ہونے والا روزنامہ ''اقدام'' کی ادارت بھی کی تھی۔ وہ مولانا کے ذریعہ رپن اسٹریٹ کلکتہ میں قائم کیے گئے 'دارالارشاد' کی مجلسوں میں بھی شریک ہوتے رہے۔ انہوں نے کچھ مدت نظر بندی میں بھی بسر کیا۔ نظر بندی کے دوران ہی انہوں نے پورا قرآن مجید حفظ کرلیا اور اس پر طرہ یہ کہ عربی زبان میں اتنی ید طولیٰ حاصل کرلی کہ رہائی کے بعد اپنے وطن میں درس و تعلیم کے لیے ایک درس گاہ بنانے کا منصوبہ رکھتے تھے۔ گذشتہ صفحہ پر اس سلسلے میں انہوں نے مولانا آزاد سے

کچھ مشورے طلب کیے جس کے جواب میں مولانا نے ایک جون 1919ء کے پہلے ہفتے میں ارسال کیا جس میں نصاب مدرسہ کے تعلق سے ایک تفصیلی ڈرافٹ ترتیب دیا گیا تھا۔ اس کا متن من وعن یہاں نقل کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا:۔

''ایک نقشہ نصاب بھیجتا ہوں۔ دو سال ہوئے ڈائرکٹر بنگال نے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے نظام تعلیم میں تبدیلی کی از سر نو تحریک کی اور مولوی عبداللہ صاحب ٹونکی کو ایک مسودہ طیار کرنے کے لیے کہا۔ چنانچہ ایک سب کمیٹی بنائی گئی اور میرے پاس بھی کاغذات پہنچے۔ نظر بندی کی وجہ سے کمیٹی کے اجلاس میں شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے تحریر و مراسلت پر اکتفا کیا اور ایک جدید نقشہ نصاب مرتب کر کے بھیج دیا۔ جو دو سو صفحے تک پہنچ گئے، لیکن ان کی نقل میرے پاس نہیں۔ ان سے کتب مجوزہ کے وجوہ ترجیح اور وجوہ انتخاب و تقسیم علوم و ربط کتب وغیرہ توضیحات واضح ہوتے۔

۲۔ اس نصاب تعلیم کی کل مدت سولہ سال ہے۔ جس میں مکتب کلاس کے تین سال بھی شامل ہیں ان کو خارج کر دیا جائے تو تیرہ سال باقی رہ جاتے ہیں، جو بی۔ اے کی مدت تعلیم و تکمیل کے مقابلے میں کسی طرح گراں نہیں۔ تعلیم دو ٹکڑوں میں منقسم ہے۔ جونیر کلاس اور سینیر کلاس، جونیر کی مدت آٹھ سال ہے، جس میں مکتب کی ابتدائی تعلیم بھی داخل ہے۔ عام طور پر یونیورسٹیوں نے مکتب کی تعلیم کے لیے تین سال رکھے ہیں۔ ہم نے صرف دو سال رکھے اور مدرسہ رانچی کے تجربے نے ثابت کر دیا کہ پوری طرح کافی ہیں۔ یونیورسٹی کے جدید قواعد کے رو سے سولہ سال کی عمر سے پہلے میٹریکولیشن کا امتحان دیا نہیں جا سکتا۔ اگر بچے نے پانچ سال کی عمر میں تعلیم شروع کی تو اس درجہ کی تعلیم سے تیرہ سال کی عمر میں فارغ ہو سکتا ہے۔ دو سال درمیان میں

ناکامی وغیرہ کے لیے رکھ لئے جائیں اور پانچ کی جگہ آغاز تعلیم کو چھ میں مان لیجئے جب بھی سولہ سال کی عمر میں اس سے فارغ ہو جائیگا۔

۳۔ جونیر کلاس کے آٹھ سال میں پانچویں سال سے انگریزی زبان دانی شروع ہو جاتی ہے اور حساب، جغرافیہ ہند تاریخ ہند، تاریخ اسلام، مبادیات سائینس اس کے برابر اور بعض حالتوں میں اس سے زیادہ ہے۔ جس قدر سرکاری مڈل انگلش کورس میں ہوتا ہے۔ گویا انگریزی، حساب، تاریخ وغیرہ کی جس قدر استعداد مڈل پاس کو ہوتی ہے اس سے زیادہ اس جونیر کلاس کے تعلیم یافتہ کو ہوگی۔ مزید براں عربی صرف ونحو بالکل ختم، مبادیاتِ ادب شروع، کامل ترجمۃ القرآن، بقدر ضرورت تجوید وقراۃ، عقائد کا ایک متن حفظ، تاریخ اسلام مجمل، سیرت نبوی فارسی کامل، منطق کی پہلی کتاب، اردو شرح تہذیب سے زیادہ تک کی۔ فقہ میں ایک مختصر، اسرار الدین میں منتخب احیاء و مافیہا حسب ذلک۔

۴۔ **ایک بنیادی پہلو:۔** موجودہ حالت میں کوئی سلسلہ تعلیم کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک اس میں سرکاری یونیورسٹیوں کے پیوند کی بھی گنجائش نہ رکھی جائے۔ ایک بڑی خوبی اس میں یہ ہے کہ جونیر کلاس کے بعد اگر کوئی چاہے تو بلا ایک سال بھی ضائع کئے ہائی اسکول کی پانچویں کلاس میں مڈل پاس کی طرح داخل ہوسکتا ہے۔ بہت سے لوگ اپنے بچوں کو قصداً پہلے مڈل انگلش، کی تعلیم دلا کر ہائی اسکول میں داخل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی اردو حساب دانی زیادہ پختہ تر امتحانات میں معین ہوتی ہے۔ ہم نے بھی اتنی ہی مدت رکھی ہے۔ پس اس کے بعد بھی یہ ممکن ہے اور مزید برآں یہ کہ اس کی عربیت واسلامیت اور فارسیت اس کی تمام عمر کو سنوار دے گی۔ اگر جونیر کلاس کے بعد مجوزہ نصاب

کے سینیر درجہ کی تعلیم حاصل نہیں کی گئی۔ اور صرف انگریزی ہی کو اختیار کر لیا گیا۔ جب بھی اس سے ایک عربی داں اور دین سے باخبر گریجویٹ پیدا ہو سکتا ہے۔

۵۔ سینیر کلاس یعنی جماعت ثانیہ صرف علوم کی جماعت ہے۔ مبادیات اور علوم آلیہ سب جماعت اولیٰ میں ختم کر دیے گئے ہیں۔ اس کے چھ سال ہیں اور ابتدائی سالوں میں انگریزی کا سلسلہ جاری رہے گا۔ بقیہ دو سالوں میں انگریزی نہیں، انگریزی کے متعلق یہ اصل ملحوظ رہے کہ ایک انٹرنس پاس کی زبان دانی تک کی استعداد لازمی طور پر حاصل ہو جائے جس کو مزید انگریزی کا شوق ہو وہ جماعت ثانیہ کے چھ سال ختم کر کے درجہ تکمیل (ایم۔اے) میں انگریزی م ادب کا مضمون لے سکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ استعداد پیدا کر لے سکتا ہے۔

۶۔ نئی کتابوں کی ضرورت۔ کوئی جدید نصاب تعلیم صرف موجودہ کتب کے ردو بدل و اقتباس و انتخاب سے مکمل نہیں ہو سکتا، جب تک بعض کتابیں از سر نو نہ لکھی جائیں۔ علی الخصوص ابتدائی تعلیم میں سلسلہ دینیات، ترجمۃ القرآن، مبادی، طبعیات، منتخب ادب فارسی، سیرت نبوی ﷺ، منطق کی تصنیف ناگزیر ہے۔ منطق کی پہلی کتاب قطعاً اردو میں یا فارسی میں ہونی چاہیے اور بہ اسلوب جدید نہ کہ بہ طرز متون و شروح قدیمہ، اس لیے متعدد چیزیں زیر تالیف ہیں۔ نیز منطق استقرائی۔

۷۔ معہٰذا چونکہ مقصود مدرسہ عالیہ کلکتہ اور اس کے بعد عام مدارس تھے اور مزاج وقت اصلاح کامل کا متحمل نہیں اور رعایت مصالح ناگزیر، اس لیے بعض چیزوں میں تنزلات گوارا کر لئے گئے اور بعض چیزوں کو بحالہ چھوڑ دینا

پڑا۔ مثلاً متون فقہ متداول اور عقائد و اصول میں مصنفات تفتازانی۔
درسیات اسلامیہ کے تنزل کا ایک بڑا سبب علامہ تفتازانی کے نصاب کا رواج و
قبول ہے مگر یکایک انقلاب کامل کی کامیابی مشکل ہے یہ ساری باتیں نوٹس
سے معلوم ہوتیں۔افسوس کہ وہ ڈائرکٹر بنگال کے پاس ہیں۔

مجتہدانہ نظر کا فقدان:۔ایک بڑی دقت جس کی وجہ سے بعض بہترین کتب
قدماء کو چھوڑ دینا پڑا، یہ پیش آئی کہ ہمارے علماء صدیوں سے اس کے عادی
چلے آتے ہیں کہ درسیات کو ان کے شروح وحواشی وتعلیمات وغیرہ کی مدد سے
پڑھیں پڑھائیں۔مجتہدانہ نظر ودرس مفقود۔اب اگر یکایک تمام کتابیں ایسی
رکھ دی جائیں جن کے شروح وحل غرائب ولغات وغیرہ موجود نہیں اوران کا
حل وفہم صرف معلم کے مجتہدانہ نظر ومطالعہ کا محتاج، تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ
کو پڑھانے والا کوئی نہیں ملے گا۔سب سے زیادہ یہ دقت ادب اور فقہ میں
ہوئی، ناچار حتی الوسع ایسی ہی کتابیں رکھی گئیں، جن کے شروح کسی نہ کسی شکل
میں موجود ہیں۔بلاغت و معانی و بیان میں سینٹ جوزف کالج بیروت کی
کتابیں اسی لئے اختیار کیں کہ ان کی شرحیں بھی لکھی گئی ہیں اور چھپی ہوئی ملتی
ہیں۔ورنہ بعض اور بھی کتابیں قدماء کی نکل آئی ہیں، انشاء وکتابت میں ابن
مقفع وغیرہ کو اسی سہولت کی بنا پر اختیار کیا، ورنہ جاحظ ابن وریدہ وغیرہ ائمہ
عربیت کے مقالات موجود ہیں اور وہ مستحق ترجیح تھے۔بایں ادب کا نصاب
اس درجہ مکمل واصلح ہوگیا ہے کہ اس کے محاسن کا اندازہ تمام زیر درس کتب کے
مطالعے اور ذوق سلیم وفکر مستقیم کی معاونت ہی سے ہوسکتا ہے۔مختصر ومطول
اور حریری ومتنبی کی پرستش کرنے والے اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔

۹۔لیکن آپ کو سر دست جو صورت درپیش ہے، وہ اس سے مختلف ہے۔آپ کو

ایک کامل درس گاہ نہیں قائم کرنی ہے اور نہ اس کی ضرورت ۔ مبادیات و آلات سے قطع نظر کر کے اعلیٰ علوم کی چند ضروری کلاسیں جاری کرنی ہیں اور بس ۔ سرکاری یونیورسٹیوں کے قرار دادہ نظام و تقسیم اوقات وغیرہ ضروری پابندیوں کی رعایت بھی ضروری نہیں، جس کی وجہ سے مجوزہ نصاب میں بڑی دقتیں پیش آئی تھیں ۔ پس یہ نقشہ نصاب اس لئے نہیں بھیجتا کہ بجنسہ اس کو اختیار کیا جائے ۔ مقصود یہ ہے کہ ضروری علوم و مضامین اور کتب منتخبہ درسیہ کے مد اس سے مل جائے گی اور کتابوں کے تقرر میں اس کا پیش نظر رہنا باعث سہولت ہوگا۔

دینیات اور عربیت ۔ ۱۰۔ آپ کے لئے دو نصاب تعلیم مطلوب ہیں گریجویٹس کی تعلیم دینیات کے لئے اور متوسطین عربیت کی مزید تعلیم کے لئے دونوں کے حالات و مقتضیات مختلف اور اس کی رعایت ضروری۔ آپ کے پیش نظر ''تکمیل'' نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ اس کے لئے زیادہ زمانہ مطلوب اور بالفعل ہمتیں عموماً مقصر ! مجوزہ نصاب مقصد تکمیل و رسوخ علوم اسلامیہ کو پیش نظر رکھ کر تجویز کیا گیا ہے یعنی علمائے کاملین و راسخین پیدا کئے جائیں ۔ مگر آپ کا مقصد بالفعل کی جائے تکمیل محض تعلیم ہونا چاہیے، یعنی موجودہ حالت جہل بالدین کے مقابلے میں جس قدر بھی زیادہ اور بہتر تعلیم قرآن وسنت دی جا سکے، دے دی جائے، گو درجہ کمال تک نہ ہو مگر موجودہ طبقہ کے گریجویٹ اور مولوی سے بہتر واصلح مسلمان گریجویٹ اور مولوی پیدا کئے جائیں ۔ یاد رکھئے کہ یہ بات سب سے زیادہ مقدم اور اولین بحث وفکر کی ہے ۔ ہر سفر کی کامیابی کے لئے تقرر بدایت ونہایت لابد منہ ولازم وملزوم ہے ۔ جب تک سب سے پہلے اپنی منزل مقصود متعین نہ کیجئے گا، نصاب ونظام کی تجویز و بحث

بے کار ہو گی۔ بہت ہی عمدہ تجویزیں بلکہ عملی اقدام اس نکتے کو ملحوظ رکھنے کی وجہ سے ضائع گئے۔ آپ سب سے پہلے اس کو صاف کر لیجئے کہ کیسی تعلیم مقصود ہے؟ یعنی موجودہ مراتب معلومہ تعلیم کے مقابلے میں کون سا مزید مرتبۂ درجہ پیدا کرنا چاہتے ہیں؟ اور مصالح و اسباب کے لحاظ سے کہاں تک بلندی و اسبقیت ممکن ہے؟

کاملین و متوسطین: ۔ آیا مقصود علمائے کاملین کا پیدا کرنا ہے یا اصحاب علم متوسطین کا؟ کامل و پختہ متعلم پیدا کرنا چاہتے ہیں یا کامل و راسخ معلم؟ قرآن حکیم نے اصحاب درایت و علم کی یہی دو قسمیں کی ہیں۔ متعلم و معلم اور یہی قدرتی تقسیم ہے۔ حفاظ علم ان دو جماعتوں سے باہر نہیں اور ان کے آداب و وظائف مختلف۔ تکوین امت صالحہ کیلئے یہ دونوں کارخانے درہم برہم ہو گئے نہ کامل و صالح متعلم ہیں نہ کامل و صالح معلم۔ صنف متعلمین سے مقصود محض طلبہ علم نہیں بلکہ اہل علم کا ایسا گروہ ہے جو باعتبار معلومات ایک اچھے سے اچھا درجہ علم و فکر کا رکھتا ہو اور ناقصین و غافلین اور اپنے سے تمام نچلے درجوں اور عامۂ امت کے لئے بہ نسبت اضافی معلم ہونے کی بھی صلاحیت رکھتا ہو۔ تاہم اس کا اصل منصب" علم کے جاننے والے" کا ہو۔ بتلانے والے" اور سکھانے والے" اور" راہ کھولنے والے" کا نہ ہو معلمین سے مقصود وہ سب سے اونچی اور آخر جماعت شہداء و مقومینِ حق اصحاب عزیمت و سابقون بالخیرات فی العلم کی ہے جو صرف عمدہ و صحیح و کافی طور پر جان لینے اور سمجھ لینے ہی پر قانع نہ ہو گی بلکہ چند قدم آگے بڑھے اور وہ منصب و مقام نفوذ و رسوخ و سریان امر و سلطان کا رکا حاصل کیا، جس کے بعد وہ بتلانے والی، سکھانے والی۔ طیار کرنے والی اور بنا دینے والی جماعت بن گئی۔ وذٰلک من عمل النبوۃ۔ قرآن حکیم نے انسانوں کو تین گروہوں

میں منقسم کیا ہے، فمنہم ظالم لنفسہ ومنہم مقتصد، ومنہم سابق بالخیرات باذن اللہ، اور یہ حکم ثم اورثنا الکتاب یہی تین گروہ ورثاء کتاب اللہ ہوئے۔ یہ تقسیم عام ہے نہ کہ محدود خاص۔ ہر وادی اور ہر میدان میں۔ پس علم کے میدان میں بھی ''ظالم لنفسہ'' ہیں اور درمیانی درجہ والے ''مقتصد'' اور آخری درجہ والے ''سابقون بالخیرات'' آپ پہلے طے کر لیجئے کہ کن لوگوں کو پیدا کرنا چاہتے ہیں؟ ایسے لوگوں کو جو میدان علم میں درجۂ اقتصاد رکھتے ہیں یا ایسے لوگوں کو جو درجہ اسبقیت بالخیرات پر فائز ہوں؟

مصلحین کی ناکامی کے اسباب:۔ آج تک مصلحین نظام تعلیم نے جس قدر بھی کوششیں کیں، ناکام رہیں۔ اس کے اسباب متعدد ہیں، لیکن ایک بڑا سبب یہ ہے کہ مراتب و مدارج علمیہ وتعلیمیہ کے متعلق یہ اصول ان کے پیش نظر نہ تھے اور کوئی صحیح و اساسیہ تقسیم اپنے سامنے نہیں رکھتے تھے، حالانکہ تعلیم امت بغیر اس کے ممکن نہیں۔ نہ تمام طالبین علم درجہ اسبقیت حاصل کریں گے اور نہ کر سکتے ہیں اور نہ کرانے کی کوشش کرنی چاہیئے اور نہ یہ کافی ہو سکتا ہے کہ مجرد درجۂ اقتصاد پر قناعت کر لی جائے۔ پھر کتاب وسنت اور منہاج صحابہؓ کو پیش نظر رکھ کر وہ اصول و اساسات کار معلوم کرنے چاہئیں، جن کے بعد ہم معلوم کر لیں کہ اصحاب اقتصاد کو اور کتنا ہونا چاہیے؟ اور اصحاب سبقت بالخیرات مین کن کن چیزوں کا ہونا ضروری ہے؟ اس کے متعلق کوئی اسلامی و قرآنی روشنی لوگوں کے سامنے نہ تھی۔ محض قیاس ورائے کی ظلمت میں سر گردانی اور حیرانیاں تھیں۔ کسی نے مفاسد نصاب تعلیم کی ایک فرع کو محسوس کیا، کسی نے دوسرے کو، کسی نے تیسری کو پھر صرف اسی فرع کے استغراق میں گم ہو گئے اور اصلاح وتغیر کے لئے اٹھے تو صرف اسی فرع کو بطور اصل

کے کام میں لائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ظلمات بعضہا فوق بعض سے دوچار ہوئے اور چوں کہ اصل مفاسد ہاتھ نہ آئی اس لیے اصل اصلاح کی راہ بھی نہ کھل سکی۔

یہ ساری بحثیں نوٹس میں لکھ چکا ہوں مشرح اور اب چاہتا ہوں کہ صرف مسئلہ تعلیم اسلامیہ کی تاریخ و تنزل و طرق اصلاح و نصاب ہائے تعلیم جماعات مختلفہ پر ایک مستقل کتاب لکھوں۔ شاید آج کل میں شروع کر دی جائے۔ یہ چیز سب سے پہلے لکھنی تھی۔ افسوس کہ اب لکھتا ہوں۔

اسبقیت و اقتصادی:۔ بہ ہر حال میری رائے نظر بر حالاتِ معلومہ یہ ہے کہ آپ کے پیش نظر درجۂ اقتصادی فی العلم ہو، نہ کہ اسبقیت فی العلم۔ آپ متعلمین کاملین پیدا کیجئے، اسی کی ضرورت ہے، نہ کہ معلمین کاملین۔ اس کو دسرے وقتوں کے لئے اٹھا رکھئے۔ معلمین بھی طیار ہوں گے جب متعلمین کاملین بکثرت پیدا ہو جائیں۔ مع ہٰذا آپ کے پیش نظر اسباب و حالات سے پوری طرح واقف نہیں۔ اگر معلمین کاملین کے لیے گنجائش ہو تو مانع ہونے کی کوئی وجہ نہیں، ولکل وجهة هو مو ليها فا ستبقوا الخيرات اور و كلا و عدالله الحسنى کا معاملہ ہے۔ و للناس فيما يعشقون مذہب۔

اصحاب اقتصاد گریجوئیس اور عربی خواں دونوں میں سے باسانی و بہ زمانۂ اقل پیدا کئے جا سکتے ہیں، لیکن دونوں کا نصاب الگ الگ ہوگا، ایک نہیں ہو سکتا۔

ضروری سوالات:۔ آپ یوں کیجئے کہ حسب ذیل سوالات کا پہلے مفصل جواب دیجئے۔ اس کے بعد میں اس بارے میں مفصل لکھوں گا اور مکمل نقشہ ہائے نصاب و مباحث متعلق نظام تعلیم لکھ کر بھیج دوں گا:

۱۔ آپ نے لکھا ہے کہ وظائف دیے جائیں گے۔ اصولاً میں اس کا مخالف

ہوں صرف قیام واکل وشرب کا انتظام ہونا چاہیے۔وظائف لے کر جو پڑھیں گے ان سے کچھ امید نہیں بایں ہمہ اس میں داخل دینا نہیں چاہتا۔آپ بتلایئے کہ سردست کتنے وظائف کا انتظام کریں گے؟

۲۔آپ کا وعدہ عطیہ وظائف کتنے عرصہ تک کے لئے ہوگا؟ دو سال یا تین یا چار؟

۳۔انگریزی خوانوں کے لئے یہ شرط ہوگی کہ گریجویٹ ہوں؟

۴۔عربی خوانوں میں کون اور زیادہ تر کہاں کے تعلیم یافتہ ہوں گے؟ مدارس شمال وغیرہ کے یا اورنٹیل لاہور کے؟

۵۔عربی خوانوں کے لئے انگریزی کا بھی انتظام کرسکیں گے؟

۶۔سرِ دست تعلیم کے لئے زیادہ سے زیادہ کتنے اور کون کون آدمی مہیا ہیں؟ آپ نے چند کا نام لکھا، مگر وہ کافی نہیں، بالتفصیل لکھے اور یہ نہ لکھیے کہ مل جائیں گے۔ابھی کس قدر اور کون موجود ہیں؟

۷۔علم اسرار ومصالح وفقہ شریعت، فقہ جامع، تاریخ اسلام وعلوم ملل والنحل اصول فقہ جامع۔اگر رکھے جائیں تو ان کی تعلیم کے لئے اشخاص ذہن میں ہیں یا نہیں؟

معاملہ مناظرہ:۔۸۔آپ نے غالباً مضامین تعلیم میں مناظرہ کو بھی رکھا ہے۔ یہ مسئلہ بہت تشریح طلب ہے۔یا تو اس سے غفلت تھی یا اب بے اعتدالی کا یہ حال ہے کہ لوگوں نے مناظرہ کو بھی مسلمانوں کے لئے ایک علمی و دینی فتنہ بنا دیا ہے اور سخت جہل و بے اصولی، بے قاعدگی طاری ہے۔مناظرہ سے اگر مقصود جدل ہو تو خود اشد شدید بدعت وضلالت اور منجملہ مہلکات وموبقات کے ہے۔ما ضلَّ قوم بعد ھدی کانوا علیہ

الااولواجد، اورفرمایا،و ما ضربوہ لک الا جدلا بل ھم قوم خصمون، اس سے مقصود محض مسلمانوں کا باہمی جدل وتعمق فی الدین ہی نہیں بلکہ ہر وہ جدل جو دین کے بارے میں ہو۔شاہداس پرقرآن ہے کہ ماضربواہ لک الا جدلا۔ظاہر ہے کہ یہ قوم مسلمان نہ تھی ، مقصود غیرمسلمان ہی ہیں اوراگرمقصودوہ چیز ہے جومنجملہ طرق ثلاثہ دعوت وتبلیغ کے ہےاورجس کی نسبت فرمایا۔بالحکمۃ والموعظہ الحسنۃو جادلہم بالتی ھی احسن، یعنی جدل احسن،توبلاشبہ یہ نہ صرف مستحسن بلکہ منجملہ مامورات ومطلوبات کے ہےاورقرآن ناطق ہے کہ ہمیشہ تین گروہ انسانوں کے مبلغین وداعیان ہدایت کوملیں گے۔ایک گروہ کے لئے حکمت کا طریق اختیارکرنا چاہئے،ایک کے لئے مواعظ حسنہ کااورایک کے لئے جدا، بطریق احسن کا اور داعی صادق وہ ہے جس کے پاس ہر جماعت کی غذا موجود ہو مخاطبین حکمت کے لئے غذا حکمت، مخاطبین موعظت کے لئے موعظت اور مستحقین جدل کے لیے جدل،لیکن بالتی ھی احسن،اگرحکمت کے مستحقوں کے لئے صرف موعظت پرقناعت کرلی جائے گی یا مستحقین جدل کوحکمت وموعظت کی غذادی جائے گی تو یاتو ہضم نہ ہوگی یانقصان پہنچائے گی اورمع ھذاداعی کو ہادی ہونا چاہیئے نہ کہ مناظرومخاصم اور نمونہ اس کا حجہ ابراہیمی اورمکالمہ خلیل ومدعی الوہیت سے واضح ۔پس اگرفن مناظرہ سے مقصود یہ ہوتو بلاشبہ یہ ضروری ہے لیکن اول تو قرآن وسنت کی صالح وکامل تعلیم خوداس راہ کوکھول دیتی ہے۔صرف فروعات ومحدثات وقت وزمان کا معاملہ باقی رہ جاتا ہےاوراگراس کوایک مستقل مضمون تعلیم بنانا بھی ہےتواس کا طریقہ دوسرا ہونا چاہیےاور یہ کام جس طریق پرہورہا ہے، میں

اس کو قرآن وسنت کے خلاف سمجھتا ہوں اور اس کا زیادہ حصہ طریق بدعت پر مشتمل پاتا ہوں۔لفظ بدعت وسیع ہے۔مخالفین اسلام سے مناظرہ کرنے میں ہم کو کامیابی نہیں ہو سکتی جب تک اس کے اصول و آداب وطریق و اساسات محض قرآن وسنت سے ماخوذ نہ ہوں مصیبت یہ ہے کہ ہر کام اور ہر وادی میں اصل کار یعنی منہاج نبوۃ سے بعد ہو گیا ہے۔بہر حال اس بارے میں اپنا مطمح نظر صاف صاف لکھیے۔

۹۔سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ علوم کی تعلیم کے لیے اصلی اور صحیح طریقہ املا کا تھا اور اب سارا دارومدار کتب پر ہے اس کے لیے کچھ لوگ پیش نظر ہیں ؟اگر ہیں تو کون؟۔''

☆☆☆

27 دسمبر 1919ء کو حکومت ہند نے صوبائی حکومت کو ایک تار کے ذریعہ ہدایت دی کہ مولانا آزاد کو نظر بندی سے رہا کر دیا جائے 31 دسمبر 1919ء حکومت بہار نے مولانا آزاد کی نظر بندی سے رہائی کا حکم جاری کیا مولانا آزاد 27 دسمبر 1919ء تک پونے چار سال بعد رانچی میں نظر بندر ہے اور رہائی کے بعد سیدھا کلکتہ کا قصد کیا اور رانچی سے کلکتہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

مولانا آزاد نے رانچی میں اپنے قیام کے دوران جو علمی، ادبی، دینی، قومی وملی خدمات انجام دیے ہیں اظہر من الشمس ہے انہوں نے بیسویں صدی کے اوائل میں یہاں کے لوگوں کے درمیان اصلاح و بیداری، تعلیم وتبلیغ ،اتحاد واتفاق ،قومی یکجہتی کا جو صور پھونکا تھا اسی کا ثمرہ ہے کہ انجمن اسلامیہ مختلف نشیب وفراز گزرتا ہوا ترقی کی منزلیں طئے کر رہی ہے۔میں اپنی باتوں کا اختتام مولانا سید سلیمان ندوی کی ایک تحریر سے کرتا ہوں جس میں مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا آزاد کے جذبۂ ایثار، ملت کے تئیں ان کی دردمندی، تعلیم کے فروغ کے لیے

ان کے ذریعہ کی جانے والی کاوشوں اور ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی کے لیے ان کے ذریعہ اپنائی جانے والی حکمت عملی اور اس سے حاصل ہونے والے ثمرات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

''رانچی ایک ایسا مقام تھا جہاں مسلمان نہایت ذلت و نکبت کی حالت میں تھے۔ جہالت اور باہمی خانہ جنگی نے ان کو گردو پیش کے حالات سے ناواقف رکھا تھا۔ عیسائی مشنریوں کا جال تار کی طرح پھیلا تھا۔ عالم دین کا اس خطہ میں وجود نہ تھا۔ مذہبی احساسات کی روح ان میں مردہ تھی، لیکن مولانا کی پرتوِ صحبت نے چند ہی سال بعد وہاں کی زمین و آسمان کو بدل دیا۔ اب ہم یہاں اسلامی انجمن کا نام سنتے ہیں۔ ایک مدرسہ اسلامیہ کی بنیاد و تعمیر دیکھتے ہیں۔ علمائے مشاہیر کے مواعظ کا جلوہ وہاں نظر آتا ہے۔ مذہب اور ملت کی روح کو ان کے جسم و تن میں جنبش کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ وہاں کے فقرا اور خاک نشینوں میں اب یہ حوصلہ دیکھتے ہیں کہ علم کا پہلا کعبہ اس دیار میں وہ خود اپنے زور بازو سے قائم کر کے رہیں گے جہاں ایک عالم دین اکا وجود ہ تھا وہاں اب کوشش ہو رہی ہے کہ سینکڑوں علمائے دین اس کی خاک سے پیدا ہو کر اس سرزمین کو منور کریں، جہاں مسجدیں بے چراغ تھیں وہان ایک خورشید سے دیر و حرم سب میں اجالا ہو گیا۔ جمعہ اور عیدین کے مجامع اس سرزمین میں جہاں اسلام کی کوئی صحبت بہم نہ تھی وہاں موکب شاہی کا دھوکہ دیتے ہیں۔[5]

حواشی

1. مولانا آزاد رانچی میں ۔از ابوالحسام نعمانی۔ ہفتہ وار الکلام (پٹنہ) ص۔14-11 مارچ 1959ء

2۔ایضاً

3۔محمد اسمٰعیل صاحب محمدی، بہ موقع اجلاس سالانہ، انجمن اسلامیہ، رانچی، بتاریخ ۳،۴،۵ نومبر 1918 مطبوعہ، البلاغ پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ ہاؤس، ۴۵ رپن لین، کلکتہ۔

4۔مکتوبات سلیمان ندوی جلد اول، مرتب عبدالماجد دریابادی، ص115

5۔برصغیر پاک و ہند کے علمی، ادبی و تعلیمی ادارے) علم و آگہی کراچی) جلد دوم ص 120، مشمولہ حیات ابوالکلام آزاد از عبدالقوی دسنوی ص505-505

☆☆☆

MAULANA ABUL KALAM AZAD KI ILMI,ADBI,QAUMI-O-MILLI KHIDMAAT

(QEYAM-E-RANCHI KE HAWALEY SE)

(April 1916 To December 1919)

By

DR. MANZAR HUSSAIN

''رانچی میں حضرت مولانا آزاد کی زندگی کیا تھی، صبح وشام کے معمولات کیا تھے، شب وروز کن مشاغل میں بسر ہوتے تھے۔ قید ونظر بندی کی زندگی میں حضرت مولانا کے کس کیریکٹر کا اظہار ہوا، ان کے فکر وعمل نے کیا نتائج پیدا کئے۔ ان کے پرتو صحبت سے وہاں کے زمین وآسمان میں کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں، علمی وتعلیمی زندگی میں کیا انقلاب آیا اور مسلمانوں کی زندگی میں کیا تغیر رونما ہوا، ان تمام سوالات کے جوابات حضرت مولانا کی تحریروں سے تو نہیں ملتے نہ ایسی کوئی روایت موجود ہے کہ مولانا آزاد نے اپنی خدمات کے بارے میں کسی سے کچھ کہا ہو لیکن چند ایسی شہادتیں موجود ہیں، جن سے رانچی کے انقلاب حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ رانچی میں حضرت مولانا آزاد کی چار سالہ نظر بندی اور اس کے ثمرات ونتائج تاریخِ انقلابِ ملت اسلامیہ کا اتنا اہم موضوع اور حضرت آزاد کی زندگی کا ایسا عظیم الشان واقعہ ہے کہ اسے تاریخ کی روشنی میں لانا نہایت ضروری ہے۔

______ مولانا امداد صابری

فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ
FARID BOOK DEPOT(Pvt.)Ltd.
Corp. Off.: 2158, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj, N. Delhi 2
Phones : 011-23289786, 011-23289159 Fax : 011-23279998
E-mail : faridexport@gmail.com • Website : faridexport.com

ISBN 817801900-0

Rs. 350/-